ابن الوقت
ڈپٹی نذیر احمد
kitaabghar.blogspot.com

DISCLAIMER

All the books we provide on Kitaabiyat, are the digitalized versions of the Hardcopies we OWN. We **don't** promote piracy. If you like the books then **support their authors** by buying the originals.

Posting of our books in any forum/board/blog/website is STRICTLY PROHIBITED.

Uploading of our books to any other media uploading service / community reading services (i.e SCRIBD), without our permission is prohibited.

The hardwork we do, in presenting the books to you, takes quite lot of effort. With every page Photoshopped, and every line checked for its readability, should be respected

Some people are **stealing** our work, we need your help, if you see our books anywhere other than Kitaabiyat, please let us know. We'll consider it your support for the promotion of **Urdu Literature**.

Support us by keep visiting and also by telling others about Kitaabiyat.

Prof. Akbar

Prof. Muhammad Akbar Qureshi

فصل ۱

ابن الوقت کی تقریب

آج کل[۱] سا زمانہ ہوتا تو کانوں کان کسی کو خبر بھی نہ ہوتی۔ ابن الوقت کی تشہیر کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ اس نے ایسے وقت میں انگریزی وضع اختیار کی جب کہ انگریزی پڑھنا کفر اور انگریزی چیزوں کا استعمال ارتداد سمجھا جاتا تھا۔ یہ تو ہماری آنکھوں دیکھی باتیں ہیں کہ ریل میں بہ ضرورت کوئی بھلا مانس چرٹ پیتا تو جان پہچان والوں سے چراتا چھپاتا۔ ایک دوست کہیں باہر بندوبست میں نوکر تھے اور جانچ پڑتال کے لیے ان کو کھیت کھیت پھرنا پڑتا تھا۔ ہندوستانی جوتی اس رگڑ میں کیا ٹھہرتی ناچار انگریزی بوٹ پہننے لگے تھے۔ اگر دو چار دن کے لیے دہلی آتے تو گھر میں سے کبھی کے پڑے ہوئے پھٹے پرانے لتڑے ڈھونڈ کر لگا لیتے۔ تب کہیں گھر سے باہر نکلتے۔ دہلی کالج ان دنوں بڑے زوروں پر تھا۔ ملکی لاٹ آئے اور تمام درسگاہوں کو دیکھتے بھالتے پھرے۔ قدردانی ہو تو ایسی ہو کہ جس جماعت میں جاتے مدرس سے ہاتھ ملاتے۔ بڑے مولوی صاحب نے طوہاً" کرہاً" بادل ناخواستہ آدھا مصافحہ کیا تو سہی مگر اس کو عضو نجس کی طرح الگ تھلگ لیے رہے۔ لاٹ صاحب کا منہ موڑنا تھا کہ بہت مبالغے کے ساتھ انگریزی صابون سے نہیں بلکہ مٹی سے رگڑ رگڑ کر اس ہاتھ کو دھو ڈالا۔

ابن الوقت جیسے ملامتی نہیں تو اس کے ہم خیال خال اور بھی چند مسلمان تھے جن کے لڑکے اکا دکا انگریزی پڑھ رہے تھے۔ ان لڑکوں میں سے اگر کوئی عربی فارسی جماعتوں میں آنکلتا اور آنکھ بچا کر پانی پی لیتا تو مولوی لوگ مٹکے تڑوا ڈالتے۔ ہرچند تعصبات لغو کی کوئی حد نہ تھی' بایں ہمہ انگریزی حکومت جیسی ان دنوں مطمئن تھی' آئندہ تابقائے سلطنت انگریزوں کو خواب میں بھی نصیب ہونے والی نہیں۔ لوگوں کو مفید و مضر کے تفرقے' برے بھلے کے امتیاز کا سلیقہ نہ تھا۔ سرکار بہ منزلہ مہربان باپ کے تھی اور بھولی بھالی رعیت بجائے معصوم بچوں کے۔ انگریزی کا پڑھنا ہمارے بھائی بندوں کے ساتھ ایسا ناسزاوار ہوا جیسا آدمؑ اور اس کی نسل کے حق میں گیہوں کا کھا بیٹا۔ گئے تھے نماز معاف کرانے' الٹے روزے اور گلے پڑے۔ انگریزی زبان' انگریزی وضع کا اوڑھنا بچھونا بنایا تھا اس غرض سے کہ انگریزوں کے ساتھ لگاوٹ ہو مگر دیکھتے تو لگاوٹ کے عوض رکاوٹ ہے اور اختلاط کی جگہ نفرت۔ حاکم و محکوم میں کشیدگی ہے کہ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ دریا

---

[۱] ۱۸۸۸ء

میں رہنا اور مگرمچھ سے بیر۔ دیکھیں آخر یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔

ذرا مشکل سے اس بات کا پتا لگے گا کہ کونسی چیز ابن الوقت کو انگریزی وضع کے اختیار کرنے کی محرک ہوئی۔ وہ ایک ایسے خوش حال اور شریف خاندان کا آدمی تھا جس کے لوگ پاس وضع کو شرافت سمجھتے تھے۔ شرف علم ان میں متوارث تھا۔ اس خاندان کے لوگ بعض طبیب تھے' بعض مدرس (سرکاری نہیں) بعض مفتی' بعض حافظ' بعض صاحب سجادہ طریقت الغرض این خانہ تمام آفتاب است۔

لوگ سب نہیں تو اکثر وللا کثر حکم الکل ہر طرح کے ہنروں سے متصف اور ہر طرح کے کمالات سے متجلی تھے۔ شاہی قلعہ ان سب کی معاش کا متکفل تھا۔ انگریزوں کے ساتھ اگر ان لوگوں کو تعلق تھا تو اسی قدر کہ انگریزی عملداری میں رہتے تھے۔ وہ بھی اپنے زعم میں نہیں۔ ابن الوقت کے کالج میں داخل ہونے کا بھی یہ سبب ہوا کہ شہر کے مشاہیر جو عربی فارسی میں مستند تھے' سرکار نے چن چن کر سب کو پابند مدرسہ کر لیا تھا۔ پس ابن الوقت مدرسے میں داخل کیا گیا' نہ اس غرض سے کہ مدرسے کی طالب علمی کو ذریعہ معاش قرار دے بلکہ صرف اس لیے کہ اس کی عربی فارسی ٹکسالی ہو۔ ابن الوقت اپنے وقت کے منتخب نہیں تو بھی اچھے طلبا میں شمار کیا جاتا تھا۔ مناسبت طبیعت کی وجہ سے اس کے بعض ہم جماعت اس سے خاص خاص چیزوں میں اچھے بھی تھے۔ مگر اس کے مجموعی نمبر کبھی کسی سے ہیٹے نہیں رہے۔ وجہ کیا تھی کہ جس قدر وہ ریاضی میں کچا تھا تاریخ' جغرافیہ' سیاست' مدن' اخلاق وغیرہ سے جن کا اس کو شوق تھا۔ اس خامی کی تلافی بخوبی ہوتی رہتی تھی۔ مدرسے کی ساری پڑھائی میں اس کی پسند کی چیز تاریخ تھی۔ کسی ملک اور کسی وقت کی کیوں نہ ہو۔ اس کی طبیعت عام باتوں میں خوب لگی تھی۔ جواب مضمون پر ہر سال ایک نقرئی تمغہ ملا کرتا تھا۔

چھ برس ابن الوقت مدرسے میں رہا۔ کسی برس اس نے وہ تمغہ انگریزی' عربی' فارسی' سنسکرت میں کسی کو لینے ہی نہ دیا۔ جب موقع ملتا ابن الوقت پرانی دلی کے کھنڈروں میں تعطیل کے دنوں کو ضرور صرف کرتا۔ غیر ملک کے لوگ تجارت' سیاحت یا کسی دوسری ضرورت سے شہر میں آنکلتے تو ادبدا کر ان سے ملتا اور ان کے ملک کے حالات و عادات کی تفتیش کرتا۔ اس کا حافظہ معلومات تاریخی کے ذخیرے سے اس قدر معمور تھا کہ معمولی بات چیت میں واقعات زمانہ گزشتہ سے اکثر استشہاد کیا کرتا۔ ایک بار اس نے باتوں ہی باتوں میں سلیٹ پر اپنی یادداشت سے ایشیا کا نقشہ کھینچا اور مشہور شہروں اور پہاڑوں اور دریاؤں کے موقعے اس میں ثبت کیے۔ پھر جو ملا کر دیکھا تو بہ تفاوت یسیر اکثر صحیح۔ وہ دنیا کی قوموں اور ذاتوں اور رسموں کی ٹوہ میں لگا رہتا تھا۔ مذہب کے بارے میں اس کی معلومات کتاب الملل والنحل سے کہیں زیادہ تھی۔ جب کوئی نئی کتاب

جماعت میں شروع ہوتی تو اس کا پہلا سوال یہ ہوتا کہ اس کا مصنف کون تھا؟ کہاں کا رہنے والا تھا؟ کس زمانے میں تھا؟ کس سے اس نے پڑھا؟ اس کے معاصر کون کون تھے؟ اس کے وقائع عمر میں کون کون سی بات قابل یادگار ہے؟ تعزز اور ترفع ابن الوقت کے مزاج میں اس درجے کا تھا کہ لوگ اس کی خود داری کو منجر بہ کبر خیال کرتے۔ دوسرے کا احسان اٹھانے کی اس کو سخت عار تھی۔ یہاں تک کہ استاد کے سوا وہ کسی ہم جماعت سے پوچھنے تک میں مضائقہ کرتا۔ وہ ہمیشہ ایسے مدرس کی جماعت میں رہنا چاہتا تھا جس کی پرنسپل زیادہ عزت کرتا ہو۔ اور اسی سبب سے وہ کئی بار عربی سے فارسی اور فارسی سے عربی میں بدلتا پھرا۔

ابن الوقت اپنی رائے بہ دیر قائم کرتا تھا مگر جب ایک بار قائم کر لیتا اسے بدلنے کی گویا اس کو قسم تھی۔ اس کی یہ رائے کسی سے مخفی نہ تھی کہ کسی قوم میں سلطنت کا ہونا اس بات کی کافی دلیل ہے کہ اس قوم کے مراسم' عادات' خیالات' افعال' اقوال' حرکات' سکنات' یعنی کل حالات "فردا" نہیں تو "مجتمعا" ضرور بہتر ہیں۔ وہ نہایت وثوق کے ساتھ کھلم کھلا کہا کرتا کہ سلطنت ایک ضروری اور لازمی نتیجہ ہے قوم کی برتری کا۔ انگریزی نوکری کی نہ اس کو ضرورت تھی اور نہ طلب۔ پس وہ اپنی اسی رائے کی بنیاد پر بے غرضانہ ہر انگریز کو' اگرچہ گھٹیا' بے حیثیت یوریشین ہی کیوں نہ ہو' بڑی وقعت کی نظر سے دیکھتا۔ اس خیال کے آدمی کو خصوصاً جب کہ وہ کالج میں داخل بھی تھا انگریزی خواں ہونا چاہیے تھا اور اس کے اندر انگریزی پڑھنے کا تقاضا بھی ضرور پیدا ہوتا ہوگا' مگر باپ کے وفات پا جانے سے نواب معشوق محل بیگم کی سرکار کی موروثی مختاری اس کے سر پڑی۔ ہرچند اسکے بڑے بھائی اور بھی تھے اور چاہتے تو مختاری کو وہ سنبھالتے مگر ان کو اپنے اوراد و وظائف سے مطلق فرصت نہ تھی اور وہ آدمی تھے بھی وحشت زدہ سے۔ ناچار ابن الوقت کو اس سرکار کا بڑا بھاری کارخانہ سنبھالنا پڑا۔ چند روز تک ابن الوقت نے یہ بھی کر کے دیکھا کہ خارج از اوقات مدرسہ قلعے کا کام دیکھتا بھالتا۔ بیگم کی طرف سے تو خدانخواستہ کسی طرح کی سختی نہ تھی مگر خود ابن الوقت دیکھتا تھا کہ اس کا وقت دونوں کاموں کے لیے مساعدت نہیں کرتا۔ پس اس نے مجبور ہو کر مدرسے سے اپنا نام کٹوا لیا۔ پھر بھی وہ تاریخ وغیرہ اپنے ڈھب کی کتابوں کے لیے شاہی کتب خانوں اور اخباروں کے واسطے مطبع سلطانی کے بلا ناغہ حاضر باشوں میں تھا۔ تاریخ اور اخبار کی اس کو ایسی دھت تھی کہ وہ کبھی ان چیزوں سے ملول ہوتا ہی نہ تھا۔

ابن الوقت نے مدرسہ چھوڑا تو گو وہ عربی فارسی کا طالب علم تھا تاہم اس کو مشق کے لیے ریاضی کی انگریزی کتابوں سے مدد لینے کی ہمیشہ ضرورت واقع ہوا کرتی تھی۔ ناچار اس کو انگریزی کے حروف پہچاننے پڑے۔ طبیعت تھی اخاذ۔ حرفوں کا پہچاننا تھا کہ چند روز میں انکل سے سوالات کا طریقہ حل سمجھنے لگا اور یوں تو ریاضی کی رو میں اس کی انگریزی کی استعداد ترقی کرتی گئی جب وہ

انگریزی وضع اختیار کر کے اپنے پندار میں پورا صاحب لوگ بن گیا' اس زمانے میں بھی وہ انگریزی سمجھ تو خاصی طرح لیتا تھا مگر زبان انگریزی میں بے تکلف بات چیت کرنے کی اس کو ساری عمر قدرت حاصل نہ ہوئی۔ ہم نے اس کو زمانہ طالب علمی میں یا اس کے بعد "سبقا" "سبقا" انگریزی پڑھتے تو نہیں دیکھا اور اس کی خود داری مدرسے کے بعد اس کو سینگ کٹوا کر بچھڑوں میں کیوں ملنے دینے لگی تھی؟ مگر اتنا بہ تحقیق معلوم ہے کہ وہ اپنی حالت کے مناسب انگریزی جاننے کے لیے بہتیری ہی کوشش کرتا تھا۔ سنے سنائے سے جو اس نے اس قدر ترقی کی' سچ پوچھو تو یہ بھی اسی کا کام تھا۔ ورنہ اپنا تو یہ مقولہ ہے کہ آدمی مادری زبان کے علاوہ دوسری زبان کا زبان دان' جیسا کہ زبان دانی کا حق ہے' ہو ہی نہیں سکتا۔

کیا صاحب قاموس کی حکایت نہیں سنی؟ بھلا خیر اتنا تو سنا ہو گا کہ زبان عربی کی لغت کی بہت سی کتابیں ہیں سب میں زیادہ مبسوط اور مستند قاموس ہے۔ صاحب قاموس ذات کا تھا عجمی۔ اس کو بچپن سے زبان عربی کی تکمیل کا شوق ہوا۔ جہاں تک عجم میں ممکن تھا' سیکھ پڑھ لیا۔ نجد اور تہامہ اور یمن اور شام اور حضارۃ اور بداوہ میں برسوں زبان کے پیچھے خاک چھانتا پھرا۔ آخر ساری عمر کی تفتیش اور تلاش کے بعد قاموس بنائی تو کیسی بنائی کہ ساری دنیا اس کی سند پکڑتی ہے۔ زبان دانی کا پردہ خدا کو فاش کرنا تھا۔ عرب کی ایک بی بی سے نکاح کیا۔ رات کے وقت گھر کی لونڈی سے کہتے تھے کہ چراغ گل کر دے۔ طوطے کی ٹیں ٹیں کہاں جائے۔ اطفائی السراج کی جگہ فارسی کا محاورہ بے ساختہ اقتلی السراج بول اٹھے۔ بی بی تاڑ گئی۔ صبح اٹھ کر دار القضا میں جا نالش کی۔ خدا جانے بی بی رہی یا گئی' مگر میاں کی عزت کی تو خوب کرکری ہوئی۔ انگریزی اخباروں میں' جن کے اڈیٹر انگریز ہیں' بابو دانہ انگریزی کی ہمیشہ خاک اڑائی جاتی ہے۔ اگرچہ نام تو بنگالیوں کا ہوتا ہے' مگر حقیقت میں وہ ملاحی گالیاں سبھی انگریزی دانوں پر پڑتی ہیں۔ بلکہ دوسروں پر بدرجہ اولیٰ' کیونکہ بنگالیوں نے تو یہاں تک انگریزی میں ترقی کی ہے کہ انگریزی ان کی مادری زبان ہوتی جاتی ہے اور بعض بنگالی تو انگریزی میں اس درجے کے گویا فصیح اور بلیغ ہو گزرے ہیں کہ انگریز بھی ان کا لوہا مانتے ہیں۔ مگر ایسی مثالیں شاذ ہیں۔

ایک دوست ناقل تھے کہ ایک بار ان کو ایک انگریز سے ملنے کی ضرورت تھی۔ کوٹھی پر معلوم ہوا کہ یہ وقت ان کے کلب میں رہنے کا ہے۔ ناچار ان کو کلب جانا پڑا۔ چپراسی اطلاع کا موقع دیکھ رہا تھا کہ انھوں نے اپنے کانوں سنا کہ اندر بہت سے انگریز جمع ہیں اور ہندوستانیوں کی انگریزی کی نقلیں کر کے قہقہے لگا رہے ہیں۔ وہ دوست یہ بھی کہنے لگے کہ جس انگریزی کی ہنسی ہو رہی تھی' بے شک وہ ہنسی کے قابل بھی تھی اور اہل زبان کو ہمیشہ دوسرے ملک والوں پر ہنسنے کا حق ہے۔ مگر ہندوستانیوں کی انگریزی اگر ہنسنے کے قابل ہے تو اس کے مقابل میں انگریزوں کی

اردو رونے کے لائق ہے۔ ہندوستانی صرف کتابوں کی مدد سے انگریزی سیکھتے ہیں' برخلاف انگریزوں کے کہ کتاب کے علاوہ ساری ساری عمر ہندوستانی سوسائٹی میں رہتے ہیں اور پھر وہی "ول تم کیا مانگتا؟" یہ مصیبت کس کے آگے روئیں کہ انگریزی عمل داری نے ہماری دولت و ثروت' رسم و رواج' لباس' وضع' طور طریقہ' تجارت' مذہب' علم و ہنر' عزت' شرافت سب چیزوں پر تو پانی پھیرا ہی تھا ایک زبان تھی اب اس کا بھی یہ حال ہے کہ ادھر انگریزوں نے عجز واقفیت کی وجہ سے اکھڑی اکھڑی غلط' نامربوط اردو بولنی شروع کی' ادھر یہ عیب کے ہمارے ہی بھائی بند لگے اس کی تقلید کرنے ایک صاحب کا ذکر ہے کہ اچھی خاصی ریش و بروت آغاز جوانی میں ولایت گئے۔ چار پانچ برس ولایت رہ کر آئے تو ایسی سٹی بھولے کے اردو میں، ضرورت بھی بات کرتے تو رک رک کر اور ٹھہر ٹھہر کر اور آنکھیں میچ میچ کر جیسے کوئی سوچ سوچ کر مغز سے بات اتارتا ہے۔

فصل ۲

ابن الوقت نے ۱۸۵۷ء کے غدر میں مسٹر نوبل ایک انگریز کو پناہ دی اور اس کے ساتھ ارتباط کا ہونا اس امر کی طرف منجر ہوا کہ ابن الوقت نے انگریزی وضع اختیار کر لی

ابن الوقت کے وقائع عمری میں ایک واقعہ ایسا ہے جس کو اس کی تبدیلی وضع میں بہت کچھ دخل ہو سکتا ہے۔ اور وہ ذرا قصہ طلب سی بات ہے۔ بہادر شاہ کے آخری عہد میں منصب ولی عہدی متنازعہ فیہ تھا' مرزا فخر الملک اور مرزا جواں بخت میں۔ مرزا فخر الملک کے اکبر اولاد اور لائق اور روادار ہونے کی وجہ سے ان کے طرف دار تھے حتیٰ کہ انگریز اور اسی گروہ میں نواب معشوق محل بیگم بھی تھیں جو مرزا فخر الملک کی خالہ بھی ہوتی تھیں۔ مرزا جوان بخت اپنی والدہ نواب زینت محل بیگم کے کھونٹے پر کودتے تھے' جن کو بادشاہ کے مزاج میں بڑا درخور تھا۔ بادشاہ کا زور چلتا تو جواں بخت کو اپنے حین حیات میں تخت نشین کر دیتے' مگر انگریزوں کی پچر بڑی زبردست تھی۔ مرزا جواں بخت کے سارے برتاؤ ولی عہدی کے برتے جاتے تھے۔ صرف دو باتوں کی کسر

تھی۔ ایک تو ولی عہد کی تنخواہ خزانہ شاہی کی تحویل میں رہتی تھی، دوسرے انگریزوں نے ولی عہد کا ادب قاعدہ ان کے ساتھ نہیں رکھا۔ اس کشمکش میں طرفداران مرزا فخر الملک کو بڑے بڑے نقصان پہنچے۔ نواب معشوق محل نے جو بادشاہ کی نظر کسی قدر پھری ہوئی دیکھی، قلعے کے باہر شہر میں کشمیری دروازے کے قریب راحت گاہ، جوان کا بڑا محل تھا، درست کرا کے تبدیل آب و ہوا کے حیلے سے شہر میں رہنے لگیں قلعے کی آمدورفت بھی بند نہیں کی۔ مال و متاع اور ساز و سامان سب کچھ راحت گاہ میں اٹھا منگوایا تھا۔

ہرچند دو ایک برس بعد وہ جواں بختی شورش فرو بھی ہو گئی تھی مگر راحت گاہ میں نواب معشوق محل کا کچھ ایسا جی لگ گیا تھا کہ انہوں نے اپنا یہی قاعدہ رکھا۔ صبح کو ناشتا کر کے قلعے میں چلی جاتیں اور عصر کی نماز راحت گاہ میں پڑھتیں، اور یہیں شب کے وقت آرام فرماتیں۔ یہاں تک کہ دہلی کے حصے کی قیامت آئی۔ یعنی ۱۸۵۷ء کا غدر۔ غدر کے بعد سے نواب معشوق محل بیگم صاحب نے قلعے کے باہر پاؤں نہیں رکھا۔ غدر سے کوئی ڈھائی پونے تین مہینے بعد دو چار گھڑی رات گئے پہلا گولا دیوان عام میں گر کر پھٹا، جس کے دھماکے سے سارا قلعہ ہل گیا۔ اس گولے کا پھٹنا تھا کہ نواب معشوق محل بیگم صاحب کے دل میں کچھ ایسا ہول سمایا کہ اختلاج قلب کے صدمے سے تیسرے دن انتقال فرمایا۔ **انا للہ وانا الیہ راجعون** ○ بڑی نیک نیت اور خداپرست اور سیر چشم بی بی تھیں۔ خدا نے ان کو رسوائیوں اور فضیحتوں سے، جو خاندان تیمور کی تقدیر میں لکھی تھیں، بچالیا۔ ہاں تو غدر کے اگلے ہی دن نواب معشوق محل نے ابن الوقت کو حکم دیا کہ راحت گاہ کا تمام اسباب رتی رتی قلعے میں ڈھوا لاؤ اور راحت گاہ کے مکانوں میں قفل ڈال دو۔ اسباب سا اسباب تھا۔ بیس چھکڑے دن میں چار پھیرے کرتے تھے تب وہ الغاروں اسباب مہینے سوا مہینے میں جا کر ٹھکانے لگا۔

غدر کے چوتھے دن کا ذکر ہے کہ ابن الوقت کوئی دو گھڑی دن رہے آخری کھیپ روانہ کرنے کے بعد قلعے کی طرف کو چلا آرہا تھا ایک آپ تھا اور دو نوکر۔ تینوں مسلح۔ اور ان دنوں جب دو آدمی آپس میں مذکور کرتے تھے تو بس غدر کا مذکور ہوتا تھا۔ یہ لوگ بھی اسی طرح کا تذکرہ کرتے چلے جاتے تھے۔ جوں محسن خاں کے کٹڑے سے آگے بڑھ کر اس کھلے میدان میں پہنچے جو میگزین اور کالج کے درمیان واقع تھا، دیکھتے کیا ہیں کہ سڑک کے بائیں طرف انگریزوں کی کچھ لاشیں پڑی ہیں۔ یہ دیکھ کر ابن الوقت کا کلیجا دھک سے ہو گیا۔ اس وقت وہ موقع ایسا خوفناک تھا کہ اکیلا کیسا ہی کوئی سورما کیوں نہ ہوتا، ڈر کے مارے گھگی بندھ جاتی۔ مگر یہ تین آدمی تھے۔ ابن الوقت لاشوں کے مقابل ذرا ٹھٹکا اور نہایت غصے اور افسوس کے ساتھ اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا:

"دیکھو تو، ظالموں نے کیا بے جا حرکت کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شہر پر بڑا سخت عذاب

آنے والا ہے خون ناحق کبھی خالی جاتے نہیں سنا۔ خدا جانے شاہجہان نے کیسی منحوس تاریخ میں اس کم بخت شہر کی بنیاد ڈالی تھی کہ امن کی کوئی پوری صدی اس بستی میں نہ گزری۔ مگر اس بار تو کچھ ایسا سامان نظر آتا ہے کہ لوگ نادر شاہ کے واقعے کو بھی بھول جائیں گے۔"

ابن الوقت کے ساتھی بھی اس کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے۔ ابھی نماز مغرب میں کوئی آدھے گھنٹے کی دیر تھی۔ ادھر آفتاب کا جنازہ کفن خون آلود شفق پہنا کر تیار کر چکے تھے کہ قبر مغرب میں اتاریں، ادھر بے کفن کی لاشیں دیواروں کے سائے کا ماتمی کفن پہن چکی تھیں۔ دہلی جیسا شہر اور شام کا وقت اور روزوں کا دن۔ ایسا موقع اور دن ہوتے تو اس مقام پر کھوے سے کھوا چھلتا ہوتا۔ مگر ابن الوقت چوراہے پر کھڑا ہوا دیکھ رہا تھا کہ جہاں تک نظر کام کرتی ہے آدم زاد کا پتا نہیں۔ شہر کے بدمعاشوں کے ڈر سے لوگ کچھ دن رہے سے کواڑوں میں پتھر اڑا اڑا کر گھروں میں بند ہو بیٹھتے تھے۔ ابن الوقت ہکا بکا سناٹے میں کھڑا تھا کہ ایک ساتھی بولا۔

"حضرت افطار کا وقت قریب ہے اور قلعہ دور۔ جو ہونا تھا سو ہوا، اور جو تقدیر کا لکھا ہے سو ہو کر رہے گا۔ پس معلوم ہوا کہ نابکار تلنگوں کے گیہوں کے ساتھ بہتیروں کا گھن پسنا ہے۔ چلیے تشریف لے چلیے۔"

پن چکیوں سے ذرا ادھر تھے کہ پیچھے سے پیروں کی آہٹ آئی کہ کوئی شخص لپکا ہوا چلا آرہا ہے۔ لاشوں کو دیکھنے سے یہ لوگ کچھ ایسے ہول زدہ ہو گئے تھے کہ آواز کے ساتھ سب کے دل دھڑکنے شروع ہوئے اور بے اختیار لگے پیچھے مڑ کے دیکھنے۔ بارے شکر ہے کہ وہ شخص نہتا تھا وہ جھپٹا ہوا چلا آرہا تھا۔ ان کے قدم جو پڑے ڈھیلے، پن چکیوں سے اترتے اترتے اس نے آ ہی لیا۔ اس شخص نے دور سے ان شخصوں کی بیٹھیں دیکھ کر پہچان لیا تھا کہ ان میں آقا کون ہے۔ برابر آکر اس نے ابن الوقت کو مودب اور باسلیقہ نوکروں کی طرح سلام کیا۔ ابن الوقت نے آنکھ بھر کر دیکھا تو کوئی اٹھائیس تیس برس کا جواں آدمی ہے اور انگریزی خدمت گاروں یا اردلیوں کی سی وضع رکھتا ہے۔ دوپٹا سر سے بندھا ہے اور پٹکا کمر سے۔ گویا نوکری سے چلا آرہا ہے۔ خوف اور رنج و اضطراب ہے کہ چہرے سے ٹپکا پڑ رہا ہے۔ ہونٹوں پر پپڑیاں بندھ گئی ہیں۔ سانس پیٹ میں نہیں سماتا۔ ابن الوقت سے بات کرنا چاہتا ہے مگر بار بار پھر پھر کر لاشوں کی طرف کو تاکتا جاتا ہے۔ ہرچند چھوٹا میگزین بیچ میں حائل ہے مگر پھر بھی جی نہیں مانتا اور بے دیکھے رہا نہیں جاتا۔ وہ ابن الوقت کے پوچھنے کا بھی منتظر نہ رہا اور چھوٹتے ہی بولا۔

"میرا نام جاں نثار ہے اور میں بہادر پور کے پٹھانوں میں سے ہوں۔ چار برس سے رہتک کے جنٹ مجسٹریٹ نوبل صاحب کی اردلی میں ہوں۔ ہمارے صاحب کئی مہینے سے بیمار ہیں۔ رخصت لے کر ولایت جا رہے تھے اور بمبئی تک مجھے ساتھ لیے جاتے تھے۔ آج چوتھا دن ہے۔

ہم لوگ ڈاک بنگلے میں آکر ٹھہرے۔ دوپہر کو غدر ہو گیا۔ صاحب کا مزاج نادرست تھا۔ بھاگ کر کہیں جا نہ سکے۔ تلنگوں نے ان کو لے جا کر کشمیری دروازے کے گارڈ میں قید کیا۔ وہاں اور بھی چند انگریز پکڑے ہوئے تھے۔ آج سب قیدیوں کو کھڑا کر کے ناحق ناروا باڑ مار دی۔ ہمارے صاحب بھی زخمی ہو کر گرے مگر اس وقت تک ان میں جان ہے۔ ڈر کے مارے ان کو اچھی طرح دیکھ تو نہ سکا مگر آنکھ بچا کر مسجد سے پانی کی بدھنی لے کر ان کے پاس رکھ آیا ہوں۔ یہ خدا واسطے کا کام ہے۔ اگر آپ سے ہو سکے تو ہمارے صاحب کی جان بچائیے۔ آپ کو بڑا درجہ ملے گا۔ صاحب ہیں تو انگریز مگر شریف اور شریف پرور۔ نیک مزاج اور پرلے درجے کے رحمدل رہتک والوں سے آپ پوچھیے۔ بیسیوں یتیموں اور بیواؤں کی تنخواہیں مقرر کر رکھی ہیں۔ فوجداری کے مقدموں میں مجبور ہو کر جرمانے کرتے ہیں تو اپنے پاس سے سرکار میں بھر دیتے ہیں۔"

یہ کہہ کر جاں نثار ابن الوقت کے پیروں پر گر پڑا اور کہنے "آپ لاشوں کے پاس کھڑے ہوئے جو باتیں کر رہے تھے' میں دروازے کی آڑ میں چھپا ہوا سن رہا تھا۔ اس سے مجھ کو آپ سے کہنے کی ہمت بھی پڑی اور میرا دل اندر سے گواہی دیتا ہے کہ خدا نے آپ کو ایسے وقت صرف ہمارے صاحب کی جان بچانے کو بھیجا ہے۔"

ابن الوقت نے جاں نثار کو زمین پر سے اٹھایا اور کہا "جو کچھ یہ بد ذات' پاجی' نمک حرام باغی تلنگے کر رہے ہیں' کچھ شک نہیں کہ صریح ظلم ہے اور کسی مذہب و ملت میں روا نہیں۔ اور اگر میں تمہارے صاحب کی حفاظت کر سکوں تو میں اس کو فرض انسانیت سمجھتا ہوں مگر ان لوگوں کو کس وقت باڑ ماری؟"

جاں نثار : دو بجے۔

ابن الوقت : اوہو! دو بجے۔ (ایک نوکر کی طرف مخاطب ہو کر) وہ جو اس وقت فیر کی آواز آئی تھی' وہ یہی باڑ ہو گی۔ (جاں نثار سے) اچھا پھر تم نے کیونکر جانا کہ تمہارے صاحب ہنوز زندہ ہیں؟

جاں نثار : حضور کے تشریف لانے سے تھوڑی دیر پہلے تک لاشوں پر دھوپ تھی اور لاشیں بالکل سفید پڑ گئی تھیں۔ مگر ہمارے صاحب کے چہرے پر سرخی جھلکتی تھی اور میں نے اپنی آنکھ سے صاحب کے جسم میں حرکت بھی دیکھی ہے۔ پانی رکھنے گیا تو سانس چلتا ہوا سا دکھائی دیا۔ خدا جانے کہاں چوٹ لگی ہے کہ بے ہوش ہیں۔ جس وقت سے صاحب ڈاک بنگلے میں پکڑے گئے' اس وقت سے میں دائیں بائیں برابر صاحب کے پاس لگا رہا ہوں۔ ایک دم کو جدا نہیں ہوا۔ زخموں کی نسبت تو میں عرض نہیں کر سکتا' مگر اس وقت تک ان میں جان ضرور ہے۔ آپ للہ ذرا چل کر دیکھ لیجیئے۔ اگر کچھ جان باقی ہے تو ان کو اپنی

حفاظت میں لیجیئے۔ شاید خدا کرے بچ جائیں اور اگر ختم ہو چکے ہیں تو وہ کیا مرے' ہم جیسے پچاسوں غریب ان کے ساتھ مر گئے۔ ہوں تو چار کوڑی کا پیادہ اور آپ کے روبرو عرض کرنا بھی گستاخی ہے' مگر جناب یہ عمل داری تو اٹھنے والی نہیں۔ یہ بھی کوئی دن کا غل غپاڑا ہے۔ اگر صاحب آپ کے طفیل سے بچ گئے تو پھر دیکھیئے گا کیسے کیسے سلوک آپ کے ساتھ کرتے ہیں"۔

ابن الوقت نے جس وقت سے سنا تھا کہ صاحب مجروح ہوئے پڑے ہیں اور زندہ ہیں' اسی وقت سے وہ اپنے ذہن میں صاحب کی حفاظت کی تدبیریں سوچنے لگا تھا۔ جاں نثار کی طرف ظاہر میں متوجہ رہا مگر اس کی بہت سی باتیں اس نے مطلق دھیان سے نہیں سنیں۔ آخر ابن الوقت نے اپنے دونوں نوکروں سے کہا "کیوں بھئی' تمہاری کیا صلاح ہے؟" ایک نے کہا "ہم خانہ زاد جان و مال سے حاضر ہیں۔ جیسا حکم ہو' تعمیل کریں" ابن الوقت نے کہا "بس تم سے اتنی مدد درکار ہے کہ اول تو ہم سب روزے سے ہیں' رازداری کا حلف کریں۔ دوسرے صاحب اگر زندہ ہوں تو جس طرح بن پڑے' اٹھا کر گھر تک لے چلیں۔"

ابن الوقت کے دونوں نوکروں نے قبلے کی طرف ہاتھ اٹھا کر قسم کھائی اور چاروں شخص لوٹ کر پھر لاشوں کے پاس گئے۔ جاں نثار نے سب کو نوبل صاحب کے سرے لے جا کر کھڑا کر دیا۔ جھٹ پٹا ہو چلا تھا۔ جاں نثار نے ہاتھ لگا کر دیکھا تو بدن گرم تھا۔ خون میں لتھڑے ہونے کی وجہ سے اس وقت معلوم نہ ہو سکا کہ کہاں کہاں زخم لگے ہیں اور کس قسم کے ہیں۔ ہرچند کوئی آدمی کہیں چلتا پھرتا دکھائی نہیں دیتا تھا' مگر خوف کے مارے ذرا کہیں پتا کھڑکتا تو یہ لوگ سہم جاتے بارے جاں نثار نے ابن الوقت اور اس کے نوکروں کی مدد سے صاحب کو چڈھی چڑھایا۔ صاحب اس قدر بے ہوش تھے کہ ان کا سنبھالنا دشوار تھا۔ سارے راستے میں ابن الوقت اور اس کے نوکر سہارا لگائے آئے۔ ان لوگوں کو اس سے بڑی تسلی اور تقویت تھی کہ جدھر نظر اٹھا کر دیکھتے تھے کسی طرف کوئی آتا جاتا دکھائی نہیں دیتا تھا۔

ابن الوقت مجروح کو اٹھوا لے کو اٹھوا لایا مگر اس وقت تک اس نے ذرا بھی نہیں سوچا تھا کہ گھر پہنچ کر کیا کرنا ہو گا۔ حقیقت میں اس کو اس بات کے سوچنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ جاں نثار کی دردناک حکایت سنتے ہی وہ مجروح کو اٹھانے دوڑا گیا اور مجروح کے پیچھے سارے راستے اس کی روک تھام میں لگا رہا۔ گھر کے نکڑ پر پہنچ گیا تھا کہ اس کو تنبہ ہوا کہ میں نے یہ کیا کیا اور اس کی پناہ کی کیا صورت ہو گی؟ ابن الوقت کی بیوہ پھوپھی بیوگی سے بال بچوں سمیت اسی کے گھر میں رہتی تھیں اور شوہر ترکے کی وجہ سے ان کو بڑی مقدرت تھی۔ اب ان کے بچے سیانے ہوئے تو انہوں نے اپنا مکان علیحدہ بنوانا چاہا۔ پدری ترکے سے ان کو ابن الوقت کے مکان کے پہلو میں

زمین ملی تھی اور وہ زمین مدتوں سے یوں ہی پڑی تھی۔ اب کوئی چار مہینے سے پچھلے موسم کے آتے ہی اس میں مدد لگی تو اس وقت تک مکان ہر طرح سے بن کر تیار ہو چکا تھا۔ صرف استرکاری باقی تھی کہ غدر ہوا۔ مدد بند کر دی گئی۔ سامان تعمیر کی حفاظت کے لیے اور اس غرض سے بھی کہ مکان میں رات کو چراغ جلنا ضرور ہے' ابن الوقت کے ان ہی دونوں نوکروں میں سے جو نوبل صاحب کو اٹھا لائے تھے' باری باری سے ایک شخص رات کو آپڑتا۔ ابن الوقت نے نوبل صاحب کو اسی خالی مکان میں اتروایا اور اپنے آدمیوں میں سے جس کی باری مکان میں سونے کی تھی' جاں نثار کے ساتھ متعین کر دیا کہ اندر سے کواڑ بند رکھو اور میرے آنے تک صاحب کے زخموں کی شست و شو کرو' مگر خبردار جو کسی نے آہٹ پائی۔

ابن الوقت نے گھبراہٹ اور جلدی میں اتنا خیال البتہ کر لیا تھا کہ باغیوں اور شہر کے بدمعاشوں نے اس قدر سر اٹھا رکھا ہے کہ ناحق انگریزوں کے لگاؤ کا جھوٹا الزام رکھ کر لوگوں کی جان اور آبرو کے خواہاں ہیں۔ بے کسی زبردست کے آسرے کے اتنی بڑی جوکھم کا اپنے سر لینا ٹھیک نہیں۔ کل کلاں کو دیوار ہم گوش دارد۔ خدا بری گھڑی نہ لائے۔ بات کھل پڑی تو میں اکیلا چنا بھاڑ کا کیا کروں گا۔ پاس تھی شاہ حقانی صاحب کی خانقاہ۔ اور ایک اعتبار سے سے سارا شہر ان کا معتقد تھا۔ ہزارہا **ولایتیوں** کو اس خانقاہ سے بیعت تھی اور چالیس پچاس بلکہ بعض اوقات سو سو ولایتی فیضان تلقین حاصل کرنے کے لیے خانقاہ میں ٹھہرے رہتے تھے۔ ابن الوقت کے ذہن میں یہ بات آئی کہ شاہ حقانی صاحب اس ارادے میں میرے سر پر ہاتھ رکھیں تو بس پھر کسی طرح کا خدشہ نہیں۔ ابن الوقت کو اس بات کا بھی پورا بھروسا تھا کہ اگر شاہ صاحب راضی نہ ہوئے تاہم ان کی شان اس سے ارفع ہے کہ کسی پر اس راز کو ظاہر کریں۔ پس ابن الوقت نے مکان کے اندر پاؤں بھی نہ رکھا اور سیدھا خانقاہ کو ہو لیا۔ وہاں پہنچ کر کیا دیکھتا ہے کہ ساری خانقاہ میں کھچا کھچ آدمی بھرے پڑے ہیں۔ تل دھرنے کی جگہ نہیں۔ معلوم ہوا کہ سرغنہ باغیان علمائے خانقاہ سے جہاد کے فتوے پر مہر کرانے لایا ہے۔ ظہر کے وقت سے حجت ہو رہی ہے۔ شاہ حقانی صاحب ہیں کہ کسی طرح نہیں مانتے اور انگریزوں سے لڑنے کو غدر **فساد فی الارض** کہے چلے جاتے ہیں اس وقت ایسے ہجوم میں صاحب تک پہنچنا اور تخلیہ کرانا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ ناچار ابن الوقت کسی قدر نا امید ہو کر لوٹا مگر دل علمائے خانقاہ کے فتوے کی تقویت کرتا تھا اور اس خیال سے خوش تھا کہ ایک سرغنہ نہیں' اگر ساری دنیا ایک طرف تو خانقاہ والے مذہبی معاملے میں ڈرنے یا دھمکی میں آنے والے نہیں۔ اور باغی خانقاہ والوں کا کر بھی کیا سکتے ہیں۔ اگر خانقاہ میں سے کسی کا بال بھی بیکا ہوا تو کشتوں کے پشتے لگ جائیں گے۔ بارے ابن الوقت پھر گھر کو لوٹ آیا۔ جونہی گھر کے دروازے میں قدم رکھا تھا کہ جاں نثار نے یہ خوش خبری سنائی کہ دھونے صاف کرنے سے

معلوم ہوا کہ کہیں کاری زخم نہیں لگا اور صاحب نے آنکھ کھولی ہے۔ مگر ضعف کے سبب بول نہیں سکتے۔

مرہم پٹی تو کیا ہو سکتی تھی' خدا کی قدرت' صرف ٹھنڈا پانی ٹپکانے سے سوا ڈیڑھ مہینے میں سب زخم بھر آئے اور باوجودیکہ صبح شام کی مشی بند ہو گئی تھی اور گو ابن الوقت جاں نثار کی مدد سے ہر طرح کا اہتمام کرتا تھا مگر غذا میں بہت بڑا فرق واقع ہو گیا تھا۔ بایں ہمہ صاحب کا اصل مرض بھی' جس کے علاج کے لیے ولایت جانے والے تھے قدرے قلیل ہی باقی رہ گیا تھا۔ ان کو غالباً کثرت کتاب و بینی کی وجہ سے ہلکا ہلکا درد سر ہر وقت رہتا تھا۔ اب کتاب بینی ہوئی یک قلم موقوف' اور دماغ کو زحمت مطالعہ سے ملی راحت اور آسودگی ایک دوا تو یہ تھی کہ طبیعت ہوئی دوسری طرف مشغول وہ درد سر بھی تھوڑی دیر کے لیے ہوتا تھا اور صاحب خود اس کو اختلاف غذا کی طرف منسوب کرتے تھے۔

تین مہینے نو دن نوبل صاحب ابن الوقت کے گھر رہے۔ اس عرصے میں دونوں میں اس درجے کا ارتباط بڑھا کہ آج تک کسی ہندوستانی کو کسی انگریز کے ساتھ اتفاق نہیں ہوا۔ ابن الوقت نامجانست اور صاحب کی علوِ منزلت کے خیال سے ابتدا" کسی قدر رکا رہا' مگر صاحب کی کتاب اور اخبار اور کچہری اور ہوا خوری اور ملاقات سب کچھ جا کر ایک ابن الوقت کی صحبت رہ گئی تھی۔ وہ کسی طرح ایک لمحے کو ابن الوقت کا اپنے پاس سے ہٹنا پسند نہیں کرتے تھے۔ پس نوبل صاحب اور ابن الوقت دونوں کا سلسلہ سلسلہ ناتناہی تھا۔ دونوں کے کبھی آدھی آدھی رات باتوں میں گزر جاتی اور ایک بھی اٹھنے کا نام نہ لیتا۔ مگر ان کی گفتگو غالباً تین طرح کی ہوتی تھی۔ اکثر تو غدر کا تذکرہ کہ واقعات ہر روزہ سے جہاں تک کہ ابن الوقت کو قلعے کے ذریعے سے دریافت ہوتے تھے' شروع ہو کر آخر کو امور عامہ میں بات جا پڑتی۔ مثلاً یہ کہ غدر ہوا تو کیوں ہوا؟ کہاں تک اس آفت کے پھیلنے کا احتمال ہے؟ آیا یہ موقع ایسا ہے کہ ہندوستان کی مختلف قومیں ہندو' مسلمان' سکھ' مرہٹے' بنگالی' مدراسی' راجپوت' جاٹ' گوجر اس میں مل کر کوشش کریں گے؟ ہندوستان کے باشندوں میں قوت کس درجے کی ہے؟ رجواڑوں میں کس کس کے بگڑنے کا خوف ہے؟ شاہ وظیفہ خوار دہلی کی لوگوں کی نظر میں کیا وقعت ہے؟ سرحدی قومیں جیسے گورکھے اور افغانستان کے لوگ شریک بغاوت ہوں گے یا نہیں؟ کوئی ہم عصر سلطنت ایسی بھی ہے جو ایسے وقت میں سلطنت ہندوستان کی طمع کرے؟ یہ غدر فوج کی شورش فوری ہے یا اس کہ ہنڈیا مدت سے پک رہی تھی اور رعایا بھی فوج کی شریک حال ہے؟ حکومت انگریزی سے لوگ رضامند ہیں یا ناراض؟ اور ناراض ہیں تو کیوں؟ کہاں تک مذہبی خیال غدر کا محرک ہوا؟ مسلمانوں کے معتقدات میں یہ غدر داخل جہاد ہے یا نہیں؟

اس طرح بات میں سے بات نکلتی چلی آتی تھی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ نوبل صاحب ابن الوقت سے ہندوستانیوں کے رسم و رواج اور طرز تمدن اور معاشرت کے حالات دریافت کرتے اور ابن الوقت ہندی کی چندی کر کے ان کو بتاتا اور سمجھاتا رہا۔ ابن الوقت کو تو ہمیشہ کی عادت تھی کہ غیر ممالک کے حالات کو ہر ایک سے کرید کرید اور کھود کھود کر پوچھا کرتا تھا۔ نوبل صاحب سے اس نے خوب ہی دل کھول کر' جو جو جی میں آیا پوچھا اور نوبل صاحب نے بھی' جہاں تک زبان نے یاری دی بھلی یا بری کوئی بات اپنے وطن اور اپنی قوم کی اٹھا نہ رکھی۔ ابن الوقت نے نوبل صاحب کی ہم نشینی میں انگریزوں کے تفصیلی حالات سے اس قدر واقفیت حاصل کی کہ بس آنکھوں سے دیکھنے کی کسر رہ گئی تھی۔ ہم ایسا سمجھتے ہیں کہ ابن الوقت کو انگریزوں کے ساتھ ایک طرح کی عقیدت تو پہلے سے تھی ہی' تین سوا تین مہینے نوبل صاحب کے ساتھ رہ کر اس کے خیالات اور بھی راسخ ہو گئے۔ اور عجب نہیں کہ اسی اثناء میں اس نے تبدیل وضع کا ارادہ کیا ہو۔

ہم کو نوبل صاحب یا ابن الوقت کے حالات غدر لکھنے منظور نہیں۔ تسلسل سخن کے لیے اتنا لکھنا ضروری ہے کہ نوبل صاحب کو جس وقت سے ابن الوقت کے گھر ہوش آیا' آخر تک انہوں نے اپنی ذاتی تکلیف کی کبھی شکایت کی ہی نہیں۔ ہاں' یہ ان کا تکیہ کلام تھا کہ افسوس میں ایسی حالت میں ہوں کہ کسی طرح اپنی قوم کی مدد اور اپنے ملک کی خدمت نہیں کر سکتا۔ وہ کاہل اور بے کار زندگی سے مرنے کو بہ مدارج بہتر سمجھتے تھے' اور خبروں کو نہ ملنے سے ان کا وقت سخت پریشانی میں گزرتا تھا۔ جتنی دیر ابن الوقت ان کے پس رہتا' باتیں کرتے رہتے ورنہ دالان میں ٹہلتے رہتے۔ ابھی ان کے زخم اچھی طرح بھرے بھی نہ تھے کہ انہوں نے ابن الوقت سے تقاضا شروع کیا کہ کسی ڈھب سے مجھے انگریزی کیمپ میں پہنچاؤ۔ ابن الوقت ان کے بے موقع اور بے جا اصرار سے دل میں سخت آزردہ ہوتا۔ مگر جانتا تھا کہ اہل الغرض مجنون۔ باہر چلتے پھرتے ہوتے تو دیکھتے کہ چاروں طرف کیسی آگ لگی ہوئی ہے۔ ہمارے ملک کی عورتوں کی طرح گھر کی چاردیواری میں مقید ہیں۔ دنیا و مافیہا کی خاک خبر نہیں۔ شاید دل میں خیال کرتے ہیں کہ عمداً" پہلو تہی کرتا ہوں۔ زخموں کے اچھے ہوتے ہی نوبل صاحب اس قدر دل برداشتہ ہوئے کہ کئی بار بگڑ بگڑ کر ابن الوقت کو دھمکایا کہ اگر مجھ کو روکو گے تو میں نکل بھاگوں گا۔ ابن الوقت ان کی ایسی باتیں سن کر ہنستا اور کبھی جھنجھلاتا کہ ایسی ہی جان دو بھر ہے اور اگر خودکشی کرنی ہے تو مجھ ہی کو ثواب عزا حاصل کرنے کی اجازت دیجیے۔

فصل ۳

ابھی غدر فو نہیں ہوا تھا کہ نوبل صاحب انگریزی کیمپ میں جا داخل ہوئے

ہر چند ابن الوقت بات کسی نہ کسی تدبیر سے ہنسی میں اڑا دیا کرتا تھا مگر دل میں یہ بھی سوچتا تھا کہ ایسا نہ ہو گھٹ گھٹ کر بیمار پڑ جائیں تو وہی مثل ہو کہ کھلائے پلائے کا نام نہیں' رلائے کا الٹا الزام۔ آخر یہ صلاح ٹھہری کہ نوبل صاحب حاکم انگریزی فوج کو چٹھی لکھیں اور جاں نثار اس کو چھپا کر گوڑگانوہ' رہتک' کرنال' تین ضلعوں کے دیہاتوں میں چکر کاٹتا ہوا کسی جگہ پنجاب کے راستے میں جا ملے' اور وہاں سے انگریزی کیمپ میں داخل ہو۔ جاں نثار نے اس کا بیڑا اٹھایا اور چٹھی لے کر روانہ ہوا۔ اس کا پیٹھ پھیرنا تھا کہ یہاں نوبل صاحب اور ابن الوقت لگے اس کی واپسی کا حساب کرنے۔ ہر چند دونوں چپے چپے زمین کے جغرافیے سے آگاہ تھے مگر باوجودیکہ کئی دن تک ردوکد ہوتی رہی' جاں نثار کی واپسی کی تاریخ پر متفق نہ ہو سکے۔ وجہ یہ تھی کہ جاں نثار کی آمد و شد میں جن اتفاقات کے پیش آنے کا احتمال تھا اگرچہ کوئی شخص حتیٰ کہ جاں نثار بھی ان کو نہیں جان سکتا تھا' مگر ابن الوقت پھر بھی ان کا کسی قدر ناقص' ناتمام' ادھورا اندازہ کرتا تھا۔ اور نوبل صاحب چونکہ خود مستعجل تھے' کسی احتمال مخالفت کو اپنے ذہن میں آنے ہی نہیں دیتے تھے۔ تاہم انہوں نے آپ ہی اپنے نزدیک یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ جاں نثار کو آج سے پندرھویں دن ضرور ضرور واپس آنا چاہیے۔

ہر چند نوبل صاحب بڑے ہی مستقل مزاج آدمی تھی' مگر سچ کہتے ہیں الانتظار اشد من الموت جاں نثار کی واپسی کے انتظار میں تو ان سے ضبط نہ ہو سکا۔ جاں نثار کو گئے ہوئے ایک ہی ہفتہ گزرا تھا کہ انہوں نے بار بار مڑ کر دروازے کی طرف دیکھنا شروع کیا اور دسویں دن سے تو یہ حال ہوا کہ سارے سارے دن دروازے میں کھڑے رہنے لگے۔ ہر چند ابن الوقت گھسیٹ گھسیٹ کر اندر لے جاتا تھا مگر قابو ملا اور دروازے میں۔ جب پندرہ دن بھی گزر گئے اور جاں نثار کا کہیں پتا نہیں چلا تو نوبل صاحب کی اس دن کی یاس دیکھ کر ابن الوقت بھی بدحواس ہو گیا۔ زخمی ہونے کی حالت میں پھر بھی ان کے چہرے پر ایک طرح کی رونق تھی یا دفعۃً" ان کی حالت اس قدر جلد جلد متغیر ہونے لگی کہ جاں نثار کے سامنے سے آدھے بھی نہیں رہے تھے۔ بھوک بالکل بند ہو گئی۔ نیند ایسی اچاٹ ہوئی کہ آدھی رات کروٹیں بدل بدل کر صبح کر دیتے

تھے۔ آخر جاں نثار کی روانگی کے انتیسویں دن ابن الوقت نے کہا کہ جاں نثار کو جو اس قدر دیر لگی، آپ اس کی نسبت کیا خیال کرتے ہیں؟

نوبل صاحب : کیا بتاؤں۔ جاں نثار کی وفاداری پر شبہ کرنے کی میں کوئی وجہ نہیں پاتا۔ اس نے اس مصیبت میں جس قدر میری رفاقت کی، آپ کو معلوم ہے۔ شاید ایسا ہو کہ وہ لوگ جواب کے عوض میرے نکال لے جانے کی فکر میں ہوں اور جاں نثار کو میری نشاندہی کے لیے ٹھہرا لیا ہو۔

ابن الوقت : میں آپ کی دل شکنی کے ڈر سے عرض نہیں کر سکتا۔ مگر میرا خیال تو یہ ہے کہ جاں نثار کو ابھی تک انگریزی کیمپ میں جانا بھی نصیب نہ ہوا ہو تو عجب نہیں۔

نوبل صاحب : کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میری چٹھی پکڑی گئی؟ نہیں، نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ جاں نثار نہایت ہوشیار آدمی ہے اور اس نے چٹھی کو ضرور اس طرح چھپایا ہو گا کہ کوئی گمان نہ کر سکے۔ اور خود جاں نثار کی صورت اور وضع ایسی ہے کہ اس پر جاسوسی یا مخبری کا گمان ہو نہیں سکتا۔ نہیں، نہیں مجھ کو پورا پورا اطمینان ہے کہ وہ چٹھی سمیت صحیح سلامت کیمپ میں پہنچا۔

ابن الوقت : آپ کو کچھ مفصلات کی بھی خبر ہے؟ تمام دیہات میں لوٹ کھسوٹ مچی ہوئی ہے۔ راستے بند پڑے ہیں۔ اکے دکے کی مجال نہیں کہ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کا قصد کرے۔ اور ایسی بے تمیزی میں ناحق و ناروا کوئی کسی کو مار ڈالے تو کیا لگتا ہے۔

نوبل صاحب : اگر آپ نے یہ حال مجھ سے کہا ہوتا تو میں ہرگز جاں نثار کے بھیجنے کا ارادہ نہ کرتا۔ افسوس! کہ میں نے اپنے فائدے کے لیے اس کی جان کو خطرے میں ڈالا۔

ابن الوقت : میں نے احتمال عقلی کے طور پر عرض کیا، ورنہ جاں نثار ان گنواروں کے بس میں آنے والی اسامی نہیں۔ اس کی جان تو انشاء اللہ سب طرح خیر ہے۔ ہاں، راستے میں کہیں اٹک گیا ہو تو خبر نہیں۔ مگر خدا نے چاہا تو صبح و شام پہنچنے ہی والا ہے۔

نوبل صاحب : آپ دیر کی وجہ سے ایسا قیاس کرتے ہیں یا.....؟

ابن الوقت : (ہنس کر) ایک کوا چھجے پر بیٹھا ہوا کاؤں کاؤں کر رہا تھا۔ میں نے اپنے ملک کی رسم کے مطابق شگون لیا اور کوے سے کہا کہ جاں نثار آتا ہو تو اڑ جا۔ یہ کہنا تھا کہ کوا اڑ گیا۔

ابن الوقت اور نوبل صاحب یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ باہر کے کواڑوں میں سے کھٹ کھٹانے کی آواز آئی۔ سنتے ہی ابن الوقت بول اٹھا "لیجیے، الحمد للہ! جاں نثار آپہنچا۔" ابن الوقت نے دوڑ کر کواڑ کھولے تو سچ مچ جاں نثار تھا۔ دور سے نوبل صاحب نے پوچھا "کہو خیر ہے؟"

جاں نثار : (قاعدے کے مطابق سلام کر کے) خداوند! حضور کے اقبال سے جواب لایا۔

نوبل صاحب نے ایسی جلدی کی کہ جوتی کے تلے سے چٹھی کا نکالنا دشوار کر دیا۔ بارے خدا خدا کر کے چٹھی نکلی۔ نوبل صاحب بغور اس کو پڑھ رہے تھے اور ان کے منہ کی طرف ابن الوقت کی ٹکٹکی بندھی ہوئی تھی۔ نوبل صاحب کے چہرے سے فکر کے سوائے اور کوئی بات ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ چاہتے تھے کہ چٹھی کو دوبارہ پڑھیں، ابن الوقت نے چٹھی پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا کہ آپ کو ہمارے انتظار کی بھی قدر کرنی ضرور ہے۔ چٹھی کہیں بھاگی نہیں جاتی۔ پہلے آپ خلاصہ فرما دیجیے۔ تب دوبارہ سہ بارہ جب تک چاہے، پڑھا کیجیے گا۔

نوبل صاحب : کوئی خاطر خواہ جواب نہیں آیا۔ لکھتے ہیں کہ ابھی تک ہم لوگ دشمنوں کے حملوں کو ہٹا رہے ہیں۔ قلعہ شکن توپیں منگوائی گئی ہیں۔ وہ پہنچ جائیں تب ہمارے دھاوے شروع ہوں۔ اس وقت تک جہاں ہو، چپ چاپ بیٹھے رہو۔ جس وقت ہماری طرف کے گولے جامع مسجد کے پار جانے لگیں یا قلعے میں گرنے شروع ہوں تو جاننا کہ توپیں پہنچ گئیں اور پھر وہ امید کرتے ہیں کہ باغیوں کے پاؤں جلد اکھڑ جائیں گے اور یہ بھی لکھا ہے کہ تمہارا آدمی سولھویں دن کیمپ میں پہنچا اور اس کے بیان سے معلوم ہوا کہ اس کو راہ میں بڑی بڑی مشکلیں پیش آئیں۔ پس تم دوبارہ اس کے بھیجنے کا قصد مت کرنا۔ شہر میں صدہا آدمی ہندو مسلمان سرکار کے خیر خواہ موجود ہیں اور شہر کی خبریں برابر چلی آتی ہیں۔ جب موقع ہو گا کسی خیر خواہ کے ذریعے تم کو ایما کر دیا جائے گا۔ تم نکل آنے کے لیے ہر وقت تیار رہنا اور جن صاحب کے گھر میں تم نے پناہ لی ہے، ان کے تفصیلی حالات اور ان کے مکان کا پتا سب تمہارے آدمی سے دریافت کر لیا گیا ہے۔ ان پر سرکار اور تمام سرکاری عہدہ داران ملکی و فوجی کی احسان مندی کماحقہ طور پر ظاہر کر دینا اور یقین ہے کہ ان تمام وعدوں سے جن کا اس وقت کر لینا بہت احسان ہے، اس کی بہت زیادہ قدر کریں گی۔

ابن الوقت : اس سے بہتر اور کیا جواب ہو سکتا ہے؟ اس جواب کی نسبت کافی اور شافی اور مناسب جو کچھ کہا جائے، بجا ہے۔

نوبل صاحب : مگر میں یوں بیکار پڑے پڑے ضرور مر جاؤں گا۔

ابن الوقت : آپ مرنے والے ہوتے تو مرنے کے بہت سے مواقع تھے۔ اب آپ کی زندگی کا میں بیمہ لیتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کی طبیعت بیکاری سے اکتاتی ہے مگر جہاں اتنی مصیبتیں جھیلی ہیں، چند دن اور صبر کیجیے۔ میں سمجھتا ہوں مہینے سوا مہینے آپ ہمارے مہمان اور ہیں۔

نوبل صاحب : اوفوہ! مہینے سوا مہینے!

ابن الوقت : اس مدت کے لیے کیا اچھا مشغلہ اس وقت میرے خیال میں آیا ہے۔

نوبل صاحب : وہ کیا؟

ابن الوقت : حالات غدر کی یادداشت۔

نوبل صاحب : واہ واہ! بہت ہی اچھی صلاح ہے۔ مگر بہت سی باتیں اب مجھ کو اچھی طرح سے یاد بھی نہیں رہیں۔

ابن الوقت : جہاں تک آپ کو یاد ہے، اپنی یادداشت سے لکھئے، اور زیادہ درکار ہو تو میرے پاس ہر روز کے واقعات کی تفصیل کے ساتھ کیفیت لکھی ہوئی تیار ہے۔ آپ چاہیں تو اس میں سے لے سکتے ہیں۔ میرے اور آپ کے درمیان یہ قول رہا کہ اس یادداشت سے کسی کو ضرر نہ پہنچے۔

نوبل صاحب : میں نہیں جانتا کہ غدر کے بارے میں گورنمنٹ کی کیا رائے ہوگی۔ مگر باوجودیکہ غدر سے مجھ کو بڑی بڑی تکلیفیں پہنچی ہیں، ولایت جانے سے رہا۔ میرے اعزا و احباب نے مجھے مرا ہوا فرض کر کے خدا جانے کیا حال کیا ہوگا۔ میں زخمی ہوا، میری زندگی معرض تلف میں رہی، میری گیارہ برس کی کمائی سب تلف ہوئی۔ تین مہینے ہونے کو آئے کہ میں بیکار محض پڑا سڑتا ہوں اور ابھی نہیں معلوم کہ کب تک یونہی پڑا سڑوں گا۔ مجھ کو اپنے یگانوں اور دوستوں کے مرنے جینے کی مطلق خبر نہیں اور یہ بھی خبر نہیں کہ اس ہنگامے کے فرو ہونے تک کیا کیا ایذائیں اور مصیبتیں پیش آنے والی ہیں۔ باوجود ان تمام صدمات کے میں اس ملک کے لوگوں کو، سب کو نہیں تو اکثر کو کسی قدر معذور بھی سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک غدر ایک شورش جاہلانہ ہے۔ ہندوستانی فوج نے سرکاری قوت کا اندازہ کرنے میں غلطی کی۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ یہ ملک کمپنی بہادر نے ہماری مدد سے سر کیا ہے اور ہماری ہی مدد سے اس ملک پر قابض ہے۔ لوگوں کو کیا رعایا کیا فوج سرکاری ضوابط و قواعد سے بھی کسی قدر نارضامندی ضرور تھی۔ سرکاری عہدہ داروں نے اس نارضامندی کی مطلق پروا نہیں کی اور ہزار باتوں کی ایک بات تو یہ ہے کہ سرکار نے بزور شمشیر اپنی حکومت قاہرہ کو بٹھانا چاہا اور سلطنت مطمئنہ کی شرط ضروری ہے، خوشنودی رعایا افسوس ہے کہ تمامتر نہیں تو اس کا بڑا حصہ فوت ہوا اور گورنمنٹ کا منشا پا کر عہدہ داران سرکار نے بھی استمالت قلوب خلائق کی طرف ذرا توجہ نہ کی۔ اس صورت میں کمپنی بے شک ہندوستان کے بادشاہ ہے مگر اسی طرح کی بادشاہ جیسے جنگل میں شیر۔ میری ہرگز رائے یہ نہیں ہے کہ غدر کی کھچڑی مدت سے پک رہی تھی یا سوچ بچار کے صلاح مشورے سے یہ فساد ہوا۔ پس اگر میری رائے پر عمل ہوا اور وہ رائے اس حیثیت سے کہ

میری رائے ہے، ہرگز قابل وقعت نہیں، مگر میں سمجھتا ہوں کہ گورنر جنرل جیسا مدبر اور منتظم اور صائب الرائے ضرور تمام اطراف و جوانب پر نظر کر کے حلم اور درگزر کے اصول پر عمل کرے گا اور تب ہی یہ آگ بجھے گی بھی۔ انتقام کا لینا تو بقائے رعب اور سیاست کے لیے ضرور ہوگا، مگر تعمیم کے ساتھ نہیں۔ جن لوگوں نے کھلم کھلا بغاوت کی اور بغاوت کو پھیلایا اور مسلح ہو کر سرکار کے مقابلے میں معرکہ آرا ہوئے اور جنہوں نے حکومت کے استیصال کی تدبیریں کیں اور جنہوں نے انگریزوں یا ان کے بیوی بچوں کو صرف اس وجہ سے کہ انگریز ہیں، ناحق و ناروا قتل کیا، اور صرف ایسے ہی لوگوں کو سخت سزا دینی چاہیے۔

ابن الوقت : اب مجھ کو پورا اطمینان ہے کہ میرا روزنامچہ مجھ سے بہتر محفوظ ہاتھ میں رہے گا۔ لیجئے کتاب حاضر ہے۔

نوبل صاحب کے کئی ہفتے اس روزنامچے کی بدولت آسانی سے کٹ گئے اور یوں ان کی حالت منتظرہ جو تھی سو تھی ہی، مگر روزنامچے کا مشغلہ نہ مل گیا ہوتا تو نوبل صاحب اکتا کر اور بولا کر باہر نکل کھڑے ہوتے۔

نوبل صاحب کا روزنامچہ ابھی پورا نہیں ہوا تھا کہ غدر کے کوئی دو مہینے اور بیس بائیس دن بعد عشاء کی اذانیں ہو رہی تھیں کہ پہلا گولا قلعے کے دیوان عام میں گر کر پھٹا۔ سارے شہر میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ اس وقت نوبل صاحب اور ابن الوقت دونوں ایک ہی جگہ تھے۔ جونہی گولے کا دھماکا ہوا، ابن الوقت چونک پڑا اور یہ کہہ کر اٹھا کہ لیجئے جناب، دہلی کی فتح اور آپ کا انشاء اللہ مع الخیر والعافیت کیمپ انگریزی میں داخل ہونا مبارک! مبارک! مبارک!!! یہ ضرور قلعے کی آواز ہے۔ جاؤں ذرا اپنی سرکار کی خبر لوں۔ بیگم صاحب تو شہر کی توپوں کی آواز سن سن کر کانپ اٹھتی تھیں۔ خدا جانے یہ گولا کس مقام پر گرا۔ الٰہی خیر ہو۔

نوبل صاحب : شاید قلعے سے توپ چلی ہو۔

ابن الوقت : نہیں جناب۔ جب قلعے پر توپیں چڑھائی گئی تو بہت سی بیگمات بلکہ مرشد زادے حضور میں فریاد لے کر آئے تھے کہ ہم کو ڈر لگتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہیں ان توپوں کے چھوڑنے کا حکم ہو تو خانہ زاد آواز کے سنتے ہی دہل کر مر جائیں۔ جہاں پناہ نے اسی وقت حکم دے دیا کہ قلعے کی توپوں کے گولا انداز شہر کی فصیل کے مورچوں پر رہیں۔

اس وقت کا گیا گیا ابن الوقت پانچویں دن نواب معشوق محل بیگم صاحب کے پھول کر کے آیا تو نوبل صاحب کو دیکھ کر آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔ نوبل صاحب کو معلوم ہو ہی گیا تھا۔ فرمانے لگے کہ بیگم صاحب کے انتقال کا مجھ کو سخت ملال ہے۔ اور آپ سے جس قدر میں نے ان کی مدح

بنی ہے' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑی نیک دل ملکہ تھیں۔ مگر ایسے وقت کا مرنا میں ان کی خوش نصیبی سمجھتا ہوں۔ کیونکہ آپ کے جہاں پناہ نے اپنے ساتھ نسل تیمور اور تمام خاندان شاہی بلکہ شہر کے برباد اور تباہ کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ انہوں نے ملک گیری کی ہوس کی جب کہ ان کو اور ان کے اعوان و انصار کو ملک داری تو کجا خانہ داری کی بھی لیاقت نہ تھی۔ انہوں نے گورنمنٹ انگریزی کے نزدیک اپنے تئیں محسن کش' ناشکر گزار' غدار ثابت کر دیا۔ انہوں نے ہزار ہا خون جو غدر کی وجہ سے ہوئے اور ہو رہے ہیں اور اب خدا جانے کتنے ہوں گے' اپنی گردن پر لیے۔

ابن الوقت : ہرچند میں سمجھتا ہوں کہ بیگم صاحب کا ایسے وقت میں انتقال فرمانا ان کے حق میں بہت ہی بہتر ہوا۔ مگر وہ ہماری آج کی نہیں قدیم کی سرکار تھیں۔ ہمارے سارے خاندان پر ان کے اور ان کے بزرگوں کے احسانات کے انبار ہیں۔

نوبل صاحب : بے شک اپنے محسن اور مربی اور سرپرست اور آقا کی یاد تازہ رکھنا شرط مروت اور شیوہ وفاداری ہے۔ مگر میں امید کرتا ہوں کہ ہماری سرکار بھی آپ پر اتنا ضرور ثابت کر دے گی کہ وہ بھی قدر دانی اور حق شناسی میں قلعے کی کسی سرکار سے کم نہیں۔

جس دن قلعہ شاہی پر گولے برسنے شروع ہوئے' فوج باغی کا ضعف اور اہل شہر کا ہراس کھل پڑا۔ لوگ لگے مال و متاع اور گھر بار چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے اور لوگوں نے یہ غضب ڈھانا شروع کیا کہ کلکتی دروازے سے لے کر لاہوری دروازے تک شہر کے شمالی حصے میں شاذ و نادر کوئی مکان ان کے صدمے سے بچا ہو' ورنہ سارے دن اور ساری رات ہر طرف سے یہی آواز چلی آتی تھی' پھٹ اڑا اڑا اڑا دھواں۔ رفتہ رفتہ ابن الوقت کے محلے میں سے بھی لوگ کھسکنے شروع ہوئے۔ تب تو ابن الوقت کو سخت تردد پیدا ہوا کہ ایسا نہ ہو ہماری عورتوں کے کان میں بھنک پڑ جائے اور شہر سے چلے جانے کا ارادہ کریں۔ چنانچہ ابن الوقت نے ایک دن اس خدشے کو نوبل صاحب سے بھی بیان کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ جو لوگ شہر کے جنوبی حصے میں رہتے ہیں' ان لوگوں کے ڈر کر بھاگنے کی کوئی وجہ نہیں۔ یہ گولا باری صرف فوج باغی کو ڈرانے کی غرض سے ہو رہی ہے اور وہ حاصل ہو چکی۔ عمارتوں کا نقصان کرنے سے کیا فائدہ ہو گا؟ نہیں نہیں۔ آپ بخوبی اطمینان رکھیے۔ ہم لوگ گولوں کی گزند سے محفوظ ہیں۔ لیکن ہاں اگر ایسا ہوا کہ شہر کے فتح ہونے سے پہلے میرا جانا ٹھہر گیا تو اتنی احتیاط ضرور کرنا کہ مکان میں ہفتے عشرے کا سامان رکھ کر مضبوطی کے ساتھ اندر ہو بیٹھنا۔ فتح مندی فوج کا دشمن کے شہر میں داخل ہونا گویا ایک عذاب کا نازل ہونا ہے۔ سامنے پڑا ہوا آدمی بچ نہیں سکتا' اور میں امید کرتا ہوں کہ شہر کے فتح ہونے سے پہلے میں آپ کی حفاظت کا انتظام کر سکوں گا۔

اگلے دن جو ابن الوقت قلعے گیا تو دیکھا کہ خود جہاں پناہ بھی بھاگنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ سمجھا کہ بس اب صبح و شام انگریز داخل ہونے والے ہیں۔ وہاں کے کام کاج سے فارغ ہو کر گھر واپس آ رہا تھا کہ بادشاہ کے خاص الخاص خدمت گار قوت نے پیچھے سے آواز دی اور برابر آ کر کہنے لگا "بھلا ہوا کہ میں نے آپ کو جاتے دیکھ لیا' ورنہ آپ کے گھر جانا پڑتا۔ جو انگریز آپ کے گھر میں چھپا ہوا ہے' یہ چٹھی اس کے نام کی ہے۔ اس کو دے دیجئے۔" یہ کہہ کر یاقوت الٹے پاؤں پلٹ گیا۔ ابن الوقت اپنے دل میں کہتا چلا آتا تھا کہ کس برتے پر تتا پانی؟ مردانگی کا وہ حال کہ ایک دن قلعے سے باہر پاؤں نہ رکھا' بیدار مغزی اس درجے کی کہ اپنے خاص الخاص خدمت گار انگریزوں سے ملے ہوئے۔ تو بغاوت کرنی کیا ضرور تھی؟ اگر آ کر نوبل صاحب کو چٹھی دی۔ لکھا تھا کہ کل کا دن بیچ پرسوں دو بجے رات سے' شہر پر دھاوا ہے۔ آج رات کے آٹھ بجے سے آدھی رات تک ایک لفٹنٹ کچھ گورے لے کر کابلی دروازے کے باہر بو علی شاہ کے تکیے میں تمہارا منتظر رہے گا۔ موقع ہاتھ سے جانے نہ پائے۔

غدر کے بہت دنوں بعد تک شہر کے دروازوں پر پہرے چوکی کا ایسا سخت انتظام رہا کہ بے تلاشی کوئی گزرنے نہیں پاتا تھا۔ لوگوں میں تو یہ مشہور تھا کہ اس سے مخبری کا انسداد منظور ہے' مگر فی الواقع مردم آزاری کے سوا کوئی بات نہ تھی۔ یا اب یہ حال ہو گیا تھا کہ کلکتی دروازے سے لے کر کابلی دروازے تک شہر کے پانچ دروازے تو بالکل بند تھے' لاہور کھلا ہوا تھا' مگر برائے نام' کیونکہ گولے کے ڈر کے مارے کسی کو اس دروازے کے باہر بھی قدم رکھنے کی جرات نہ ہوتی تھی۔ آمد و شد کی بڑی بھرمار پہلے سے بھی زیادہ دلی دروازے اور ترکمان دروازے پر تھی۔ جب سے بھاگڑ شروع ہوئی یہ حال ہو گیا تھا کہ سدارا شہر انہی دروازوں کی راہ اٹھ ہوا نکلا چلا جاتا تھا۔ صلاح یہ ٹھہری کہ جب اچھی طرح جھٹ پٹا ہو تو ترکمان دروازے سے نکل لیں اور باہر گھوم کر تکیے میں جا داخل ہوں۔

نوبل صاحب جب تک ابن الوقت کے یہاں رہے' ہندوستانی لباس پہنا کیے۔ اور وہ ایسے جامہ زیب آدمی تھے کہ ہندوستانی کپڑوں میں بہت ہی بھلے معلوم ہوتے تھے۔ جو کپڑے پہنے بیٹھے تھے' اسی طرح ابن الوقت اور اس کے دو رازدار ملازم اور جاں نثار کو ساتھ لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ نوبل صاحب نے صرف اتنی ہی احتیاط کی کہ چادر سے اپنا منہ چھپا لیا جیسے کسی کی آنکھیں دکھتی ہوں۔ ابن الوقت ان کا ہاتھ پکڑے ہوئے آگے آگے تھا۔ وہ ایسا نفسی نفسی کا وقت تھا کہ کوئی کسی کے حال سے معترض نہ ہوتا تھا۔ نہ کسی نے روکا نہ ٹوکا۔ اچھی خاصی طرح دندناتے ہوئے دروازے کے باہر جا موجود ہوئے۔ پھر آگے اجمیری دروازے کے برابر بھی گنتی کے چند آدمی نظر آئے' جن کو اپنی دھن میں کسی کی سدھ نہ تھی۔ وہاں سے آگے بڑھے تو مطلع صاف

تھا۔ جنگل سے زیادہ ویران، بیابان سے بڑھ کر وحشت ناک۔ تکیہ بھی صاف طور پر نظر نہیں آیا کہ دور سے "ہو کمز ہئر؟" کی آواز آئی۔ معلوم ہوا کہ نوبل صاحب کے لینے کو لوگ پہنچ گئے ہیں۔ نوبل صاحب نے پکار کر "فرینڈز" کہا تو لیفٹیننٹ بریو آگے بڑھے۔ ادھر نوبل صاحب چھٹک کر الگ ہوئے۔ دونوں نے ہاتھ ملائے۔ ساتھ کے گوروں نے ہرا کے ساتھ نوبل صاحب کو نجات کی مبارک باد دی۔ پھر نوبل صاحب نے وہیں کھڑے کھڑے بریو صاحب سے ابن الوقت کی تقریب کی۔ وہ بے چارے مطلق اردو نہیں بول سکتے تھے۔ مگر نوبل صاحب ان کی طرف سے ترجمان ہوئے کہ لفٹنٹ صاحب آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آپ بھی کیمپ کو چلیں۔ ابن الوقت نے اہل و عیال کی تنہائی کا عذر کیا تو لفٹنٹ بریو نے کہا کہ خدا نے چاہا، کل تو نہیں پرسوں، اس سے بہت پہلے ہم آپ سے مل چکے گے، اور سب سے پہلا سپاہی جو آپ کی حفاظت کے لیے آپ کے گھر ہو گا شاید وہ میں ہوں گا۔ یہ کہہ کر لفٹنٹ بریو نے جیب سے دو چرٹ نکالے۔ ایک نوبل صاحب کو دیا اور دوسرا ابن الوقت کو۔ اور دیا سلائی سلگا کر ابن الوقت کے آگے کر دی۔ ابن الوقت نے لفٹنٹ کا بہت شکریہ ادا کیا اور یہ کہہ کر اپنا چرٹ نوبل صاحب کو دے دیا کہ آپ جانتے ہیں مجھ کو اس کی عادت نہیں۔ ابن الوقت نے یہ کہا تو سہی مگر اس کو معلوم نہ تھا کہ انگریزوں کی صحبت میں خدا جانے کیا کیا کھانا پینا اس کی قسمت میں لکھا ہے۔ نوبل صاحب نے بھی ابن الوقت کو نہایت درجے کی احسان مندی کے ساتھ رخصت کیا۔ جاں نثار تو نوبل صاحب کے ساتھ ہو لیا اور ابن الوقت اپنے دونوں نوکروں کے ساتھ پاس کے فراش خانے کی کھڑکی سے داخل شہر ہو کر شہر کے اندر اندر خوش و خرم گھر پہنچا۔

ان دنوں دلی کے رہنے والوں میں بہت تھوڑے دل مطمئن تھے اور جو قدرے قلیل و معدود چند مطمئن تھے ان میں ایک ابن الوقت بھی تھا۔ نوبل صاحب اور بریو نے تھوڑی دیر پہلے اس کے ساتھ اس قسم کی مدارات کی کہ سینکڑوں ہزاروں امیدیں اس کے دل میں امنڈنے لگیں۔ پس اگلا دن غدر کے دوسرے دنوں کی طرح خیریت سے گزرا۔ آدھی رات کا ڈھلنا تھا کہ دلی کے حصے کی قیامت آ گئی۔ یعنی کہ انگریزوں نے دو طرف سے شہر پر حملہ کیا۔ تھوڑی دیر توپیں چلیں، اس تسلسل کے ساتھ کہ جیسے کبھی زور کی مہاوٹ میں بجلی ہے کہ برابر کوند رہی ہے اور گرج رہی ہے کہ ایک لمحے کو نہیں تھمتی۔ اور پھر بندوقیں چلنی شروع ہوئیں۔ ابن الوقت کو دور سے بس ایسا سن پڑتا تھا کہ بھاڑ میں گویا چنوں کے گھان بھن رہے ہیں۔ پھر سوا پہر دن چڑھتے چڑھتے بارے وہ شدت تو کم ہوئی مگر بندوق کی آواز پھر بھی پھٹ پھاٹ ادھر سے ادھر چلی ہی آتی تھی۔ پھر ایسا سن پڑا کہ انگریز جا بجا مکانوں میں گھس بیٹھے ہیں، اور باغی ہیں کہ بولائے بولائے پڑے پھرتے ہیں۔ اصل حال نہیں کھلتا کہ جیت کس کی رہی۔

غرض جوں توں شام ہوئی اور سچ پوچھو تو شہر کے تمام جنوبی حصے میں دن بھی رات ہی کی طرح اداس تھی۔ بوڑھے سے بوڑھے آدمیوں کی ساری عمر امن میں گزری۔ ایسی لڑائیاں کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ تھیں۔ مارکٹائی میں اگر کسی کے خون نکل آیا تو سارے شہر میں کئی کئی دن اس کا چرچا رہتا تھا۔ اب ہر شخص اپنی جگہ ایک رائے لگاتا تھا۔ جتنے منہ اتنی باتیں کوئی کہتا تھا کہ بس جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ رات کو رہے سہے باغی بھی اپنا منہ کالا کر جائیں گے۔ شکر ہے مدتوں بعد نیند بھر کر سونا نصیب ہو گا۔ دوسرا پیش گوئی کرتا کہ لڑائی کا پیچھا ہی بھاری ہوتا ہے۔ انگریز اس قدر غضبناک ہو رہے ہیں کہ شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں تو سہی۔ تیسرا بول پڑتا کہ نہیں جی ایسا نہیں ہو سکتا۔ شہر کو مسمار کر دیں گے تو حکومت کاہے پر کریں گے؟ ڈلوں پر؟ پتھروں پر؟ چوتھا یہ صلاح دیتا کہ دو چار دن گھر سے باہر نکلنا ٹھیک نہیں۔ آدمی سامنے پڑا اور ٹھائیں سے اڑا دیا۔

فصل ۴

غدر کے بعد ابن الوقت کو کیا کیا مصیبتیں پیش آئیں

یہ اور ان سے بہت زیادہ باتیں خود ابن الوقت کے گھر میں وہ رہی تھیں کہ کوئی پہر ڈیڑھ پہر رات گئے سڑک کی طرف بڑے زور سے گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی۔ اور پھر معلوم ہوا کہ سوار مکان کے برابر ٹھہرا۔ چند لمحے کے بعد کسی نے ابن الوقت کا نام لے کر پکارا۔ سب کو حیرت ہوئی کہ ایسے اندھیرے میں کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سجھائی دیتا، کون آیا ہو گا۔ ابن الوقت نے دروازے کے پاس جا کر آہٹ لی تو معلوم ہوا کہ جاں نثار ہے۔ گھبرا کر پوچھا "کیا صاحب ہیں؟"

جاں نثار : ہوں تو میں اکیلا مگر صاحب کا بھیجا ہوا آیا ہوں۔ ان کی نوکری کوڑیا پل کے مورچے پر ہے۔ مورچہ چھوڑ کر نہیں آ سکتے۔ مجھ کو دوڑایا ہے کہ ہم سب لوگ سمجھتے تھے کہ شہر ایک دن میں فتح ہو جائے گا۔ مگر ابھی تک باغی موجود ہیں۔ نہیں معلوم کتنی لڑائیاں شہر پناہ کے اندر ہوں گی۔ عین لڑائی میں دوست دشمن کا امتیاز نہیں ہو سکتا۔ آپ مال و متاع کا ہرگز لالچ نہ کیجیے، فقط جانیں لے کر راتوں رات شہر کے باہر نکل جائیے۔ جب اچھی طرح تسلط بیٹھ جائے گا تو آپ ہم مل لیں گے۔ صبح ہوتے ہوتے خود تمہارے ہی محلے پر دھاوا

ہے۔

جلدی جلدی اتنا کہہ کر جاں نثار تو چلتا ہوا' ابن الوقت یہ پیغام سن کر کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد ہوش آیا تو سارے گھر کو سر پر اٹھا لیا کہ چلو' چلو' نکلو۔ اس وقت نوبل صاحب کا حال ابن الوقت نے کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اب اس کے غل مچانے پر جو لوگوں نے حجت شروع کی اور الکسائے تو اس کو بہ مجبوری ساری حقیقت بیان کرنی پڑی۔ رات کا وقت' بال بچوں کا ساتھ اور دفعتہ" گھر سے نکلنا اور وہ بھی محض بے سروسامانی سے خیر' وہ تو جان ہی کچھ ایسی پیاری تھی کہ ہچکچا کر نکلنے پر نکلے۔ ابھی کوئی سو قدم بھی گھر سے دور نہیں جانے پائے تھے کہ جیسا جاں نثار نے کہا تھا محلے پر اولوں کی طرح گولوں کی بارش ہونے لگی۔ دو ہفتے کامل شہر کے باہر خدائی خوار خاک چھانتے پڑے پھرے۔ دن کو کوٹلے میں ہیں تو رات کو عرب سرائے میں۔ آج پہاڑ گنج ہیں تو کل قدم شریف۔ جہاں جاتے ہیں' کوئی کھڑے ہونے تک کا روادار نہیں ہوتا۔

بارے سنا کہ پٹیالے والے حکیم خواجہ باقی باللہ میں ہیں اور ان کی وجہ سے وہاں سرکاری پہرا بیٹھا ہے اور امن ہے۔ رشتہ نہیں' قرابت نہیں' مگر آنکھوں پر ٹھیکری رکھ کر چلے کہ شاید ہم وطنی کا پاس کریں گے۔ گرتے پڑتے' سڑک کو بچاتے ہوئے' چلے جاتے تھے اور کچھ راہ گیر شہر کے جلاوطنوں میں سے سڑک پر بھی تھے۔ یکایک کیا دیکھتے ہیں کہ کچھ سوار ہیں اور سڑک پر پکڑ دھکڑ ہو رہی ہے۔ ان لوگوں نے چاہا کہ دبے پاؤں آڑ میں ہو لیں کہ ایک سوار گھوڑا دوڑا کر سر پر آموجود ہوا اور مضبوط آدمیوں کو چن چن کر کشاں کشاں سڑک پر لے گیا۔ معلوم ہوا کہ لوٹ کے مال کے کچھ گٹھڑ ہیں۔ ان کو اٹھوا کر رسالے میں لے جانا چاہتے ہیں اور رسالہ وزیر آباد میں ہے۔ یہاں سے کچھ نہیں تو چار کوس اور دلی کے مرزا منشوں کے حق میں ہزار کوس زبردست کا ٹھینگا سر پر۔ قریب تھا کہ ایک گٹھڑا ابن الوقت کو بھی سر پر لادنا پڑے کہ اتنے میں رجائی النصیب کی طرح چند انگریز گھوڑوں پر سوار آپہنچے۔ ان کو دیکھ کر لگے لوگ فریاد کرنے کہ دیکھیے خداوند ہم کو بیگار میں پکڑتے ہیں۔ اتفاق سے انگریزوں میں نوبل صاحب بھی تھے اور بیگاریوں میں ابن الوقت دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ آنکھوں کا چار ہونا تھا کہ نوبل صاحب گھوڑے سے کود' دوڑ کر ابن الوقت کو لپٹ گئے اور اپنے ساتھیوں سے کہا کہ یہ وہی صاحب ہیں۔ جنھوں نے مجھ کو اپنے گھر میں پناہ دی تھی۔ ان انگریزوں نے بھی اتر اتر کر ابن الوقت سے بڑے تپاک کے ساتھ ہاتھ ملائے۔ انگریز تو چلے گئے۔ نوبل صاحب وہیں ٹھہرے رہے اور جو سوار بیگار پکڑ رہے تھے' انہی میں سے ایک کوتوال کے پاس دوڑایا کہ جلد گاڑی' بہلی رتھ جو ملے لے آؤ۔

سواروں کے آنے اور لوگوں کے سوار کرنے اور گھروں تک پہنچانے میں کامل تین ساڑھے تین گھنٹے لگے۔ مگر واہ رے نوبل صاحب! ٹلنے ہی کا نام نہ لیا۔ ابن الوقت نے مکان پر پہنچ کر دیکھا

کہ جنگی سپاہی باہر دروازے پر کھڑا پہرا دے رہا ہے اور بڑے موٹے موٹے حرفوں کا اشتہار لگا ہوا ہے کہ یہ مکان خیر خواہ سرکار کا ہے۔ کوئی ادھر نظر بھر کر نہ دیکھے۔ ہوا یوں کہ جس وقت نوبل صاحب نے جاں نثار کی زبانی ابن الوقت کو شہر سے نکل جانے کے لیے کہلا بھیجا تھا۔ اسی وقت سے وہ تاک میں تھے۔ قابو پاتے ہی پہرا بٹھا دیا۔ باغیوں اور شہر والوں میں سے تو کسی کو لوٹ کھسوٹ کی سوجھتی نہ تھی۔ لوگوں کو اپنی ہی جان دو بھر تھی۔ رہ گئے سرکاری سپاہی اور فوج کے ستے' دھوبی' گراس کٹ وغیرہ' انہوں نے سارے شہر کو دھڑی دھڑی کر کے لوٹا۔ اوپر کا رکھا دھرا اسباب تو الگ کسی کا ایک تنکا نہیں بچا۔ گڑا دبا مال بھی کھود کھود کر نکال لے گئے۔ ابن الوقت کے مکان پر بھی سارے دن اور پہر رات گئے تک تانتا لگا رہتا تھا۔ کہ ایک گیا' ایک آیا۔ مگر پہرا اور اشتہار دیکھا اور کان دبا کر چلتے بنے۔ غرض خدا کے فضل سے ابن الوقت کے گھر میں سے ایک سوئی تک نہیں گئی۔ جیسا چھوڑ گئے تھے' ویسا کا ویسا آ دیکھا۔

فصل ۵

کوئین وکٹوریہ نے زمام سلطنت ہند اپنے ہاتھ میں لی' دربار میں ابن الوقت کو صلہ خیر خواہی ملا

اب نوبل صاحب ابن الوقت کو گھر میں بسا کر چلنے لگے تو اس کو سمجھا گئے کہ ہر چند شہر کامل طور پر فتح ہو گیا ہے' مگر مضافات میں بدستور بد عنوانی ہے۔ اکثر جگہ سرکاری تھانے تک نہیں بیٹھے۔ صاحب لوگوں میں کسی کو سانس لینے کی فرصت نہیں اور شاید آج رات کو جھجر پر دوڑ جانے والی ہے عجب نہیں مجھ کو جانا پڑے۔ آپ اطمینان سے بیٹھے رہیے۔ جب موقع ہو گا' میں خود آپ کو بلوا بھیجوں گا۔

شاموں شام جاں نثار ہزار روپے کا توڑا لا کر دے گیا کہ صاحب نے مدد خرچ کے لیے دیا ہے۔ اور پھر نوبل صاحب ایسے غائب ہوئے کہ ابن الوقت کو مدت تک کچھ حال ہی معلوم نہ ہوا کہ کہاں ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ اس اثناء میں شہر میں بسنے کی بندش بھی کسی قدر کھل گئی تھی۔ لوگ یونہی ڈر کے مارے اپنی اپنی جگہ ٹھٹکے ہوئے تھے۔ تاہم شہر میں اکثر محلے اور محلوں میں اکثر گھر اور گھروں میں اکثر آدمی آباد ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ امن عام کی منادی گلی گلی اور

کوچے کوچے پھرنے لگی۔ اور معلوم ہوا کہ ملکہ معظمہ نے کمپنی سے ملک نکال کر اپنے اہتمام میں لیا اور بڑی دھوم کا جشن ہونے والا ہے۔ کل جشن ہو گا اور نوبل صاحب کی کچھ خبر نہیں۔ کوئی چار گھڑی دن رہے کمشنری کا چپڑاسی ابن الوقت کے نام ایک لفافہ لایا۔ شرکت جشن کے بلاوے کا خط تھا۔

ابن الوقت جی ہی جی میں بہت زچ ہوا کہ مجھ کو انگریزی دربار میں کبھی جانے کا اتفاق ہوا نہیں، حکام میں کسی سے معرفت نہیں کیا نوبل صاحب کو ایسے ہی وقت میں مجھے چھوڑ کر چلا جانا تھا؟ بارے کشاں کشاں گیا تو نوبل صاحب کو موجود پایا۔

آج پہلا دن تھا کہ ابن الوقت نے نوبل صاحب کو ان کی اصلی شان میں دیکھا۔ بیسیوں انگریز اور ہندوستانی رئیس (اگرچہ اب رئیس کہاں تھے) ان کو گھیرے ہوئے تھے اور نوبل صاحب دربار کے اہتمام میں ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر دوڑے دوڑے پھر رہے تھے۔ تھوڑی دیر تک تو ابن الوقت کو انہوں نے دیکھا تک نہیں، مگر جب ان کی نظر پڑی، فوراً اس کے پاس آکر ہاتھ ملانے کے بعد کہنے لگے۔ "میں رات کے دس بجے آیا۔ اس وقت مجھ کو آپ سے بات کرنے کی مطلق فرصت نہیں۔ وہ فلاں نمبر کی کرسی آپ کی ہے۔ وہاں بیٹھیے ۔ آج (ذرا سوچ کر) بلکہ کل بھی آپ سے نہ مل سکوں گا۔ پرسوں نو بجے سے گیارہ بجے تک جس وقت آپ کا جی چاہے مجھ سے ٹامس صاحب کی کوٹھی پر مل سکتے ہیں۔"

ابن الوقت نے شاہی دربار بہتیرے دیکھے تھے۔ ان میں ان گئے وقتوں میں رونق کہو، شان کہو، صرف درباریوں کے زرق برق لباس کی تھی۔ وہ پرانی جامہ واریں۔ دقیانوسی پشمینے اس دربار میں سارے دربار شاہی کے مول کا تو ایک قالین ہو گا اور شامیانے اور خیمے اور میز کرسی اور جھاڑ فانوس اور تصاویر اور اسباب آرائش کا تو کون انداز کر سکتا تھا۔ ابن الاوقت نے آج جانا تھا کہ ساری رونق سادگی اور صفائی میں ہے۔ غرض شاہی اشتہار پہلے انگریزی اور پھر اردو میں پڑھا گیا۔ میدان دربار اور چھاؤنی اور قلعے سے تہری شاہی سلامی سر ہوئی۔ انگریزی باجے بجنے لگے۔ نذریں گزرنی شروع ہوئیں۔ اب خیر خواہان سرکار کا نمبر آیا ابن الوقت اپنے دل میں اپنی خیر خواہی پر بڑا نازاں تھا۔ اب معلوم ہوا کہ خاص شہر کے خیر خواہوں کی فہرست میں اس کا نمبر ۱۲۵ ہے۔ بہرکیف جب ابن الوقت کی نوبت آئی اور اس کا نام پکارا گیا تو صاحب کمشنر نے اس کو سامنے کھڑا کر کے اپنے ہاتھ سے نادان سنگھ جاٹ باغی زمیندار ضلع گوڑگانوہ کے علاقہ منضبطہ میں سے موضع کھیر کا پور (خیر خواہ پور) جمعی تین ہزار روپے سالانہ کی سند زمینداری نسلاً" بعد نسل دستخطی مہرلاٹ صاحب کے حوالے کی اور نوبل صاحب نے کمشنر صاحب کے پیچھے سے گردن نکال کر اشارے سے وہیں مبارک باد دی۔

ابن الوقت کی خیر خواہی کا چرچا تو اسی دن سے لوگوں میں ہونے لگا تھا جس وقت کہ دلی فتح ہوئی۔ آج کے دربار نے اس کو اور بھی مشتہر کر دیا اور معرفت قرابت کے لوگ جو ہنوز شہر کے باہر خانہ بدوش پڑے تھے اور کچھ لوٹنے کے سامان کرنے لگے۔ مگر ابن الوقت عجب کھرے روکھے، کھردرے، اکھڑ انگریزی مزاج کا آدمی تھا کہ یوں بے غرض اس سے ملو، ملاقات کرو، خوش گپ، خوش مزاج، خوش صحبت اور حرف مطلب زبان پر آیا نہیں اور اس نے دو ٹوک ٹکا سا جواب پتھر کی طرح منہ پر کھینچ کر مارا نہیں۔ اگر سیدھی طرح لوگوں کو کہہ دیا کرتا کہ انگریزوں کو معاملے میں چڑ ہوتی ہے یا میں صاف طور پر سفارش کرتے ہوئے ڈرتا ہوں یا موقع پاؤں گا تو کلمتہ الخیر سے دریغ نہیں کروں گا تو شاید لوگ اس سے اس قدر بے دل نہ ہوتے۔ مگر اس کا تو یہ حال تھا کہ کسی نے پیچھے پر ہاتھ رکھا اور اس نے دولتیاں جھاڑنی شروع کیں۔ اگرچہ ابن الوقت کی کج مداراتی سے لوگوں کے دلوں میں اس کی طرف سے نفرت پیدا ہو گئی تھی مگر اپنی غرض کو اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے۔ اور کچھ نہیں تو اتنی ہی بات کے بہانے سے گھڑی دو گھڑی کو آبیٹھتے کہ آپ نے تو غضب ہی کی جرات کی۔ ایسی شورش میں انگریز کو میگزین سے اٹھا لائے اور گھر میں پناہ دی۔ منہ پر کہنا تو خوشامد ہے مگر سچ تو یہ ہے کہ رستم کو بھی مات کیا۔

دوسرا : خیر بہادری تو بہادری، کمال تو یہ تھا کہ ناف شہر میں مجمع مجاہدین یعنی خانقاہ کے زیر سایہ انگریز چھپا رہا اور کسی کے فرشتوں کو خبر نہ ہوئی۔

تیسرا : بھلا انگریزوں کی قدردانی تو ملاحظہ کیجئے کہ جان جوکھم کے صلے میں دیا تو کیا دیا، تین ہزار کی زمینداری، اے جناب، ملک بخش دینے کے کام ہیں۔ ہائے! آج کو شاہجہاں ہوتا تھا۔

چوتھا : ابھی ابھی کیا خبر ہے۔ انگریزوں کے ہاں زمین دینے کا دستور نہیں، مگر ڈپٹی کر دیں، صدر اعلیٰ کر دیں، کابل میں سفیر یا کسی ریاست میں وزیر بنا کر بھیج دیں۔ جو چاہیں سو کر سکتے ہیں۔ اور میرا دل گواہی دیتا ہے کہ کریں گے اور پھر کریں گے۔ میں آپ کو دکھا دوں گا۔

کھلی خوشامد ہوتی تو ابن الوقت بھی ایسا ذرا احمق نہ تھا کہ سن کر اظہار بشاشت کرتا۔ دو شالوں میں لپیٹ لپیٹ کر جوتیاں مارتے تھے اور یہ جھانسے میں آکر فخر کے طور پر ایک ایک کے آگے غدر کی حکایتیں بیان کر کے داد چاہتا تھا۔ جب لوگ اس کو بھرے پر چڑھا لیتے تو باتوں ہی باتوں میں یہ بھی پوچھتے "کیوں صاحب، پھر وہ انگریز کپڑے کیسے پہنتا تھا؟"

ابن الوقت : جب صاحب کو ہم لاشوں میں سے اٹھا کر لائے تو ان کے کپڑے سب خون میں لت پت تھے۔ صاحب کو اپنے تن بدن کی مطلق خبر نہ تھی اور اس وقت تک ہم میں سے کسی کو معلوم نہیں تھا کہ کہاں کہاں زخم لگے ہیں۔ جو کپڑے پہنے ہوئے تھے، بہتیرا چاہا کہ

چیر کر الگ کر دیں مگر کپڑے اس بلا کے ڈھیٹ تھے کہ پھاڑے نہیں پھٹتے تھے۔ ہار کر قینچی سے کترے۔ پھر جب تک صاحب ہمارے گھر رہے، یہی ہم لوگوں کی طرح کے ہندوستانی کپڑے پہنتے رہے۔ مگر طنزاً نہیں بلکہ نصیحۃً کہا کرتے "افسوس ہندوستان کے لوگ عقل سے مطلق کام نہیں لیتے۔ ایک کپڑے ہم لوگ پہنتے ہیں کہ برسوں پھٹنے کا نام نہیں لیتے اور ایک کپڑے یہ ہیں کہ پہنے اور کھسکے۔ ایسے نازک اور مہین کپڑے عورتوں کی زیب و زینت کے لیے زیادہ مناسب ہیں۔ مردوں کو خدا نے اس غرض سے زیادہ توانائی دی ہے کہ ان کو محنت اور مشقت کرنی ہے۔ ہندوستانیوں کا لباس ان کی کاہلی اور آسائش طلبی کی دلیل ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ اس لباس میں چستی اور چالاکی باقی رہ نہیں سکتی۔

ہم نشین : بھلا صاحب، ان کے کھانے کا آپ نے کیا انتظام کیا تھا؟

ابن الوقت : بھائی، سچی بات تو یہ ہے کہ ہم نے برتن بھانڈا الگ ولگ نہیں کیا۔ کھانا ہمارا، برتن ہمارے، پکانے والے ہم، پھر الگ کرنے کی وجہ؟

ہم نشین : آخر وہ تھا تو انگریز؟

ابن الوقت : انگریز تھا تو ہونے دو۔ کھانے میں تو کوئی حرام چیز نہیں ہوتی تھی۔

ابن الوقت نے اس بات کو ذرا زور سے کہا تو ہم نشین سمجھ گیا کہ میرا کہنا ناگوار طبع ہوا۔ بے چارہ تھا ابن الغرض، دم بخود ہو کر رہ گیا۔ مگر اس کے بعد سے لوگ ابن الوقت کے حقے پان سے ذرا احتراز سا کرنے لگے تھے۔

فصل ۶

غدر کے بعد ابن الوقت اور نوبل صاحب کی پہلی اور تفصیلی ملاقات ابن الوقت نے نوبل صاحب کے ساتھ میز پر چھری کانٹے سے کھانا کھایا

دربار کے مجمع میں نوبل صاحب نے اپنا وقت ملاقات بتا ہی دیا تھا۔ دربار کے تیسرے دن ابن الوقت ٹامس صاحب کی کوٹھی پر جا موجود ہوا۔ کوٹھی بجائے خود ایک چھاؤنی تھی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ زرد بنگلے میں ہیں۔ بنگلے کا احاطہ الگ تھا۔ دیکھتا کیا ہے کہ بیرونی دروازے پر ملاقاتیوں کی سواریاں کھڑی ہیں۔ دروازے کے اندر ایک چھوٹا سا مگر وسعت صحن کے مناسب خوبصورت چمن آراستہ، اور اتنے ہی سے چمن میں چار مالی کام کر رہے ہیں۔ درختوں کی شادابی،

سڑکوں کی صفائی، روشوں کی درستی کہے دیتی ہے کہ مالی صرف نوکری کے ڈر سے نہیں بلکہ اپنے شوق سے بھی کام میں لگے لپٹے رہتے ہیں۔ پرہاں، کیاریوں کی قطع اور درختوں کی انتخاب میں ایک خاص سلیقہ اور مذاق ظاہر ہوتا ہے جو کسی مالی کے بس کا نہیں۔ ابن الوقت چمن سے جابجا رکتا ٹھٹھکتا، برآمدے تک پہنچا تو ملاقاتیوں کا ہجوم تھا۔ بعض کرسیوں پر تھے، بعض فرش پر اور بعض (شاید امیدوار ہوں) برآمدے کے دونوں طرف ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ نوبل صاحب کے آدمی ابن الوقت کو پہچان تو چکے ہی تھے، آتا ہوا دیکھ کر سب نے اسے کھڑے ہو کر سلام کیا اور اتنی اس کے ساتھ خصوصیت برتی کہ الگ کمرے میں لے جا کر بٹھا دیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک چپڑاسی نے آکر خبر دی کہ صاحب کو آپ کی اطلاع ہو گئی ہے۔

ابن الوقت : پھر صاحب نے کیا فرمایا؟

چپڑاسی : آپ نے دیکھا، کتنے آدمی آپ سے پہلے کے آئے ہوئے بیٹھے ہیں۔

ابن الوقت : کیا یہ سب ہو لیں گے تب میرا نمبر آئے گا؟

چپڑاسی : ان لوگوں کی ملاقات چار چار پانچ پانچ منٹ، بلکہ صاحب نے آپ کا آنا تو سن ہی لیا ہے۔ لوگوں کو جلد جلد رخصت کریں گے۔ کیا کہیں صاحب، ہمارے صاحب کا مزاج اس طرح کا ہے کہ جو آکھڑا ہو تو اس کو جواب نہیں دیتے ملنے کے تو بڑے دھنی ہیں، اور اسی وجہ سے ہم لوگوں کو بھی چھٹی نہیں ملتی۔ ورنہ کبھی کے آپ کے سلام کو حاضر ہوئے ہوتے۔ اتوار کو ضرور شاگرد پیشہ حاضر ہوں گے۔ سب لوگ بڑی آس لگا رہے ہیں۔

ادھر نوبل صاحب اپنی جگہ ابن الوقت کے خیال سے واقع میں دو ہی دو باتیں کر کے لوگوں کو اوپر تلے ٹال رہے تھے۔ پھر بھی ابن الوقت کو آدھ گھنٹے کے قریب انتظار کرنا ہی پڑا۔ اس کی ملاقات نوبل صاحب کے ساتھ ایسی حالت میں شروع ہوئی کہ نوبل صاحب کی اس وقت کچھ ہستی ہی نہ تھی، اس کے بعد سے جب نوبل صاحب ملے، منصبی اور قومی تعزز ہر حال میں ان کے ساتھ تھا۔ خواجہ باقی باللہ کی سڑک پر جب کہ ابن الوقت بیگار پکڑا ہوا ایک گٹھڑا اٹھانے کو تھا تو نوبل صاحب کو اس نے دیکھا، کئی انگریزوں کے ساتھ عربی گھوڑے پر سوار، پھر دربار میں دیکھا تو دربار کا اہتمام کرتے ہوئے انگریزوں میں پیش پیش، پھر آج بنگلے پر کہ ملاقاتیوں کی سواریاں دروازے پر کھڑی ہیں اور شہر کے بیسیوں رئیس سلام کے منتظر حاضر، شاگرد پیشہ لوگوں کی یہ کثرت کہ احاطہ بجائے خود ایک چھوٹا سا محلہ معلوم ہوتا ہے۔ ہر قسم کی متعدد سواریاں احاطے کے اس سرے سے اس سرے تک بھری پڑی ہیں۔ بنگلے کے تمام کمرے فرش، پردہ، چلمن، میز، کرسی، شیشہ آلات اور آرائش کے سامان سے سجے ہوئے ہیں۔ ابھی چند دن ہوئے کہ غدر کے دنوں میں اس کوٹھی کے کسی کمرے کی چھت تک باقی نہ رہی تھی۔ اب دو ہی مہینے میں العکوسہ نصف الکرامہ

نئے سرے سے مکان بھی بن گیا‘ رنگ بھی پھر گیا اور ہر طرح کا سامان بھی مہیا ہو گیا۔ باغ بھی لگ گیا یعنی جہاں کچھ نہ تھا‘ وہاں سب کچھ ہو گیا۔ چار چپڑاسی اور پانچواں جمعدار۔ اتنے آدمی صاحب کے کمرے سے ایک کمرا چھوڑ کر دروازے سے لگے بیٹھے ہیں۔ اندر سے ذرا سی آواز آئی اور دوڑے۔

نوبل صاحب کی یہ شان اگرچہ ابن الوقت کو پہلے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا مگر اس بات کا حق الیقین تھا کہ ایک غدر نہیں ایسے ایسے ہزار غدر کیوں نہ ہوں انگریزوں کی عملداری جانے والی نہیں۔ بلکہ غدر کے بعد جو تسلط بیٹھے گا‘ پہلے سے زیادہ مستحکم اور پائیدار ہو گا۔ وہ خوب سمجھے ہوئے تھا کہ اگر اس وقت اتفاق سے کوئی انگریز بلکہ کوئی کرانی بھی نوبل صاحب کی طرح کیں بھیگی بلی بنا ہوا بیٹھا ہے‘ وہ حقیقت میں شیر ببر ہے۔ فی الحال گرد و غبار ہے اور بے اعتبار ماں‘ سوار۔

مگر ابن الوقت کی خود داری ایسی بڑھی ہوئی تھی کہ نہ اس نے اس بات کا خیال کیا کہ جو لوگ عزت میں‘ مقدرت میں‘ اور شاید سرکاری خیر خواہی میں بھی اس پر ہر طرح ترجیح رکھتے ہیں برآمدے میں بٹھائے گئے ہیں‘ اور یہ کمرے میں۔ اور نہ اس پر نظر کی کہ جو لوگ آنے میں اس سے اقدام ہیں‘ آرزوئے انصاف ان کو ملاقات میں بھی اقدام ہونا چاہیئے۔ آدھ ہی گھنٹے کے انتظار میں ایسا اکتا گیا کہ بار بار چپڑاسیوں سے ترش روئی کے ساتھ پوچھتا تھا کہ اب کتنے آدمی اور ہیں؟ کہیں تم نے میری اطلاع یا صاحب نے سمجھنے میں تو غلطی نہیں کی؟ اس کو اپنے زعم میں بٹھائے جانے سے خجالت تھی اور وہ اس خجالت کے ٹالنے کو کمرے میں ٹہلتا اور کتابوں اور تصویروں اور دوسری چیزوں کو جگہ سے ہٹا کر دیکھتا۔ اگرچہ اس نے کسی چیز کو بے ٹھکانے نہیں کیا مگر چپڑاسی اس کی یہ آزادی دیکھ کر دل میں بہت ناخوش تھے اور دور ہٹ کر چپکے چپکے آپس میں کہتے تھے۔ یہ بھی عجب آدمی ہے کہ ایک دم اس سے نچلا نہیں بیٹھا جاتا۔ اس کو کمرے میں بٹھانا ہی نہ تھا۔

جمعدار : میاں‘ ہوش کی بنواؤ۔ تمہیں خبر بھی ہے کہ یہ کون ہیں؟ غدر میں صاحب انہی کے گھر میں تھے۔ ان کو برآمدے میں بٹھا دیتا اور صاحب کی نظر پڑ جاتی تو سب کی شامت آجاتی۔

چپڑاسی : جی جمعدار‘ خیر خواہی کی تو سر آنکھوں پر۔ سرکار دربار کا بھی کچھ ادب ہے یا نہیں؟ حاکم کی ڈیوڑھی پر امیر‘ رئیس‘ راجا‘ بابو‘ نواب‘ زمیندار سب ہی آتے ہیں۔ اندر جا کر چاہے صاحب کی گود میں بیٹھتے ہوں‘ پر باہر تو ہم نے سب کا ایک ہی قاعدہ دیکھا۔ ہاتھ باندھے‘ سر جھکائے چپ چاپ کل تم نے لوہارو والے نواب کی طرف خیال نہ کیا ہو گا۔ صاحب کو غسل خانے میں دیر لگی تو اسی کمرے میں تھے۔ کھانسی اٹھی تو آواز کی گونج کے ڈر کے مارے کھڑکی کے باہر منہ نکال کر اور رومال رکھ کر کھانسے۔ اور میں نے اگالدان لانے کو پوچھا تو اشارے سے منع کر دیا۔

جمعدار : کیا مضائقہ ہے۔ ان کو صاحب لوگوں سے ملنے کا اتفاق نہ پڑا ہو گا۔

چپڑاسی : میں تو انعام لینے جاؤں گا تو ضرور اتنی بات ان کے کان میں ڈال دوں گا۔

جمعدار : نہیں جی۔ تمہیں کیا پڑی؟

چپڑاسی : مجھے پڑی یہ کہ اب ان صاحب سے ٹھہری خصوصیت۔ ان کا روز کا نہیں تو تیسرے چوتھے دن کا پھیرا ضرور ہوا کرے گا۔ اور ہمارے صاحب کے پاس باہر کے ایک دو صاحب ہمیشہ ٹھہرے ہی رہتے ہیں۔ بعضا انگریز ایسا بدمزاج ہوتا ہے کہ کالے آدمی کی صورت سے جلتا ہے۔ وہ اگر ایسی بدتمیزی دیکھ پائے تو ڈک سے یا بوٹ کی ٹھوکر سے خبر لے۔ انہی کی نہیں بلکہ ہم لوگوں کی بھی۔

اتنے میں نوبل صاحب کے باہر آنے کی آہٹ سی معلوم ہوئی۔ سارے چپڑاسی اور جس قدر لوگ ملاقات سے رہ گئے تھے‘ سب کے سب ایک دم سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ جو شخص صاحب کے ساتھ ساتھ باتیں کرتے ہوئے اندر سے آئے تھے‘ وہ دروازے سے سلام کر کے رخصت ہوئے۔ باقیوں کو صاحب سلامت کے بعد صاحب نے رخصت کر دیا کہ آج دیر بہت ہو گئی‘ اور خود ابن الوقت کے کمرے میں چلے گئے۔ پہلی بات جو صاحب نے ابن الوقت سے کہی تھی یہ تھی کہ میں افسوس کرتا ہوں کہ آپ کو اتنی دیر انتظار کرنا پڑا۔ آپ کے شہر میں مخبری کا بازار اتنا گرم ہو رہا ہے کہ جس نے کچھ نہیں کیا‘ وہ بھی خوف کے مارے پریشان ہے کہ دیکھئے کوئی کیا جا کر لگا دے۔ اور حکام کی نظر ہے سخت۔ اس سے لوگ اور بھی ہراساں ہیں۔

ابن الوقت کچھ کہنا چاہتا تھا کہ صاحب بول اٹھے۔ مجھ کو آپ سے بہت دیر باتیں کرنی ہیں اور کھانا بھی میز پر رکھا جا چکا ہے۔ چلئے‘ کھاتے بھی جائیں اور باتیں بھی کرتے جائیں۔

ابن الوقت : میں کچھ وقت کا ایسا پابند نہیں ہوں۔ آپ کھائیے میں گھر جا کر کھا لوں گا۔ اور ابھی کچھ ایسا ناوقت بھی نہیں ہوا۔

نوبل صاحب : (مسکرا کر ابن الوقت کے ساتھ کھانے کے کمرے کی طرف چلتے ہوئے) کیوں؟ کیا آپ کو میرے ساتھ کھانے میں کچھ احتراز ہے؟ میں وہی نوبل ہوں کہ میں نے اور آپ نے مہینوں ایک جگہ کھانا کھایا۔ اور آپ کو یہ بخوبی معلوم ہے کہ میں اس وقت بھی ایسا ہی عیسائی تھا جیسا غدر سے پہلے اور جیسا اب ہوں۔ اور جیسا خدا نے چاہا۔ اس کی مدد سے مرتے دم تک رہوں گا۔

ابن الوقت : نہیں‘ مجھ کو اپنی ذات سے تو اعتراض اور احتراز کچھ بھی نہیں مگر لوگ اس کو برا سمجھتے ہیں۔

نوبل صاحب : مگر آپ بھی اس میں کچھ برائی پاتے ہیں یا نہیں؟

ابن الوقت : نہیں، میں تو ہرگز کسی طرح کی برائی نہیں پاتا۔

نوبل صاحب : ہندوستان کو جس کمزوری نے تباہ کیا، اصل میں وہ یہی کمزوری ہے۔ خدا نے جیسی ان کی طبیعتیں بودی اور محکوم بنائی تھیں، ویسے ہی یہ لوگ سدا سے بودے اور محکوم رہتے چلے آئے ہیں۔ اور جب تک یہ کمزوری ان کی طبیعتوں میں ہے، آگے کو بھی ضرور بودے اور محکوم رہیں گے۔

ابن الوقت کو پہلے ہی سے انگریزوں کی طرف رجحان تھا۔ اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ۔ نوبل صاحب کا اشارہ پاتے ہی مقابل کی ایک کرسی پر ڈٹ ہی تو گیا۔ اور یہ وہ عیسائیت کا نہیں بلکہ اس کی انگریزیت کا گویا اصطباغ تھا۔ حسن اتفاق سے اس وقت میز پر کوئی انگریز نہ تھا۔ یوں تو کئی صاحب ان کی کوٹھی میں ٹھہرے ہوئے تھے، مگر سب کے سب مل کر شکار کھیلنے چلے گئے تھے اور بہت بہتر ہوا کہ نوبل صاحب اکیلے تھے۔ ورنہ آج ابن الوقت کی خوب ہنسی اڑی ہوتی۔ اس نے ناواقفیت کی وجہ سے ایسی ایسی بے تمیزیاں کیں کہ وہ نوبل صاحب ہی جیسا متین آدمی تھا کہ نہ تو اس کو ہنسی آئی اور نہ اس نے برا مانا۔ ہنسنے کو کھانا کھلانے والے خدمت گار کیا کم تھے۔ مگر نوبل صاحب کے ڈر کے مارے کسی کی مجال نہ تھی کہ مسکرا بھی لیتا۔ ہنسنا تو بڑی بات ہے۔ ابن الوقت کی بے جا حرکتیں دیکھتے اور دوسرے کی طرف کن آنکھیوں سے نظر کر کے رہ جاتے۔ پر اپنی جگہ جا کر تو مارے ہنسی کے ضرور لوٹ لوٹ گئے ہوں گے۔

اس نے بے تمیزی سے بے تمیزی یہ کی کہ داہنے ہاتھ میں کانٹا لیا اور بائیں ہاتھ میں چھری۔ نوبل صاحب کے بتانے سے کانٹا بائیں ہاتھ میں لیا تو چھری کو اس زور سے کانٹے پر ریت دیا کہ چھری کی ساری باڑھ جھڑ پڑی۔ خدمت گار نے میز پر سے دوسری چھری اٹھا کر دی۔ شاید آلو ہی تھا کہ اس کو کاٹنے لگا تو اچھل کر بڑی خیر ہو گئی کہ ٹیبل کلاتھ (دسترخوان) پر گرا۔ پھر جب کسی چیز کو کانٹے میں پرو کر منہ میں لے جانا چاہتا تھا، ہمیشہ نشانہ خطا کرتا اور جب تک باری باری سے ناک اور ٹھوڑی اور کلے یعنی تمام چہرے کو داغ دار نہیں کر لیتا، کوئی لقمہ منہ میں نہیں لے جا سکتا۔ اس دن کھانے کے بعد کوئی اس کا منہ دیکھتا تو ضرور یہی پھبتی کہتا کہ چہرہ ہے یا دیوالی کی کلھیا۔ اس نے کہا تو نہیں مگر اس کی سسکی سے کئی دفعہ ایسا بھی شبہ ہوا کہ ہونٹوں میں یا مسوڑھوں میں یا زبان میں کہیں نہ کہیں کانٹا چبھا ضرور۔ اور پھر اول مرتبہ خدمت گار جھوٹی رکابی سامنے سے اٹھانے لگا تو اس نے سمجھا کہ بس دسترخوان بڑھانا چاہتا ہے۔ کچھ کہنے ہی کو تھا کہ خدمت گار تھا سلیقہ مند، سمجھ گیا اور یہ کہہ کر رکابی آگے سے کھینچ چلتا ہوا کہ دوسری صاف پلیٹ لاتا ہوں۔ تمام کھانے میں کوئی چھ یا سات رکابیاں بدل گئیں۔ مگر اس بندہ خدا نے چھری کانٹا ہاتھ سے نہ چھوڑا، جب تک خدمت گار نے منہ پھوڑ پھوڑ کر نہیں مانگا۔ جب خدمت گار پہلی قاب لایا تو

اس نے دونوں کنارے پکڑ، ساری قاب اس کے ہاتھ سے لے، چمچے سمیت اپنے سامنے رکھ لی۔ خدمت گار نے کان میں جھک کر کہا کہ اس میں سے جتنا آپ کو درکار ہو، چمچے سے اپنے سامنے کی رکابی میں لے لیجیے۔ پڈنگ کانٹے سے کھانے کی تھی۔ اس کو جو لگی مزے کی چمچے سے ہڑپ۔ اور اس پر مزہ یہ کہ تھوڑی سی اور دنیا۔ آخر میں سب سے زیادہ بے ہودہ بے تمیزی جو کی یہ تھی کہ فنگر گلاس کا پانی اٹھا کر پی گیا۔

ابن الوقت کی بعض حرکتیں حقیقت میں سخت بیجا تھیں۔ مگر واہ ری شرافت نوبل صاحب شروع سے آخر تک گردن جھکائے بیٹھے رہے۔ گویا کچھ خبر ہی نہیں۔ مگر نیچی نگاہوں سے سب کچھ دیکھ رہے تھے اور دل میں ضرور پشیمان ہوئے ہوں گے کہ میں نے ناحق اس کو کھانے میں شریک کیا۔ ان کی پشیمانی اس خیال سے ان کو ضرور ایذا ہوئی ہو گی کہ ایسی خصوصیت پر کیوں کر ہو سکتا تھا کہ عین وقت پر کھانے کی تواضع نہ کرتا۔ تواضع کا کرنا تو مناسب بلکہ واجب تھا، اور اب تواضع کی تو آگے کو ایک راستہ کھلا۔ اور بھلے کو آج کوئی انگریز کھانے میں شریک نہ تھا۔ اور ہوتا تو ساری عمر ان کی بے تمیزیوں کی نقلیں کر کے مجھ کو چھیڑا کرتا۔ نوبل صاحب جب تک میز پر رہے اسی فکر میں تھے۔ انہوں نے ابن الوقت کے ساتھ مطلق کسی قسم کی بات نہیں کی، ورنہ نوبل صاحب کی میز کے چرچے تمام چھاؤنی میں مشہور تھے۔ خیر کھانے کے بعد نوبل صاحب نے ایک خدمت گار کو اشارہ کیا کہ آپ کو غسل خانے میں لے جا کر ہاتھ دھلواؤ۔ وہاں سامنے سنگھار میز پر قد آدم آئینہ لگا تھا۔ ابن الوقت نے جاتے ہی اپنا عکس دیکھا تو بے ساختہ انشاء اللہ خاں کا وہ مقولہ یاد آگیا۔

داڑھی کو لگا شیخ کی اب بزر قطونا۔ اور بجنے لگی گت

بارے ہاتھ منہ ہاتھ دھو اور آدمیوں کی جون میں آ کر پھر نوبل صاحب کے پاس آیا۔ نہ جاننا بھی عجب مزے کی چیز ہے۔ ابن الوقت اتنا بھی تو متنبہ نہ ہوا کہ معذرت کرتا۔ نوبل صاحب نے تو اپنے لیے پائپ روشن کر لیا تھا، ابن الوقت کی طرف سگریٹ کا بکس سرکا دیا کہ اس میں جو تمباکو ہے روم کے علاقے میں پیدا ہوتا ہے، اور چرٹ کے مقابلے میں بہت ہلکا ہے۔ آپ بے تامل پیجیے۔ اور جب آپ چند روز اس کی عادت کیجیے گا تو میں یقین کرتا ہوں کہ اس کے سامنے آپ حقے کو منہ بھی نہ لگائیں گے۔ میں صبح و شام اور کھانے کے وقت تو پائپ پیتا ہوں اور باقی اوقات یہی سگریٹ ابن الوقت گڑ کھا چکا تھا تو گلگلوں سے کاہے کو پرہیز۔ دیا سلائی سلگا انجن کی طرح بھک بھک منہ سے دھواں نکالنے لگا۔

اب نوبل صاحب نے اپنی باتوں کا سلسلہ شروع کیا کہ جس روز آپ سے خواجہ باقی باللہ میں ملاقات ہوئی، اس کے بعد سے میں برابر دلی کے باہر باہر رہا۔ اسی اثناء میں ایک بار چیف کمشنر بہادر

نے کرنال میں مجھے بلوا بھیجا۔ تا بہ دیر غدر کے حالات استفسار فرماتے رہے اور اس کے ضمن میں آپ کا ذکر بھی آیا۔ مجھ کو اس بات کے جاننے سے سخت حیرت ہوئی کہ چیف کمشنر صاحب کو آپ کے ذاتی اور خانگی حالات مجھ سے بھی زیادہ معلوم ہیں۔ وہ آپ کے دور و نزدیک ایک ایک رشتے دار سے واقف ہیں اور جو جو حرکتیں ان لوگوں سے غدر ہیں۔ سرزد ہوئی ہیں' ان کے پاس تاریخ وار نام اور سب کی تحریری یاداشت موجود ہے۔ مجاہدین کا گھروں میں ٹھہرانا' ان کے لیے چندے جمع کرنا' روپے سے' ہتھیاروں سے' کھانے کپڑے سے ان کی مدد کرنا' مجاہدین کے ساتھ جا جا کر دمدمے بنوانا اور وہاں بھی ان کا ساتھ دینا' سرکاری میگزین کے ہتھیاروں اور سرکاری کالج کی کتابوں کا لوٹنا' انگریزی عمارتوں کا ڈھانا' انگریزوں کے مارے جانے کا تماشا دیکھنا' لوگوں کو بغاوت کی ترکیب دینا' نمازیں پڑھ پڑھ کر علی الاعلان انگریزی عمل داری کے غارت ہونے کی دعائیں مانگنا اور اس کے لیے وظیفے اور ختم پڑھنا اور کیا کیا کرنا۔ سارے پتے کی باتیں (خدا جانے کس بھیدی نے ان کو بتائی ہیں ان پر منکشف ہیں جہاد کے اصل مہری فتوے' لوگوں کی خانگی' خطوط اور شاہی دفتر ان کے پاس ہے غرض سب کے ہاتھ کٹے ہوئے ہیں۔ مجھ کو تو ایسا نظر آتا ہے کہ دلی کے مسلمانوں میں شاذ و نادر کوئی متنفس الزام بغاوت سے بچ جائے تو بچ جائے ورنہ روداد بہت ٹیڑھی ہے۔

ابن الوقت : آپ نے کہیں میرے روزنامچے کا تو کچھ تذکرہ نہیں کر دیا؟

نوبل صاحب : آپ نے ان سب تحریرات کو دیکھا ہوتا جو میں نے دیکھی ہیں تو آپ خود سمجھ لیتے کہ آپ کے روزنامچے کا نام لینا نہ صرف فضول ولا حاصل تھا بلکہ دلیل حماقت۔ اجی حضرت' نہیں معلوم ایسے ایسے کتنے روزنامچے سرکار میں پیش ہیں' اور نہیں معلوم کتنے آدمی روزنامچہ نویسی کے کام پر مامور تھے۔

ابن الوقت : تو یہ دربار اشتہار اور قول و قرار سب لغو؟

نوبل صاحب : نہیں' نہیں۔ غدر اور بغاوت کچھ لڑکوں کا کھیل تو نہیں۔ اس کا ضروری لازمی نتیجہ ہندوستان کے حق میں نہایت ہی زبوں تھا۔ ملکہ معظمہ اور گورنر جنرل نے حقیقت میں بڑا ہی تحمل کیا' ورنہ عام انگریز تو ابھی تک اس قدر غیظ و غضب میں بھرے ہوئے ہیں کہ انگریز کے ایک قطرہ خون کے عوض ہندوستانیوں کے خون کی ندیاں بہا دی جائیں تو بھی ان کی پیاس نہ بجھے مگر کیا کریں' کچھ بس نہیں چلتا۔ شاہی حکم سے لاچار ہیں۔ نہیں تو سارے شہر کو ڈھا کر مسمار کر دیتے کہ چند روز بعد کوئی اتنا بھی نہ پہچان سکتا کہ دلی کہاں بستی تھی۔ یہ اشتہار کا اثر ہے کہ جب تک شہر پناہ کے اندر لڑائی ہوتی رہی یا لڑائی کے دو تین دن بعد تک جو ہونا تھا سو لیا' اب جان و مال دونوں محفوظ ہیں۔ دلی کے مسلمان سرکار

کی نظر میں عموماً مشتبہ ٹھہر چکے۔ اب برات کا بار ثبوت انہی پر ہے۔ برات ثابت کریں اور مزے سے اپنے گھروں میں آباد ہوں۔

ابن الوقت : مجھ کو دوسروں کا حال تو معلوم نہیں' مگر ہمارے خاندان پر بیٹھے بٹھائے تباہی آئی۔ کم بخت اچھی خاصی طرح شہر سے منہ کالا کر گئے تھے۔ میری خیر خواہی کی خبر سن بے بلائے پھر آموجود ہوئے۔ دلی اور اس کے اطراف میں بڑی سختی ہے اور جو لوگ دور نکل گئے ہیں' پھر بھی امن میں ہیں۔ بلا سے میں تو ان لوگوں سے کہہ دوں گا کہ پھر کہیں کو نکل جائیں سرکار کو اتنا خیال نہیں کہ متوسلان شاہی اور عام رعایائے انگریزی کی حالت میں بڑا فرق ہے۔ متوسلان شاہی پر سرکار انگریزی کے ایسے کیا حقوق تھے کہ ان سے وفاداری اور خیر خواہی کی توقع کی جائے پھر قلعہ کیا برباد ہوا' قلعے کے سارے شاہی نمک خوار بے موت مر گئے۔ یہ سزا کیا کم ہے کہ ان سے دوسرے مواخذے کیے جائیں؟

نوبل صاحب : میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ میں نے آپ کے عزیزوں کی طرف سے یہی حجت پیش کی تھی اور بڑے شکر کی جگہ ہے کہ بڑے عہدہ دار سب ٹھنڈے ہیں۔ چیف صاحب نے میری باتیں سن کر بالکل میری رائے سے اتفاق کیا اور فرمانے لگے کہ گورنمنٹ ہند کے حکم سے تحقیقات بغاوت کا ایک جداگانہ محکمہ قائم کرنا منظور ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ قسمت دہلی کے لیے تم کو اس محکمے کا کمشنر مقرر کر دوں' کیونکہ تمہاری رائے بالکل گورنمنٹ کے منشا کے مطابق ہے۔ میں کیا عذر کر سکتا تھا۔ چیف صاحب کا حکم میں نے سر آنکھوں پر رکھا اور اگلے مہینے کی پہلی تاریخ سے میں اپنا کام شروع کر دوں گا۔

ابن الوقت : بس' آپ نے یہ خوشی کی خبر سنائی۔ دلی کے مسلمان اگر میری طرح آپ سے واقف ہوں تو ان کے گھروں میں گھی کے چراغ جلانے چاہئیں ورنہ گورنمنٹ کے حکم اور احکام دھرے ہی رہتے اور حکام ضلع اپنے ذاتی غیظ و غضب سے آفت توڑ مارتے۔

نوبل صاحب : عام انگریز کے غصے کا یہ حال ہے کہ ایک مجمع میں آپ کی خیر خواہی کا ذکر تھا تو جتنے تھے' سب کے سب مخاصمانہ اشتباہات کرنے لگے کہ ایک شخص جس کو تم سے' سرکار انگریزی سے کسی قسم کا تعلق نہیں' اور جس کے خاندان میں مذہبی تعصب اس شدومد کے ساتھ ظاہر ہو' کچھ سمجھ میں نہیں آتا' اس نے تم کو کیوں پناہ دی۔ ایسے خاندان کا آدمی سچا خیر خواہ ہو ہی نہیں سکتا۔ پھر ہم دیکھتے ہیں اس نے تمہاری پناہ دہی پر بھی سرکار انگریزی سے کسی قسم کا تعلق پیدا کرنا نہیں چاہا۔ آپ تو کیمپ میں گیا جاتا' اس نے تو کوئی عرضی بھیجی نہ کوئی اپنا آدمی روانہ کیا۔ اور تمہاری پناہ دہی کے سوا اس نے اور کوئی خیر خواہی کا کیا نہیں۔ پس ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ اس نے تم کو شاید اس غرض

سے زندہ رکھا کہ اس کو سرکار انگریزی پر زیادہ دباؤ ڈالنے کا موقع ملے۔ اور اگر دلی فتح نہ ہوتی تو وہ ضرور تم کو بے رحمی کے ساتھ مار ڈالتا۔ پس جن لوگوں کی نظر میں خیر خواہی کی یہ وقعت ہو' ان کی تختی کا کیا ٹھکانا ہے' اور رعایا کو ایسے حکام سے کیا فلاح کی امید ہو سکتی ہے۔

ابن الوقت : یہ سچ ہے کہ میں نے سرکار انگریزی کی خیر خواہی کی نظر سے آپ کو ہرگز پناہ نہیں دی۔ سوائے اس کے کہ میں نے چند سال تک سرکاری کالج میں پڑھا تھا' اور کسی طرح کا تعلق مجھ کو بلکہ ہمارے خاندان میں سے کسی کو بھی سرکار انگریزی سے نہیں رہا۔ ہم لوگ پشت ہاپشت سے شاہ دلی کے نمک خوار رہے ہیں۔ میں نے اپنے پندار میں آپ کی پناہ دہی سے فرض انسانیت ادا کیا ہے اور بس۔ میں نے اس خدمت کے عوض کسی صلے یا انعام کی درخواست نہیں کی اور نہ مجھ کو اس کا استحقاق یا دعویٰ ہے۔ میں نے اگر کچھ سلوک کیا (اگرچہ سلوک کا نام لیتے ہوئے مجھ کو شرم آتی ہے) تو آپ کی ذات سے' اور آپ نے اضعافاً" مضاعفہ مجھ کو اس کا عوض دیا۔ میرا پچاس روپیہ بھی آپ پر خرچ نہ ہوا ہو گا۔ آپ نے مجھ کو ہزار کا بندھا ہوا توڑا پکڑا دیا۔ میں نے آپ سے میگزین سے لانے اور رکھنے اور بو علی شاہ کے تکیے تک پہنچانے میں ہرگز وہ بلکہ اس کی آدھی تہائی زحمت بھی نہیں اٹھائی جو آپ نے مجھ کو اور میرے خاندان کے لوگوں کو خواجہ باقی باللہ سے لانے میں۔ آپ نے ہم لوگوں کو بیگار کی بے حرمتی سے بچا لینے میں جو احسان کیا' میں اپنی تمام خدمات کی اس ایک احسان کے مقابلے میں کچھ بھی حقیقت نہیں سمجھتا۔ غرض آپ نے اپنے ذاتی احسانات اس قدر مجھ پر لاد دیے ہیں کہ اگر میں شریف ہوں تو ساری عمر کو میری گردن آپ کے سامنے خم رہے گی۔ اور یہ زمینداری جو بے استحقاق مجھ کو سرکار نے دی ہے' یہ بھی آپ ہی کا طفیل ہے۔

نوبل صاحب : آپ اور مجھ میں بہت بڑا فرق ہے۔ آپ نے بے غرضانہ جوکھوں اٹھا کر مجھ کو پناہ دی۔ مگر خیر' حساب دوستاں در دل۔ آیئے' کچھ ضروری باتیں کریں۔ کھیرپور جو آپ کو انعام میں ملا ہے' میرا دیکھا ہوا ہے میں گوڑ گانوہ کے کلکٹر صاحب کے ساتھ کئی بار وہاں شکار کو گیا ہوں۔ گاؤں میں تھوڑا سا رمنہ اور ایک بہت بڑا تالاب ہے۔ گیہوں چاول' شکر' روئی' نیل سب طرح کی عمدہ پیداوار وہاں بکثرت ہوتی ہے۔ جب وہاں میرے جانے کا اتفاق ہوا نادان سنگھ جس کا یہ گاؤں ہے' مجھ سے ملا۔ اچھی شان سے رہتا تھا۔ اس کے رہنے کی گڑھی بجائے خود چھوٹا سا قلعہ ہے۔ نادان سنگھ کو گھوڑیوں اور بھینسوں کا بہت شوق تھا۔ ہزار ہزار روپے کی گھوڑی اس کی سواری میں رہتی تھی۔ غرض نادان سنگھ

گوڑگانوہ کے بہت بڑے خوشحال زمینداروں میں تھا۔ یوں تو اس کے پاس اور بھی گاؤں تھے مگر اس کا مقولہ تھا کہ بھگوان نے کھیرپور کی دھرتی بڑی اوپچاؤ کی ہے' اور اس نے کھیر پور کی آبادی میں اپنی پونجی اور عمر اور آسائش کو بے دریغ خرچ کیا ہے اور وہ اسی گاؤں کی آمدنی سے چھوٹا راجا بنا ہوا تھا۔ خیر' فرض کیا جائے کہ جس قدر لوگ محاصل بیان کرتے تھے' اس میں مبالغہ ہو اور لوگوں کا دستور بھی ہے۔ کہ دوسرے کی آمدنی جانچنے میں سخی بنجاتے ہیں اور خرچ کا اندازہ کرنے میں بخیل۔ مگر عموماً ضلع گوڑگانوہ کے بندوبست سے وہاں کے زمیندار اس قدر رضامند ہیں کہ جس گاؤں کی جمع سنگین ہے' اس میں بھی بعد وضع مصارف بقدر جمع سرکاری منفع ہے۔ تو اس حساب سے بھی آپ کیا اکسٹرا اسسٹنٹی کی تنخواہ کہیں نہیں گئی۔ میں نے اس گاؤں کے انتخاب میں دو باتوں کا لحاظ کیا۔ اول تو قرب دہلی' دوم اس گاؤں کے رقبے میں سے ہو کر ریل نکلنے والی ہے' اور ریل کی وجہ سے گاؤں کی حیثیت میں ضرور ترقی ہو گی۔ میں نے آپ کے لیے نوکری حاصل کرنے میں جان بوجھ کر خودکشی کی' اس لیے کہ میں نے عزت طلب ہندوستانیوں کو اکثر انگریزوں کی مدارات کی شاکی پایا اور اگر آپ نوکری کی خواہش کریں گے تو میں ہر وقت کوشش کرنے کو موجود ہوں۔

ابن الوقت : میں آپ سے بار بار عرض کر چکا ہوں کہ ہم لوگ پشت ہاپشت سے سرکاروں کے متوسل ہیں۔ ان سرکاروں کی مدارات کا یہ رنگ تھا کہ چھوٹی بڑی کل خدمتیں موروثی۔ یہ کتنے بڑے اطمینان کی بات تھی کہ سارے ملازم نہ صرف اپنی بلکہ اولاد کی معاش سے بھی بے فکر تھے۔ میں واقعات کے طور پر ان سرکاروں کے دستور اور قاعدے کچھ بیان کرتا ہوں۔ آپ ان کو درست نادرست' واجب ناواجب جو چاہیں سمجھیں۔ جرمانے' معطلی' موقوفی کا نام بھی سارے قلعے میں کبھی میں نے نہیں سنا۔ داد و دہش' انعام و اکرام کی کوئی حد نہ تھی۔ تیمور کی نسل نے کبھی روپے کو روپیہ سمجھا ہی نہیں۔ شاہی تنخواہیں اولاد اور اولاد کی اولاد پر تقسیم ہوتے ہوتے بعض کے حصے میں صرف چھ پیسے رہ گئے تھے' اور وہ بھی دو دو ڈھائی ڈھائی برس میں ملتے ورنہ اکثر تنخواہیں محض برائے نام تبرک کی طرح صرف سرکار کی داد و دہش پر نوکروں کا گزر تھا۔ مگر وہ چھ پیسے لوگوں کو ایسے عزیز تھے کہ مفتی صدر الدین خاں صدر الصدور دہلی کی نقل مشہور ہے کہ قلعے سے ڈھائی یا تین روپے ان کی تنخواہ کے بھی تھے۔ خواجہ محبوب علی خاں نے تخفیف کا قلم جاری کیا تو مفتی صاحب کا نام بھی زمرہ ملازمان شاہی سے کاٹ دیا۔ مفتی صاحب تو کیا' ایسے ایسے تین دہلی کی ان کے خدمتگاروں کو بھی پروا نہ تھی۔ مگر مفتی صاحب نے جب سنا تو دہائی دیتے ہوئے حضور

تک پہنچے اور آخر اپنی تنخواہ بحال کرا کے ٹلے۔ غرض قلعے کی سرکاروں کا برتاؤ نوکروں کے ساتھ ایسا تھا جیسے ماں باپ کا اپنے بال بچوں کے ساتھ۔ تو صاحب' میں تو ایسی سرکاروں میں رہا ہوں اور میں خود اپنے تئیں انگریزی نوکری کے قابل نہیں سمجھتا۔

فصل ۷

ایک ڈپٹی کلکٹر انگریزوں کی مدارات کا شاکی

میرے نسبتی بھائی ڈپٹی ہیں۔ برس دن ہوئے رخصت لے کر اپنی دونوں حج کو گئے۔ اب آج کل میں آنے والے ہیں۔ مزاج کے ہیں تیز۔ کسی حاکم سے انکی نہیں بنتی اور برس میں دو دو بار نہیں تو بے چارے ہر برس ضرور بدلتے رہتے ہیں۔ وہ کبھی آنکلتے ہیں اور اپنے حالات بیان کرتے ہیں۔ ان سے میں قیاس کرتا ہوں کہ واقع میں ایک دن بھی مجھ جیسے آدمی کا انگریزی دربار میں گزر ہونا مشکل ہے۔ میں نے اپنے ان بھائی صاحب سے ایک دن پوچھا تھا کہ کہئے کچھ آپ نے سرمایہ بھی جمع کیا؟ تو کہنے لگے' اجی اللہ اللہ کرو۔ کیسا سرمایہ۔ خدا جانے کیسے کتر بیونت کرتا ہوں کہ قرض نہ لینا پڑے۔ مجھ کو تو آئے دن کی بدلی ادھیڑ ڈالتی ہے ورنہ خدا کا فضل ہے۔ میری تنخواہ خرچ کو کافی ہے بلکہ کچھ پس انداز ہو رہتا ہے۔

میں : حقیقت میں آپ کو برس دن بھی کہیں جم کر رہنا نصیب نہیں ہوتا۔ آخر اس کا سبب کیا ہے؟ اور بھی تو ڈپٹی ہیں۔ قطب از جا نمی جنبد۔ برسوں سے ایک جگہ جمے بیٹھے ہیں۔

بھائی صاحب : خدا جانے صاحب لوگ کیا کمال کرتے ہیں۔ میں ہرچند کوشش کرتا ہوں کہ حکام کو راضی رکھوں گا مگر کچھ ایسی تقدیر کی گردش ہے کہ خواہی نخواہی ناچاقی ہو ہی جاتی ہے۔ اور بار بار کی بدلی نے مجھے اور بھی بدنام کر رکھا ہے۔ لوگ میرا نام سن کر پکار اٹھتے ہیں' اجی وہ لڑاکو ڈپٹی کلکٹر۔

میں : آپ نے اصلی سبب اب بھی نہ بتایا کہ حکام آپ سے کیوں ناراض رہتے ہیں۔ اگر آپ کو میں سرمایہ دار دیکھتا تو شبہ کر سکتا تھا کہ شاید آپ رشوت لیتے ہوں؟

صاحب : بات صاف صاف تو یہ ہے کہ میں رشوت نہیں لیتا اور مجھ جیسا تنک مزاج آدمی رشوت لے بھی نہیں سکتا۔

میں : میں تو سنتا تھا کہ انگریز رشوت سے بہت چڑتے ہیں اور آپ کے فرمانے سے بالکل الٹی بات معلوم ہوتی ہے۔

بھائی صاحب : سچ تو یہ ہے کہ مجھ کو کسی مرتشی انگریز سے معاملہ نہیں پڑا۔ نہ میں نے کبھی کسی انگریز کو رشوت دی' نہ کسی سے سنا کہ اس نے انگریز کو رشوت دی۔ انگریزوں کی بڑی رشوت کیا ہے؟ ڈالی یا دورے میں گئے تو رسد یا ڈاک بٹھانے کی ضرورت ہوئی تو گھوڑا گاڑی یا شکار کو نکلے تو مانگے کے ہاتھی وغیرہ' یا خاص خاص لوگوں سے شاذ و نادر تحفہ تحائف۔ سو میں ان چیزوں پر رشوت کا اطلاق نہیں کر سکتا۔ رسد میں تو اکثر نوکروں کی شرارت ہوتی ہے کہ صاحب سے بھی ایک ایک کے دو دو لیتے ہیں۔ اور بیچ میں آپ چٹ کر جاتے ہیں اور صاحب کو خبر نہیں ہونے دیتے۔ شاید کوئی میم والا صاحب ہو اور میم ہوئی کفایت شعار' جزرس اور اس کے دھیلے انڈا اور آنے والی مرغی کے دام کاٹ دیئے اور لکڑی گھاس مفت کے یہ چیز تحصیلدار' تھانہ دار دیہات سے ضرور بے قیمت لیتے ہیں اور ہم کتنے ہی دام کیوں نہ دیں' اصل مالکوں کو کوڑی ملنے والی نہیں۔

تو ہاں اس کا بھی عجب نہیں۔ مگر پھر بھی میں یہی کہوں گا کہ انگریزوں میں رشوت نہیں چلتی۔ مگر ان کے حصے کی بلکہ اس سے بہت ان کے اردلی' خدمت گار' شاگرد پیشہ' پیشی کے عملے لے مرتے ہیں اور صاحب کی آنکھ' کان' زبان' بلکہ ہم زاد جو کچھ کہو' یہی لوگ ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شخص میری طرح ان ہمزادوں یا حرام زادوں کو راضی نہیں رکھ سکتا تو کتنا ہی بڑا عہدہ دار کیوں نہ ہو' اختیارات' حکومت' تنخواہ' سب کچھ ہے مگر عزت نہیں۔ میں چاہوں تو انگریزوں کے شاگرد پیشوں کو کچھ خرچ کر کرا کے راضی کر سکتا ہوں۔ مگر مجھ کو کچھ ایسی چڑ سی آپڑی ہے کہ دوہری دوہری سواریاں رکھتا ہوں' خدا کے فضل سے نوکر بھی متعدد ہیں' مکان کا کرایہ' اخبار' کھانا' کپڑا' میرا سارا خرچ' میرے پندار میں اجلا ہے۔ سال میں سینکڑوں روپے تو ہسپتال' مدرسہ اور متفرق چندوں میں نکل جاتے ہوں گے۔ یہ تمام مصارف میں خوش دلی سے کرتا ہوں' لیکن ڈالیوں اور شاگرد پیشوں کے انعام میں مجھ سے ایک روپیہ خرچ نہیں کیا جاتا۔ اتنی مدت مجھے نوکری کرتے ہوئی اور چھوٹے بڑے صدہا انگریزوں سے میری معرفت ہے' مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں خوشی سے کبھی کسی انگریز سے ملنے گیا ہوں یا کسی انگریز سے مل کر میری طبیعت خوش ہوئی ہو۔ میں انگریزوں سے ملتا ضرور ہوں مگر بہ مجبوری' رفع ضرورت کے لیے' کہ ایسا نہ ہو مغرور سمجھا جاؤں یا عملوں اور اردلیوں کو جو ہمیشہ مجھ سے ناراض رہتے ہیں' چغلی کھانے کا موقع ملے۔

"مجھ کو بعض ایسے کریم النفس انگریزوں سے بھی واسطہ پڑا ہے۔ جنہوں نے صرف بہ تقاضائے انصاف کارگزاری دیکھ کر مجھ کو فائدے پہنچاتے ہیں اور میں ان کا دل سے ممنون ہوں۔

مگر انگریزوں کے عام برتاؤ سے میرا دل کچھ ایسا کھٹا ہو گیا ہے کہ جنھوں نے مجھ پر احسان کیے ہیں، ان کے ساتھ بھی میں نے اس سے زیادہ راہ و رسم نہیں رکھی کہ جب تک افسری ماتحتی کا تعلق رہا۔ جب وہ بدل گئے یا میں بدل گیا تو بھول کر بھی میں کسی کو عرضی نہیں بھیجتا۔ میں انگریزوں کی ملاقات کا ایسا چور ہوں کہ جب دیکھتا ہوں کہ اب بہت دن ہو گئے ہیں تو ہفتوں پہلے سے ارادہ کرتا ہوں اور آخر زبردستی ٹھیل کر دھکیل کر اپنے تئیں لے جاتا ہوں تو کوٹھی پر جا کر ہمیشہ وہی بے لطیف، وہی بے عزتی۔ جاڑا ہو، پانی برستا ہو، کڑاکے کی دھوپ ہو، تو میں چلتی ہوں، ہندوستانی ڈپٹی نہیں، ڈپٹی کا باوا کیوں نہ ہو، اور چاہے وہ اپنے مکان سے چار گھوڑے کی بگھی پر سوار ہو کر کیوں نہ آیا ہو، کلکٹر، جنٹ، اسسٹنٹ کی تو بڑی بارگاہیں ہیں، اگر یور شین ڈپٹی کلکٹر سے بھی ملنے گیا ہے (اور نہ ملے تو رہے کہاں) تو احاطے کے باہر اترنا ضرور۔ اور احاطے بھی شیطان کی آنت کہ ہم جیسے پرانے فیشن کے لوگ کوٹھی تک پہنچتے پہنچتے ہانپنے لگتے ہیں۔ اور اگر صاحب کہیں اس حال میں دیکھ پائیں تو سمجھو کہ ملاقات کو گئے۔ نوکری نذر کر آئے اسی دن رپورٹ ہوئی دھری ہے کہ یہ شخص دس قدم پیدل نہیں چل سکتا۔ گویا ڈپٹی کلکٹر کو ضرور ہے کہ کم سے کم ڈاک کے ہرکارے کی ایک چوکی تک پولی نہیں تو دلی پیشی کا ایک بستہ لے کر بھاگ سکے۔ پس اس ڈر کے مارے کسی درخت کی آڑ میں یا کوئی ایسا ہی گانٹھ کا پورا ہے اور اس نے شاگرد پیشوں کو پہلے سے چکھوتیاں کرا دی ہیں، تو باورچی خانے یا اصطبل میں پاؤ گھنٹے یا آدھ گھنٹے کھڑے کھڑے دم لیا اور جب سانس اچھی طرح پیٹ میں سمانے لگا تو رومال سے منہ ہاتھ پونچھا۔ ہاتھ سے داڑھی مونچھ کو سنوارا، ہاتھ باندھے، نیچی نظریں کیے، ڈرتے ڈرتے، دبے پاؤں کوٹھی کی طرف بڑھے، خدمتگار اور اردلی کے چپراسیوں نے تو احاطے کے باہر ہی تاڑ لیا تھا۔ کوٹھی کے پاس آتے دیکھ کر قصداً ادھر ادھر کو ٹل گئے۔ تھوڑی دیر زینے کے نیچے ٹھٹکے کہ کوئی آدمی نظر آئے تو اوپر چڑھنے کا قصد کریں۔ چلنے کی باتوں کی اور چیزوں کے رکھنے کی، اٹھانے کی آوازیں ہیں کہ چلی آتی ہیں مگر کوئی آدمی نظر نہیں آتا۔ آخر ناچار ستون کی آڑ میں جوتیاں اتار، ہمت کر کے بے بلائے اوپر پہنچے، کرسی نہیں موڑھا نہیں، فرش نہیں۔ کھڑے سوچ رہے ہیں کہ کیا کریں؟ لوٹ چلیں، پھر خیال آتا ہے کہ ایسا نہ ہو لوٹتے کو صاحب اندر آئینوں میں سے دیکھ لیں۔ شرمندگی کے ٹالنے کو اسی تھوڑی سی جگہ میں ٹہلنا شروع کیا۔

"اتنے میں باورچی خانے کی طرف سے ایک آدمی آتا ہوا نظر آیا۔ جی خوش ہوا کہ اس سے صاحب کا اور اردلی کے لوگوں کا حال معلوم ہو گا۔ وہ لپک کر ایک دوسرے ..... کے اندر گھس گیا۔ ادھر کو رخ بھی نہ کیا۔ غرض کوئی آدھے گھنٹے (اور اس انتظار میں تو ایسا معلوم ہوا کہ دو گھنٹے) اسی طرح کھڑے سوکھا کیے۔ بارے خدا خدا کر کے ایک چپراسی اندر سے چھٹی لیے ہوئے

نمودار ہوا۔ کیا کریں اپنی غرض کے لیے گدھے کو باپ بنانا پڑتا ہے۔ حیا اور عزت کو بالائے طاق رکھ، آپ منہ چھوڑ کر اس کو متوجہ کیا "کیوں جمعدار کچھ ملاقات کا بھی ڈھنگ نظر آتا ہے؟" بس اس کو ڈپٹی کلکٹر کا ادب سمجھو یا شکایت کا ڈر، مگر میں جانتا ہوں کہ ادب اور ڈر تو خاک بھی نہیں، صرف اتنی بات کا لحاظ کہ شہر کی فوجداری سپرد ہے، خدا جانے کب موقع آ پڑے۔ چار و ناچار اچٹتا ہوا سا سلام کر کے جیسے کوئی مکھی اڑاتا ہے، اس کو کہنا پڑا کہ آج ولایت کی ڈاک کا دن ہے۔ ملاقات تو شاید ہی ہو لیکن آپ بیٹھیے ابھی تو صاحب غسل خانے میں ہیں۔ یہ کہہ کر پھر وہ اندر کو جانے لگا تو آخر نہ رہا گیا اور زبان سے نکلا "کہاں بیٹھوں؟ اپنے سر پر؟" تب اس نے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی تکیہ اور ایک بازو ندارد گویا بید کی تپائی لا کر رکھ دی۔ اس کے بعد سے جب کوئی چپراسی یا خدمتگار باہر آتا یہی معلوم ہوتا کہ ابھی صاحب غسل خانے سے نہیں نکلے (الٰہی کیا غسل میت ہے؟) اب کپڑے بدل رہے ہیں۔ اب میم صاحب کے کمرے میں ہیں۔ اب چٹھی لکھ رہے ہیں۔ یہاں تک کہ آخر کو معلوم ہوا کہ کھانے کی میز پر ہیں۔ یہ سن کر جی تو بیٹھ گیا کہ بس، اب کیا خاک ملاقات ہو گی۔

"ارادہ ہوا کہ گھر کی راہ لیں۔ پھر خیال ہوا کہ کون وقتوں سے انتظار کر رہے ہیں۔ آنا تو پڑے ہی گا۔ دوسرے دن کا کیا بھروسا۔ اتنی محنت کیوں ضائع کی جائے۔ گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا اور صبر کرو۔ بڑی دیر کے بعد چپراسی یہ حکم لے کر آیا کہ سررشتہ دار کو رپورٹ خوانی کے لیے بلایا ہے۔ اب رہی سہی امید اور بھی گئی گزری ہوئی۔ تب تو اپنا سا منہ لے کر چپراسی سے یہ کہتے ہوئے اٹھے کہ خیر، میں تو اب جاتا ہوں، صاحب سے میرے آنے کی اطلاع کر دینا۔ تب خدا جانے چپراسی کے دل میں کیا آئی کہ کہنے لگا "میں دربار میں آپ کی اطلاع کر چکا ہوں۔ کچھ بولے نہیں۔ اب پھر کہے دیتا ہوں۔ خفا ہوں گے تو آپ میرے آدھ سیر آٹے کی فکر رکھنا۔"

"غرض بلائے گئے۔ صاحب کو دیکھا تو پائپ منہ میں لیے ٹہل رہے ہیں۔ اب کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی کہ کیونکر ان کو خبر کروں کہ میں آیا ہوا کھڑا ہوں۔ معلوم نہیں شاید جان بوجھ کر کھڑا کر رکھا ہو۔ بلکہ مجھ کو تو اس بات کا بھی شبہ ہے کہ میرے آنے کی بہت دیر پہلے سے ان کو خبر تھی۔ چپراسیوں نے شاید نہ بھی کہا ہو مگر چاروں طرف آئینے کے کواڑ ہیں۔ عین سامنے کے دروازے سے آیا۔ درختوں کے نیچے ٹہلتا رہا۔ بڑی دیر تک برآمدے میں جھنکارا رہا۔ کیا اتنے عرصے میں ایک بار بھی ان کی نظر نہ پڑی ہو گی؟ خیر، آخر آپ ہی سر اٹھایا۔ اور ڈپٹی صاحب حاکم بالادست ہو کر جو اتنی آؤ بھگت کرے تو اس کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ صاحب نے بندہ نوازی میں کچھ کمی نہیں کی۔ آنکھیں چار ہوتے ہی اپنے مقابل دوسری طرف کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اپنے گھر یا آپس میں ایک دوسرے کے گھر کرسیوں پر بیٹھنا کون نہیں جانتا۔ لیکن میں تو اپنے سے

زیادہ تنخواہ کے ہندوستانی صدر الصدوروں اور ڈپٹیوں کا انگریزوں کے روبرو کرسی پر بیٹھنا دیکھے ہوئے تھا۔ کہنے کو کرسی پر بیٹھا مگر حقیقت میں بید پر چوتڑ ٹیکے ہوں تو جیسی چاہو قسم لو۔ تم خدا کے بندے ہو یقین مانو' بس ڈنڈے پر الگ تھلگ جیسے اڈے پر گلدم کرسی پر بیٹھنا ہی تھا کہ کم بخت چپڑاسی نے پیچھے سے ہاتھ جوڑ کر کہا "خداوند' سرشتہ دار حاضر ہیں" صاحب میری طرف دیکھتے جاتے ہیں اور چپڑاسی سے فرما رہے ہیں "اچا' آنے بولو۔" یعنی اچھا سرشتہ دار سے کہو' چلے آئیں۔ سبحان اللہ! سات برس اسسٹنٹ رہے' نو برس کے قریب جنٹ اور سولہ برس میں صرف ایک بار ڈیڑھ برس کے لیے ضرور ولایت گئے تھے۔ بارہ برس دلی میں رہے اور بھاڑ جھونکا۔ چودہ برس میں حضرت نے اردو میں کمال حاصل کیا "اچا' آنے بولو۔

"اب میں منتظر ہوں کہ صاحب کچھ پوچھیں تو جواب دوں۔ اور سرشتہ دار مردود آگے آگے آپ' پیچھے بستہ' قلمدان لیے ہوئے چپڑاسی' آ ہی گھسا' سرشتہ دار کے روبرو مجھ سے پوچھتے ہیں تو کیا پوچھتے ہیں "دل صاحب' گرمی بوت" میں گردن جھکا کر "ہاں' خداوند۔ گرمی کے تو دن ہی ہیں میرے علاقے میں تو پولیس کی رپورٹ سے ایسا معلوم ہوا کہ لو سے بھی کئی آدمی مرے۔" صاحب کو تو یہ جواب دے رہا ہوں اور دل میں کہہ رہا ہوں کہ گرمی کا تو حال معلوم تھا' ارے ظالم! تجھ کو یہ بھی خدا کا ترس نہ آیا کہ ایک بندہ خدا' جس کو کچہری میں سرکار سے ایک ٹٹی ملی ہے۔ (ناظر اپنی بدذاتی سے تین برس کے پرانے خس کی بندھوا دیتا ہے تو وہ جانے اور اس کا ایمان) اور جس کو گھر پر بھی ٹٹی لگانے کا مقدور ہے' اور جو واقع میں گرمی بھر اپنے گھر ٹٹی میں رہتا ہے' کتنی دیر برآمدے میں پڑا بھن رہا ہے۔ لاؤ' سلام لے کر اس کو آزاد کروں۔

"میں سمجھا تھا کہ آدمیوں کا لو سے مرنا سن کر چونک پڑے گا اور ضرور پوچھے گا کہ کس تھانے سے رپورٹ آئی؟ کتنے آدمی مرے؟ لو کا ہندوستانی کیا علاج کرتے ہیں؟ اور کوئی لاش ڈاکٹر صاحب کے ملاحظہ کو بھی آئی یا نہیں؟ غرض آدمی کا دل بولنے اور بات کرنے کو چاہے تو بہتیرے حیلے ہیں۔ پر صاحب تو کچھ پی سے گئے۔ نہیں معلوم دھیان سے نہیں سنا یا سمجھے نہیں یا کالے آدمیوں کے مرنے کی پروا نہیں کی۔ سرشتہ دار ہے کہ بستہ کھول کر کاغذ پھیلا رہا ہے اور میری اور صاحب کی یہ تپاک کی ملاقات ہو رہی ہے کہ دونوں چپ جب سرشتہ دار کاغذ پھیلا چکا اور لگا صاحب کا منہ دیکھنے تو مجھ سے فرماتے ہیں "آپ کچ کچ؟" یعنی آپ کو کچھ اور کہنا ہے؟ یہ سنتے ہی میں تو یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا کہ نہیں۔ میں تو صرف سلام کے لیے حاضر ہوا تھا۔ بہت دن ہو گئے تھے۔ جی ملنے کو چاہتا تھا پھر حاضر ہوں گا۔ میری اس آخر بات میں' اور باتیں ہی ایسی کون سی بہت ہوئی تھیں کہ اس کو آخر کیوں بلکہ دوسری بات میں "جی ملنے کو چاہتا تھا" بالکل جھوٹ تھا۔ کس مسخرے کا ملنے کو جی چاہتا تھا اور کس مسخرے کا جی اب ملنے کو چاہتا ہے۔

"ملاقات کے بامزہ اور بے مزہ ہونے کا معیار وقت ہے دیر تک ملاقات رہی تو جانوں کہ خوب دل کھول کر باتیں ہوئیں۔ ہماری ملاقات کیا خاک بامزہ سمجھی جائے کہ جانا اور اٹھاؤ چولہے کی طرح بیٹھنا اور گفتگو اور رخصت' سب دو ہی منٹ میں ہو ہوا چکا۔ اپنے حساب سے کون ایسا تیسا ملاقات کے ارادے سے گیا تھا۔ خدا گواہ ہے' صرف ماتھا پھٹول وہ بھی اپنے سر کا چھدا اتارنے کے لیے صاحب مجھ سے چاہے ایک بات بھی نہ کرتے مگر سرشتہ دار اور چپڑاسیوں کو میرا الٹے پاؤں لوٹ آنا معلوم نہ ہوتا تو مجھ کو کچھ بھی شکایت نہ تھی۔ مگر میری تفضیح ان لوگوں کی نظروں میں ہوئی جو منصبی عزت میں میرے پاسنگ بھی نہ تھے۔

"باہر نکلا تو چپڑاسیوں اور خدمت گاروں کا غول کا غول برآمدے میں موجود تھا۔ مجھ کو دیکھتے ہی سب نے فراشی سلام کیا۔ الٰہی یہ کاہے کی لمبی چوڑی تعظیم ہو رہی ہے گھنٹوں برآمدے میں بیٹھا سوکھا کیا۔ ان میں سے کسی کی صورت بھی نظر نہ پڑی۔ اب یہ حشرات الارض کہاں سے نکل پڑے؟ آہا! میں اتنی جانفشانی کے بعد صاحب کو ایک سلام کر لینے کا گنہگار ہوں۔ سرکاری پیادے اس کا جرمانہ وصول کرنے کے لیے مجھ پر تعینات ہیں۔ ہر چند کہتا ہوں تنخواہ پر دیکھا جائے گا۔ عید بھی قریب ہے۔ اس میں سمجھ لینا بے حیا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ آخر میں نے ترش رو ہو کر کہا کہ اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ ہوتا تو دینے کا نام دینا کبھی کا دے چکا ہوتا۔ ایسی ہی بے اعتباری ہے تو ایک آدمی میرے ساتھ چلو۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ایک آدمی تیار سا ہوا کہ مجھ سے پہلے آگے کوچ بکس پر بیٹھ لے۔

"اتنے میں جمعدار نے پنسل اور ایک پرچہ کاغذ نکال کر میرے ہاتھ میں دیا کہ حضور ناظر کو رقعہ لکھ دیں۔ جب میں قلم اٹھاتا تھا' بے ادب ہاتھ پکڑ پکڑ لیتے تھے کہ پہلے فرما دیجیے کہ آپ کیا لکھتے ہیں؟ اسی کشاکش میں بڑھتے بڑھتے میں تو بگھی کے اندر سائیں پٹ کھولے کھڑا ہی تھا' لپک کر پائیدان پر پاؤں رکھ' گڑپ بگھی کے اندر۔ سائیں نے کھٹ سے پٹ بھیڑ دیا اور گھوڑا تھا کہ آہٹ پاتے ہی چل نکلا۔ میں نے کوچبان سے لے کر کاغذ کے پرزے میں ایک روپیہ رکھ پڑیا بنا' اردلیوں کو دکھا کر نیچے پھینک دیا۔ پھر میں نے کھڑکی سے منہ نکال کر دیکھا تو ایک چپڑاسی نے پڑیا اٹھائی بھی۔ ایک روپیہ دیکھ کر یقیناً بہت بگڑے ہوں گے' مگر میں ان کی گالیوں کی زد سے باہر نکل چکا تھا۔

"بگھی کے اندر بیٹھ کر میں نے ایسا لمبا سانس لیا' جیسے کوئی مزدور سر سے بھاری بوجھ اتار کر۔ تمام راستہ اسی ملاقات کی ادھیڑ بن میں طے کیا۔ بار بار خیال آتا تھا کہ سرشتہ دار اور چپڑاسیوں کی نظر میں میری کیا عزت رہی۔ اب یہ لوگ تمام شہر میں اس کا ڈھنڈورا پیٹیں گے۔ ایسی بے حرمتی کی روٹی کمانے پر لعنت ہے۔ پھر دل کو سمجھاتا کہ عزت ایک امر اضافی ہے۔ مجھے

اپنے اقران و امثال پر نظر کرنی چاہیئے۔ ان کے ساتھ بھی تو انیس بیس کے فرق سے ایسی مدارات کی جاتی ہے۔ تو جس مجلس میں یہ سب ننگے ہیں وہاں لنگوٹی کی شرم؟

"اسی حیص بیص میں گھر پہنچا۔ چند آدمی منتظر ملاقات بیٹھے ہوئے تھے۔ مگر نہ وہ ڈپٹی تھے اور نہ میں کلکٹر کے برآمدے میں محتاج اطلاع بیٹھے ہوں۔ آئے تو میں موجود نہ تھا۔ مزے میں گاؤ تکیوں کے سہارے پھیل پھیل کر بیٹھے۔ گھر میں سے پان آگئے۔ آدمیوں نے حقے بھر دیے۔ جوں مجھ کو دیکھا' ایک صاحب بولے۔ اللہ اکبر ڈپٹی صاحب' آج تو کلکٹر صاحب سے خوب گاڑھی چھنی۔ کون وقتوں سے میں آپ کا منتظر بیٹھا ہوا ہوں۔

دوسرے صاحب : آج بندے کا ارادہ بھی کلکٹر صاحب کے سلام کو جانے کا تھا۔ معلوم ہوا کہ ڈپٹی صاحب تشریف لے گئے ہیں۔ میں نے کہا۔ بس آج کسی کی دال نہیں گلنی

تیسرے صاحب : مدت سے جدید تحصیلداری قائم ہونے کی خبر تھی' یہاں تک کہ بورڈ سے منظوری بھی آچکی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج اسی انتظام کے صلاح مشورے میں دیر لگی۔

"لوگ آپس میں یہ باتیں کر رہے ہیں اور میں کپڑے اتارتا جاتا ہوں اور اندر ہی اندر دل میں خوش ہوں کہ بھلا سے خدا کرے لوگ ایسی ہی غلط فہمی میں مبتلا رہیں۔"

فصل ۸

نوبل صاحب ابن الوقت کو رفارمر بناتے ہیں

نوبل صاحب نے اس قصے کو بہت ہی غور اور توجہ سے سنا۔ بیچ بیچ میں کبھی مسکرانے لگتے تھے اور کبھی استکراہ ان کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا۔ مگر انہوں نے ابن الوقت کی بات کو نہیں کاٹا۔ جب ابن الوقت نے بات پوری کی تو فرمانے لگے کہ ہمیشہ میری یہ رائے رہی ہے کہ انگریزی عملداری میں یہی بڑا خطرناک نقص ہے کہ حاکم و محکوم میں ارتباط نہیں۔ یہ اجنبیت اگر سبب غدر نہیں تو غدر کی ترقی کا موجب تو ضرور ہوئی۔ اور جب تک ہندوستان کے لوگ انگریزوں کے ساتھ مانوس نہیں ہوں گے سلطنت ایک منٹ کے لیے بھی قابل اطمینان نہیں۔ مگر اس میں دونوں کا قصور ہے۔

انگریز بہ غرور حکومت ہندوستانیوں کی طرف ملتفت نہیں ہوتے اور ہندوستانی بوجہ نادانی انگریزوں سے پرہیز اور گریز کرتے ہیں۔ ایسے دو آدمیوں میں کیوں کر اتحاد ہو سکتا ہے جن کی نہ زبان ایک' نہ مذہب ایک' نہ رسم و عادات ایک' نہ مزاج ایک پھر اس اجنبیت کے نقصان بھی دونوں کا قصور ہے۔ انگریز بہ غرور حکومت ہندوستانیوں کی طرف ملتفت نہیں ہوتے اور ہندوستانی بوجہ نادانی انگریزوں سے پرہیز اور گریز کرتے ہیں۔ ایسے دو آدمیوں میں کیوں کر اتحاد ہو سکتا ہے جن کی نہ زبان ایک' نہ مذہب ایک' نہ رسم و عادات ایک' نہ مزاج ایک۔

پھر اس اجنبیت کے نقصان بھی دونوں کی طرف عائد ہیں۔ ہندوستانیوں کا تو صریح نقصان یہ ہے کہ خدا نے انگریزوں کو سلطنت کے ذریعے سے عزت اور دولت کا منبع بنا دیا ہے اور اب اس غدر نے بخوبی ثابت کر دیا کہ جس سلطنت کو انگریزوں نے بزور شمشیر حاصل کیا ہے' اس کو بزور شمشیر قائم رکھنے پر قادر بھی ہیں۔ ہندوستانی جس قدر انگریزوں سے بھاگتے ہیں' اسی قدر عزت سے محروم اور دولت سے بے نصیب ہیں۔ اس کے مقابلے میں انگریز کب نقصان سے محفوظ ہیں۔ ضعف سلطنت سے بڑھ کر اور کیا نقصان ہو گا۔ آج اگر رعایا دوست دار ہوتی تو تلنگوں کو اول تو بغاوت کرنے کی جرات ہی نہ ہوتی' اور خیر نادانی کر بھی بیٹھے تھے تو بغاوت اس قدر جلد کبھی نہ پھیلتی کو گویا چٹکی بجانے میں اس سرے سے اس سرے تک آگ سی لگ گئی۔ تلنگوں نے سلگائی اور رعایا نے بھڑکائی۔

ابن الوقت : پھر کسی طرح یہ آپس کا نفاق رفع بھی ہو گا؟

نوبل صاحب : دونوں ایک دوسرے کی طرف جھکیں۔ سو میں سمجھتا ہوں کہ خدا کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں۔ شاید یہ غدر اسی غرض سے ہوا کہ دونوں اپنی اپنی غلطیوں پر متنبہ ہوں۔ ابھی تو غدر کی یادداشت تازہ ہے۔ چند سال بعد غدر اور اس کی خوفناک حکایتیں' سب قصے اور افسانے معلوم ہونے لگیں گے۔ ایک بار اچھی طرح پھٹ کر اس زخم کو انگور بندھے گا اور جس طرح آپ آج کے بعد کل اور کل کے بعد پرسوں کی طرف دیکھ رہے ہیں' مجھ کو وہ دن نظر آ رہا ہے اور خدا نے چاہا تو میں اس کو اپنی زندگی میں ان آنکھوں سے دیکھوں گا۔ ہندوؤں کا کفر تو شاید مدتوں میں جا کر ٹوٹے گا کیونکہ ان بے چاروں کے پاس رسم و رواج کے سوائے مذہب نام کی کوئی چیز نہیں۔ مگر ہاں مسلمانوں کو اپنے مذہب پر بڑا ناز ہے اور جہاں تک مجھ کو معلوم ہے ان کے مذہبی اصول اکثر اچھے بلکہ بہت اچھے ہیں۔ ان میں اور انگریزوں میں ارتباط اور اختلاط کا ہو جانا چنداں دشوار نہیں معلوم ہوتا۔

ابن الوقت : بے شک' ہونا تو یونہی چاہیئے مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہاں کے مسلمان اس خصوص

میں ہندوؤں سے بہت زیادہ شدید ہیں۔

نوبل صاحب : شدید ہیں یا دونوں کی اجنبیت کی وجہ سے ارتباط و اختلاط کا موقع نہیں ملا اور اس بارے میں کسی نے کوشش نہیں کی؟

ابن الوقت : دونوں ہی باتیں ہیں۔

نوبل صاحب : آپ اپنی فرمایئے میرے جتنے دوست ہیں سب ہی تو آپ کی ملاقات کے مشتاق ہیں۔ بلکہ بعض تو متقاضی ہیں۔ اس بات کو تو میرا جی نہیں چاہتا کہ انگریزی سوسائٹی میں اس طرح پر آپ کی تقریب کروں کہ گویا آپ اہل غرض ہیں یا امیدوار خدمت۔ اس وقت ساری انگریزی سوسائٹی خیر خواہی کی وجہ سے آپ کو نظر وقعت سے دیکھتی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اسی وقعت کے ساتھ آپ کو انٹروڈیوس کراؤں۔ یعنی صاحب لوگوں کے ساتھ آپ کی دوستانہ اور برابری کی ملاقات۔ مگر آپ سے اس بات کے کہنے کی معافی مانگتا ہوں کہ اس کے لیے آپ کو اپنی حالت کچھ بدلنی پڑے گی اور اگر آپ کو اس میں تعذر ہو تو شاید نہیں ملنا بہتر ہو گا۔ اگرچہ اس صورت میں مجھ کو بڑی مشکل پیش آئے گی اور میں اپنے دوستوں کو شاید کوئی معقول وجہ نہیں بتا سکوں گا۔

ابن الوقت : میں آپ سے ذرا تفصیل کے ساتھ سننا چاہتا ہوں کہ آپ کس طرح کی تبدیلی کی مجھ سے توقع رکھتے ہیں؟

نوبل صاحب : کم سے کم اس قدر کہ انگریزی مذاق کے مطابق ایک مکان درست ہو۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ہم لوگ ہمیشہ بیرون شہر کھلے ہوئے مکانوں میں رہنا پسند کرتے ہیں اور ہم لوگوں کا طریقہ نشست و برخاست اور طرز ماند و بود بھی مختلف ہے۔ میرے دوست آپ سے ملنے کے لیے کہتے رہتے ہیں۔ کئی بار دل میں آیا کہ آپ کے پاس لے چلوں۔ پھر سوچا کہ آپ ان لوگوں سے ملنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ناحق شرمندگی ہو گی۔ اول تو آپ کا مکان ایسی گلیوں میں واقع ہے۔ کہ وہاں تک بگھی جا نہیں سکتی۔ پھر گلیاں تنگ اور ناصاف کہ کوئی صاحب لوگ جانا پسند نہیں کر سکتا۔ آپ کا مکان اگرچہ چنداں برا نہیں، مگر صاحب لوگ کی آسائش کے لیے میز کرسی وغیرہ کوئی سامان نہیں۔ ان وجوہات کی وجہ سے میں نے کسی دوست کو آپ کے پاس لے جانے کی جرات نہیں کی۔ تو اس بارے میں جیسا کہ آپ کو منظور ہو، بیان کیجیے کہ آپ کو انگریزوں کے ساتھ جس طرح کہ میں چاہتا ہوں ملنا پسند ہے یا نہیں؟

ابن الوقت : یہ معاملہ بڑا ٹیڑھا ہے۔ ہمارے مسلمان بھائیوں کا تعصب (یہ ایک دوسری بات ہے کہ بجا ہے کہ بے جا) اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ آپ ہرگز اس کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے۔ جن لوگوں نے غدر میں آپ کا ہمارے یہاں رہنا سنا ہے، مجھ کو ان کے تیور بھی بدلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ آج میں نے آپ کے ساتھ کھانا کھانے کو کھا لیا اور میں نے اپنے اذعان میں ہرگز خلاف مذہب اسلام نہیں کیا کیونکہ آپ لوگ اہل کتاب ہیں اور ہمارے قرآن مجید میں اہل کتاب کے ساتھ کھانے کی صریح اجازت موجود ہے، مگر شہر کے مسلمان اگر سن پائیں گے (اور کیوں نہ سنیں گے) کم بخت اس طرح کے جاہل ہیں کہ شہر میں رہنا دشوار کر دیں گے۔ اور میں ٹھہرا کنبے اور جتھے کا آدمی۔ عجب نہیں سب مل کر مجھ کو برادری سے خارج کر دیں۔

نوبل صاحب : مگر آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ بے اصل تعصب جس کو عقل کی تائید اور مذہب کی سند نہیں، محض شورش جاہلانہ و بے ثبات ہے۔ بے شک شروع میں چند روز تک شاید لوگ آپ کو حقارت سے دیکھیں گے اور اس سے آپ کو ضرور کسی قدر ایذا بھی ہو گی مگر تابہ کے؟ اگر آپ استقلال کے ساتھ کے ساتھ ایک طرز کو اختیار کریں گے اور کچھ شک نہیں کہ لوگوں پر اس نمونے کا مفید ہونا دیر سویر ثابت ہو گا پر ہو گا، مجھ کو پورا یقین ہے کہ رفتہ رفتہ لوگ اپنی غلطی پر متنبہ ہوتے جائیں گے اور نفرت کے عوض خود اس طریقے کی تقلید کرنے لگیں گے۔ پس جس بات سے آپ ڈرتے ہیں، ایذا ہے عارضی اور تکلیف ہے چند روزہ۔ آپ نے سرکاری خیر خواہی کے لیے کیسی جان جوکھوں اٹھائی۔ تو کیا اپنی قوم، اپنے بھائی بندوں کے مفاد کے لیے تھوڑی سی خیالی ایذا کا تحمل کرنا کچھ بڑی بات ہے؟

یہ بات اچھی طرح سمجھ رکھنے کی ہے کہ پہلے ہی سے مسلمان ہندوستان کے باشندوں میں سب سے زیادہ خستہ حال تھے۔ اس غدر نے رہا سہا اور تباہ کر دیا۔ معدودے چند (شاید سارے ہندوستان میں پورے ایک درجن بھی نہیں) برائے نام کچھ رئیس تھے۔ میں سمجھتا ہوں اس غدر کی آفت سے شاذ و نادر کوئی بچا ہو۔ کارتوس کے کاٹنے پر بگڑے ہندو، اور اس اعتبار سے بغاوت کی ابتدا ہندوؤں نے کی، مگر آخرکار تھپ گئی مسلمانوں پر۔ بغاوت کا سارا نچوڑ مسلمانوں پر ہے اور ان احمقوں نے ہم وطنی کے لحاظ سے ہندوؤں کا ساتھ دے کر اپنا ایسا نقصان کر لیا ہے کہ سالہائے دراز تک ان کے پنپنے کی کچھ توقع نہیں۔ اب ان کے فلاح کی صرف یہی ایک تدبیر ہے کہ تلافی مافات کریں اور جس قدر انگریزوں سے الگ تھلگ رہے ہیں۔ اسی قدر بلکہ اس سے بھی زیادہ، ان سے ٹوٹ کر ملیں۔ اور ہمارے نزدیک کوئی وجہ نہیں کہ کوئی آدمی کیوں ایسی تدبیریں عمل میں نہ لائے جو اس کے حق میں مفید ہیں۔ مسلمان کتنے ہی گئے گزرے کیوں نہ ہوں، اب بھی ان کے سروں میں تعزز کے خیالات بھرے ہوئے ہیں۔ جہاں تک میں نے آزمایا

ہے، مسلمانوں کے مزاج کار فرمائی کے لیے نہایت مناسب ہیں۔ میں نے ان کو کبھی ذلیل خوشامد کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ یہ لوگ سختی اور مصیبت کو بڑے استقلال کے ساتھ برداشت کرتے ہیں۔ ان کے ذہنوں میں جودت، ان کی عقلوں کی رسائی دوسری قوموں سے بہت زیادہ ہے۔ راست بازی، راست گوئی، دیانت، حمیت اور غیرت میں یہ لوگ اپنے ہم وطنوں سے ضرور سر برآوردہ ہیں۔ میں نے مختلف اضلاع میں بہ تعلق خدمت سرکاری ہندوستانیوں کی اکثر قوموں کا تجربہ کیا ہے۔ خدمت گار، چپڑاسی، عملہ کچہری، حکام، پیشہ ور، تاجر کوئی حیثیت کیوں نہ ہو، میں نے ہمیشہ مسلمانوں کو بہت بہتر پایا ہے، بہ مقابلہ دوسری قوم کے۔

میں ان کے مذہب کو (آپ کے معاف کیجئے گا) سپاہیانہ مذہب خیال کرتا ہوں۔ میرے نزدیک ہر مسلمان مذہباً" سپاہی ہے۔ ایک مسلمان تحصیلدار صاحب میرے دوست ہیں۔ نہیں معلوم غدر ہیں ان کو کیا پیش آئی، مگر آدمی تیز مزاج، شدید الحکومت تھے۔ ضرور مبتلائے بغاوت ہوئے ہوں گے۔ ایک روز ہندوؤں مسلمانوں کے تذکرے میں کہنے لگے کہ میں بدون دیکھے ہندو فقیر کی آواز پہچان لیتا ہوں۔ ہندو فقیر جب بھیک مانگے گا گڑگڑا اور مری ہوئی آواز سے بھگوان بھلا کرے، برخلاف مسلمان فقیر کے کہ فقیری میں بھی منطنے کو نہیں جانے دیتا۔ یا علی کہہ کر جو ایک ڈانٹ بتاتا ہے تو سارا محلہ چونک پڑتا ہے۔ میں ایسا سمجھتا ہوں کہ مدتوں اس قوم میں سلطنت رہی ہے یہ تمام صفات اسی کے آثار ہیں۔ لیکن سو برس بھی مسلمانوں پر اس کے اور گزرے تو ضرور ان کی نسلیں ایسی بگڑ جائیں گی کہ پھر ان کی اصلاح شاید ناممکن ہو۔ یہ قوم ایک ریفارمر کی پہلے سے محتاج تھی اور اب تو ریفارمر کے ہونے نہ ہونے پر انہی کے ہونے نہ ہونے کا فیصلہ ہے۔ میں کہتا ہوں وہ ریفارمر تمہیں کیوں نہ ہو۔ شخصی عزتیں فروع ہیں، قومی عزت کی۔ کوئی شخص دولت یا ہنر یا کسی اور وجہ سے کیسا ہی قابل عزت کیوں نہ ہو، جب تک وہ ایک ذلیل قوم کا آدمی ہے، اس کو پوری پوری عزت کی توقع ہرگز نہیں کرنی چاہیے۔ ہزاروں مثالیں موجود ہیں کہ ذلیل قوموں کے لوگ دولت پیدا کر کے بڑے مالدار ہو جاتے ہیں، مگر ناصیہ امارت سے قومی ذلت کے داغ کو نہیں چھڑا سکتے اور سوسائٹی کبھی ان کی ایسی وقعت نہیں کرتی جس کی وہ امیری کی وجہ سے مستحق ہیں۔

میں نے اب نہیں غدر سے بہت پہلے، اسی ہندوستان کے بڑے شہر میں اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ایک بازار میں کوئی چار گھڑی دن رہے لوگوں کی آمدورفت اس کثرت سے تھی کہ اس سرے سے اس سرے تک گویا ایک میلا لگا ہوا ہے۔ جو لوگ سواریوں پر تھے وہ، ان کے نوکر، سبھی تو چلاتے تھے ہٹو، بڑھو، بچو۔ مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ اتنے میں سامنے سے ایک گورا نظر پڑا کہ اکیلا پائپ پیتا ہوا سیدھا چلا آرہا ہے اور لوگ ہیں کہ آپ سے آپ کائی

کی طرح اس کے آگے سے پھٹے چلے جاتے ہیں۔ میں نے اس وقت خیال کیا تھا کہ یہ قومی تعزز کا اثر ہے۔ شخصی تعزز پر اگر قومی تعزز مستزاد ہو تو نور علیٰ نور، ورنہ بدون قومی تعزز کے شخصی تعزز اصلی عزت نہیں بلکہ عزت کا ملمع ہے۔ دنیا میں نیکی کے بہت سے کام ہیں۔ لیکن قوم کی رفارم سے بڑھ کر کوئی نیکی نہیں ہے۔ یہ وہ نیکی ہے جس کا فائدہ عام اور اثر نسلاً" بعد نسل باقی رہ سکتا ہے۔ جن کو آپ پیغمبر کہتے ہیں، وہ بھی میرے نزدیک اپنے وقت کے رفامر تھے۔

ابن الوقت : مسلمانوں میں رفارمر کی ضرورت کو میں تسلیم کرتا ہوں۔ مگر یہ کام میرے بوتے کا نہیں۔ ایک آدمی بگڑا ہوا ہوتا ہے۔ تو کوئی اس کی اصلاح کا بیڑا اٹھا نہیں سکتا۔ نہ کہ پوری قوم۔ یہ کام مقدور بشر نہیں قوم کے دلوں کا پھیر دینا میرے نزدیک تصرف الٰہی ہے۔

نوبل صاحب : تصرف الٰہی ہی سہی، اور سعی کا لفظ میں نے غلط کہا، مجھ کو کہنا چاہیئے تھا تصرف الٰہی ہے، لیکن دنیا میں تصرفات الٰہی ہمیشہ اسباب ظاہری کے ذریعے سے ہوتے ہیں۔ آئندہ کا حال کسی کو معلوم نہیں۔ کون کہہ سکتا ہے شاید مسلمانوں کی تباہی حد کو پہنچ چکی ہو اور اب خدا کو ان کی حالت کا بہتر کرنا منظور ہو۔ اور عجب نہیں اس بہتری کا یہی سامان ہو یا یہی نہ ہو۔ من جملہ بہت سے اسباب کے یہ بھی ہو کہ ہم آپ اس قسم کا تذکرہ کر رہے ہیں اور خدا آپ کے دل میں ڈال دے اور آپ استقلال کے ساتھ اس کام کو شروع کر دیں اور آپ کی سعی مشکور ہو۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے واقعات اکثر محض خفیف اور ضعیف اسباب سے پیدا ہوتے ہیں۔ جیسے بڑے عظیم الشان درخت چھوٹے بیجوں سے۔ دنیا کے حالات پر نظر کرنے سے ایسی امید کی جا سکتی ہے کہ شاید تمام روئے زمین پر ترقی کا دورہ شروع ہو گیا ہے۔ لوگ جو اس زمانے میں پیدا ہوتے ہیں، متقدمین سے زیادہ ذہین اور روشن دماغ اور آزاد مزاج اور وسیع خیال ہوتے ہیں۔ پس اس زمانے میں رفارم کوئی ایسا بڑا مشکل کام نہیں کیونکہ طبیعتیں خود رفارم کی طرف متوجہ ہیں۔ جیسے بادبانی جہاز کا باد شرطہ کے رخ پر لے چلنا یا ایک بوجھ کا اوپر سے نیچے کو اتارنا۔ پھر اگلے زمانوں میں رفارمر کو اپنے خیالات کا دوسروں تک پہنچانا سخت مشکل ہوتا تھا۔ وہ انہی لوگوں کو اپنے خیالات سے آگاہ کر سکتا تھا جن کے ساتھ اس کو بالمشافہ گفتگو کرنے کا موقع ملتا اور اس زمانے میں چھاپے، ڈاک اور ریل نے ایسی سہولتیں بہم پہنچا دی ہیں کہ ایک بات کو مشتہر کرنا چاہو تو ساری دنیا میں ڈھنڈورا پیٹنے کے لیے شاید ایک مہینا کافی ہے۔ پس ایک رفارمر کا صلہ یعنی شہرت، اور شہرت بھی نیک نامی کے ساتھ، اور خوشنودی سرکار انگریزی اور جو منفعتیں اس پر مترتب ہوں اور ثواب عاقبت، سب کچھ مفت ہے، اگر کسی کو خواہش ہو۔ میں آپ کے لیے اس سے بہتر کوئی مشغلہ نہیں پاتا۔

ابن الوقت : ہمارے ملک میں تو یہ بالکل ایک انوکھا اور کٹھن کام ہے۔ آپ کے فرمانے سے
جی تو میرا بھی چاہتا ہے مگر بوجوہ چند در چند ہمت قصور کرتی ہے۔

ابن الوقت : بننے صاحب۔ ملک کی آب و ہوا رفارم رفارم پکار رہی ہے۔ اور مجھے تو ایسا دکھائی
دیتا ہے کہ عنقریب پردۂ غیب سے رفارمر خروج کرنے والے ہیں۔ میرا جی چاہتا تھا کہ یہ
نیک نامی آپ کے حصے میں آتی اور فرض کیجیے کہ آپ کو اس کوشش میں ناکامی ہو، جو کبھی
ہونے والی نہیں اور میں اس کا ذمہ لے سکتا ہوں تاہم اس کا نقصان ہی کیا ہے یہ کیا کم ہے
کہ اول آپ فلاں قوم کے محرک ہوئے۔

ابن الوقت : تنہائی سے طبیعت الجھتی ہے۔ ساری قوم کنفس واحدۃ میری مخالف ہوگی۔ میں
اکیلا چنا بھاڑ کا کیا کر لوں گا؟ ایسے بڑے کام کے انجام کو چاہیں اعوان و انصار، اور میں اپنے
متعارفین میں کسی کو اس خیال کا نہیں پاتا۔

نوبل صاحب : میں ہندوستانی نہیں مگر جتنا ہندوستانیوں سے ملتا ہوں شاید کوئی انگریز نہ ملتا ہو
گا۔ جہاں تک مجھ کو معلوم ہے، جتنے انگریزی خواں ہیں سب انہی خیالات کے ہیں اور ان
کے دوست، آشنا، رشتے دار ملا کر کم سے کم اتنے ہی اور سمجھ لیجیے۔ پھر جو لوگ انگریزوں
کے ساتھ میل جول رکھتے ہیں، کسی وجہ سے کیوں نہ ہو اکثر ان میں سے بھی۔ اور پھر اس
قسم کے لوگوں کا شمار روز افزوں۔ ہے خلاصہ یہ ہے کہ یہ خیالات اگر نہیں ہیں تو مسلمانوں
میں اور مسلمانوں میں بھی ممالک مغربی پنجاب کے مسلمانوں میں۔ سو اودھ عیاش اور
پنجاب سپاہی۔ دونوں کو ہندوستانی عملداریوں نے مدتوں جاہل رکھ کر ہیولی صفت بنا دیا
ہے، جو ہر صورت کو آسانی سے قبول کر سکتا ہے، میسر الانقیاد اگر ہیں تو ممالک شمال مغربی
کے مسلمان جن کو انگریزی عملداری کے امن و اطمینان نے اس بات کا موقع دیا ہے کہ
اپنے علوم کی یادگار جو فی زمانہ بالکل بے سود ہے، تازہ رکھیں

آپ کو یورپ جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ لیکن اگر آپ گئے ہوتے تو آپ پر ثابت ہو جاتا کہ
اہل یورپ کی عظمت سلطنت نہیں ہے بلکہ ان کی تمام عظمت ان علوم میں ہے جو جدید ایجاد
ہوئے ہیں اور ہوتے جاتے ہیں۔ اور جن علوم کے ذریعے سے انہوں نے ریل اور تار برقی اور
سٹیمر اور ہزار ہا قسم کی بکار آمد کلیں بنا ڈالی ہیں۔ اور بناتے چلے جاتے ہیں، وہ ہر طرح کی کاریگری
میں دوسرے ملکوں کے لوگوں پر سبقت لے جا کر روئے زمین کی دولت اپنے ملک میں گھسیٹ
لے گئے اور گھسیٹے لیے چلے جا رہے ہیں۔ جس جس طرح کے ہنر اور کمال اہل یورپ میں ہیں،
ان کے ہوتے ممکن نہ تھا کہ ان کی سلطنت نہ ہو۔ سلطنت ان کے کمالات کی قیمت نہیں ہے
بلکہ روکھن میں ہے، اور ان کا حق لازمی ہے۔ سلطنت سے انگریزوں کو کچھ مفاد ہے تو یہی کہ ان

کے ملک کے چند آدمی آ کر نوکری کرتے اور تنخواہ پاتے ہیں۔

اس سے بھی ہمیں انکار نہیں کہ ہندوستانیوں کے مقابلے میں انگریزوں کو بڑی تنخواہیں ملتی
ہیں۔ اور کیوں نہ ملیں؟ ان کے سفر دور دراز کو دیکھو۔ اختلاف آب و ہوا کی وجہ سے ان کی جان
جوکھم پر نظر کرو۔ ان کی اجلی، شاندار، کثیر المصارف طرز زندگی اور ساتھ ہی ان کی دیانتداری کا
بھی خیال کرو تو معلوم ہو کہ انگریزوں کی تنخواہیں بہ واجب بڑی ہیں یا بہ ناواجب۔ یہ بھی
انگریزوں ہی کے جگر ہیں کہ ان تنخواہوں پر کیسے امتحان دیتے ہیں اور اپنا دیس اور اپنے عزیز یگانے
چھوڑ کر کالے کوسوں نوکری کو نکل آتے ہیں۔ کیوں کہ یہ بات ان کے اصول زندگی میں داخل
ہے کہ ہر انسان کو اپنی قوت بازو سے کمائی کرنی چاہیے۔ جب کہ خاندان شاہی میں کوئی متنفس اس
کلیے سے مستثنیٰ نہیں اور خود ملکہ معظمہ کے بیٹے پوتے قاعدے کے مطابق چھوٹے چھوٹے
عہدوں سے نوکری شروع کرتے ہیں تو دوسرے کس گنتی میں ہیں۔

یہی تنخواہیں اور یہی امتحان اور یہی پردیس اور یہی اختلاف آب و ہوا اور یہی تمام حالات
ہندوستانیوں کے لیے ہوں تو شاید گھر سے نکلنے کا نام نہ لیں۔ ولایت تو ولایت آج کسی کو بردا جانے
کا حکم دیا جاتا ہے تو سارے گھر میں رونا پیٹنا مچ جاتا ہے۔ اپنی ہمت کا تو یہ حال ہے اور انگریزوں
کی تنخواہوں پر حسد بہرکیف، یہی سہی کہ جتنے انگریز ہندوستان میں نوکر ہیں سب کے سب یہاں
کی تنخواہیں پا کر آسودہ حال ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان معدودے چند کے تمول سے اس ملک کو کیا
فائدہ پہنچ سکتا ہے جس میں ان میں سے دو چند سہ چند ہر سال جزائر دور دست میں جا کر سکونت
اختیار کر لیتے ہیں۔ صرف اس وجہ سے کہ علم طب اور صفائی میں جو بہت ترقی ہوئی ہے تو عمروں
کا اوسط بڑھ گیا ہے۔ بیماری اور موت میں بہت کمی ہو گئی ہے۔ توالد و تناسل کثرت سے ہوتا
ہے۔ ملک کی وسعت اس قدر کثیر التعداد باشندوں کو کافی نہیں۔ اہل یورپ کے تمول کا اندازہ
کسی قدر آپ اس بات سے کر سکیں گے کہ وہاں دو روپیہ روز کی آمدنی کا آدمی سوسائٹی میں اس
سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا جیسے ڈیڑھ دو آنے روز کا مزدور۔ اور دس ہزار روپیہ سالانہ کہ یہ
سویلین کی پنشن کی مقدار غایت ہے، سواری اور اپنے ذاتی ملازم رکھنے کے لیے مشکل سے کفایت
کر سکتا ہے۔ تو موٹی سے موٹی سمجھ کا آدمی بھی یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ سلطنت کی وجہ سے
یورپ میں یہ کچھ دولت پھٹ پڑی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ خدا کو اہل یورپ کی ترقی، ان کے
فلاح منظور تھی کہ ملک کے ملک کو واقعات نفس الامری اور موجودات خارجی میں غور کرنے کی
دھن لگا دی۔ اس غور سے سینکڑوں ہزاروں نئے نئے اصول دریافت ہوئے جن پر عمل کرنے
سے انسان کی قدرت اس قدر بڑھ گئی کہ کچھ انتہا نہیں۔

غرض یورپ کی دولت مندی کے اصل لٹکے سٹیم اور الکٹری سٹی وغیرہ یعنی علوم جدیدہ ہیں۔

باوے کا نام تو آپ نے سنا ہو گا۔ اس شخص کے یہاں مرہم اور گولیوں کا کارخانہ ہے' مگر اس کی آمدنی کو آپ اس پر قیاس کر سکتے ہیں کہ چار لاکھ روپیہ سالانہ تو صرف اجرت اشتہار کا خرچ ہے اور پھر بڑے بڑے کارخانوں میں اس کا شمار نہیں۔ ولایت جا کر دیکھیے تو معلوم ہو کہ تجارت کے مقابلے میں سلطنت ایک محض بے حقیقت چیز ہے۔ اگر تاجروں کے تموّل کا حال آپ سے بیان کروں تو آپ مبالغہ سمجھیں۔ پھر ہماری ولایت کوئی سیر حاصل ملک نہیں۔ پیداوار معدنیات کے اعتبار سے یورپ کسی طرح ہندوستان سے لگا نہیں کھا سکتا۔ مگر چونکہ ہندوستان کے لوگ نئے علوم سے ناواقف ہیں' خدا داد سرمائے سے فائدہ اٹھانے کا سلیقہ نہیں رکھتے۔

ہندوستانیوں کی بد قسمتی اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گی کہ روئی ہندوستان سے ولایت جاتی ہے اور وہ لوگ اپنی ہنرمندی سے اس روئی کے انواع و اقسام کے کپڑے بنا کر پھر ہندوستانیوں کے ہاتھ چند در چند نفع پر فروخت کرتے ہیں۔ پس ہندوستانیوں کے پنپنے کی اگر کوئی تدبیر ہے تو یہی ہے کہ ان میں علوم جدیدہ کو پھیلایا جائے اور ان کو اس بات کی طرف متوجہ کیا جائے کہ اپنی تمام قوت عقلی واقعات میں صرف کریں۔ یہاں کے لوگ بالطبع ذہین ہوتے ہیں۔ اِدھر صنعتیں نکالنی شروع کریں گے اور اس کا انہیں چسکا پڑ جائے تو بس ساری شکایتیں رفع ہیں اور از بس کہ تمام علوم جدیدہ جن پر ملکی ترقی کا انحصار ہے' انگریزی میں ہیں' سب سے پہلے زبان انگریزی کو رواج دینا ہو گا۔ بعض لوگوں نے یہ بھی خیال کیا ہے کہ علوم جدیدہ کی کتابیں اردو میں ترجمہ کرائی جائیں۔ مگر میں اس رائے سے متفق نہیں ہوں۔ اول تو زبان اردو میں اتنی وسعت نہیں کہ علوم جدیدہ کی تمام مصطلحات کا اردو ترجمہ ہو سکے۔ ناچار اکثر مصطلحات انگریزی کو اختیار کرنا پڑے گا اور ان کے تلفظ میں ضرور غلطیاں ہوں گی۔ میں نے اس طرح کی بعض طبی اور بعض کیمیا اور بوٹنی وغیرہ کی کتابیں دیکھیں۔ کوئی سطر انگریزی الفاظ سے خالی نہیں۔ یہ ترجمے اردو انگریزی مخلوط' آدھا تیتر آدھا بٹیر' مجھ کو سخت بدمزہ معلوم ہوتے ہیں۔ اور پھر کسی زبان کے ایک لفظ کی دوسری زبان میں کیسی ہی ہندی کی چندی کیوں نہ کرو' اس کا ٹھیک مفہوم دوسری زبان میں ادا کرنا مشکل ہے۔

اس کے علاوہ انگریزی زبان کے رواج دینے سے ایک غرض تو علوم جدیدہ کا پھیلانا ہے اور دوسری غرض اور بھی ہے۔ یعنی عموماً انگریزی خیالات کا پھیلانا۔ اکیلے علوم جدیدہ سے کام چلنے والا نہیں' جب تک خیالات میں آزادی' ارادے میں استقلال' حوصلے میں وسعت' ہمت میں علو' دل میں فیاضی اور ہمدردی' بات میں سچائی' معاملات میں راست بازی یعنی انسان پورا پورا جنٹلمین نہ ہو اور وہ بدوں انگریزی جاننے کے ہو نہیں سکتا۔ انگریزی دان آدمی کو اخبار اور کتابوں کے ذریعے سے انگریزی خیالات پر آگہی بہم پہنچانے کی بڑی آسانی ہو سکتی ہے۔ رفارم' جس کی ضرورت ہندوستان کی ترقی کے لیے ضروری ہے' اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ہندوستانیوں کو

انگریز بنایا جائے۔ خوراک میں' پوشاک میں' زبان میں عادات' میں' طرز تمدن میں' خیالات میں' ہر چیز میں۔ اور وقت اس کے لیے چپکے چپکے کوشش کر رہا ہے۔ مگر اس کی کوشش دھیمی ہے اور اس پر نتیجے کا مترتب ہونا دیر طلب۔ لوگوں کے دلوں میں خود بخود اس طرح کے خیالات بہ تقضائے وقت پیدا ہو چلے ہیں۔ کوئی رفارمر کھڑا ہو کر اس سلگتی ہوئی آگ کو جلدی سے بھڑکا دے۔

ابن الوقت : آپ کے سمجھانے سے دل میں تو آتا ہے کہ یہ کام کرنا چاہیے۔ اس کی مزدوری اور مفید ہونے میں تو کچھ شک نہیں' مگر یہ تو فرمایئے کہ اس کی ابتدا کس طرح پر کی جائے؟

نوبل صاحب : رفارمر بننے کی بسم اللہ یہ ہے کہ رفارمر جو کیفیت لوگوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے' پہلے خود اس سے متکیف ہو لے اور اپنا نمونہ دکھا کر لوگوں کو تقلید کی ترغیب دے۔

ابن الوقت : اگر عرض کرنا سوء ادب نہ ہو تو میں کہتا ہوں کہ آپ ہی رفارمر کیوں نہیں بنتے؟ یورپ ٹھہرا آپ کا وطن۔ وہاں کے حالات سے تو آپ بالتفصیل واقف ہیں۔ رہا ہندوستان' آپ نے ذاتی شوق سے ہر طرف کی سیر و سیاحت کی ہے۔ ہر قوم و ملت کے ہندوستانی کے ساتھ آپ کو اختلاط بھی بہت رہا ہے' اور بلا تخصیص قوم و مذہب و ملک عام انسانی ہمدردی بھی آپ کے دل میں کچھ کم نہیں۔ تو اس صورت میں منصب رفارمر کے لیے آپ سے بہتر کون ہو گا؟

نوبل صاحب : میں آپ کے ان خیالات کا شکر گزار ہوں۔ مگر میرا یورپین ہونا منصب رفارمر کے منافی ہے۔ ہم انگریزوں میں شاذ و نادر کوئی ایسا ہو گا' جس کے دل میں اس طرح کے خیالات نہ گزرتے ہوں۔ ہم ہی میں ایک گروہ مشنری لوگوں کا ایسا ہو گا' جس کے دل میں اس طرح کے خیالات نہ گزرتے ہوں۔ ہم ہی میں ایک گروہ مشنری لوگوں کا ہے جن کی تمام ہمت اسی کام میں مصروف ہے مگر چونکہ ان کے اغراض میں مذہب کا شمول ہے' ان کی تمام کوششیں رائیگاں ہیں۔ شروع شروع میں تو پادریوں نے اکثر ہنود کے چند نوجوان لڑکوں اور بعض مسلمانوں کو عیسائیت کی طرف راغب کر لیا تھا اور کبھی کبھی سننے میں آتا تھا کہ فلاں ہندو یا فلاں مسلمان نے اصطباغ لیا' مگر مذہب کا عجیب معاملہ ہے۔ دل کی تسلی کا نام مذہب ہے۔ پھر تو لوگ چوکنے ہو گئے۔ پادریوں کی بڑی چوٹ ہنود پر تھی۔ سو انہوں نے بھی کاٹ چھانٹ کر اپنے مذہب کو ایسا کر لیا کہ کوئی ہندو انگریزی لکھ پڑھ کر بگڑنا چاہتا ہے تو کوئی نہ کوئی سماج کو اپنے میں ملا لیتا۔ غرض مدتوں سے غیر مذہب کے لوگ عیسائی ہوتے ہواتے نہیں' الاشاذ۔ اب پادریوں کی بڑی کامیابی اس پر آ ٹھہری ہے کہ قحط کی

دعائیں مانگا کرتے ہیں کال پڑے اور صاحب ضلع سے لاوارث بچوں کو پرورش کے لیے لیں۔ ان کو اپنے طور پر لکھائیں' پڑھائیں' تربیت کریں۔ یہ بچے بڑے ہو کر عیسائی ہوں۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ پس فرض کیجیے کہ مشنری نہیں' کوئی انگریز ریفارمر بننا چاہے تو مذہبی بدگمانی کا کیا انسداد؟ انگریز کی صورت دیکھتے سے اکھڑ جائیں گے۔ سنتے بھی ہوں تو نہ سنیں۔ مانتے بھی ہوں تو نہ مانیں۔ ریفارمر چاہیے اپنی قوم کا کہ وہ تردید کے عوض تائید کا اور اعتراض کرنے کی جگہ سنر کا کام دے۔

نوبل صاحب : بہت خوب! خدا نے چاہا تو میں اس کام کو شروع کروں گا۔

ہر چہ بادا بادما کشتی در آب انداختیم

لیکن آپ سے توقع کرتا ہوں کہ آپ میرے مددگار رہیں گے۔

نوبل صاحب : نہ صرف میں بلکہ تمام انگلش کمیونٹی اور سرکار' اور خود آپ ہی کی قوم کے بہت سے اشخاص معقول پسند جن کے سروں میں یہ خیالات بھرے ہوئے ہیں اور ضعف ہمت کی وجہ سے سہارا ڈھونڈ رہے ہیں کہ کوئی مقدمہ الجیش بنے تو پیچھے ہو لیں۔ اور سنیے ' مجھ کو کامل یقین ہے کہ بہت جلد آپ کو اس ارادے میں کامیابی ہوگی۔ لوگوں کے مادے تیار ہیں۔ تھوڑے ہی دنوں میں آپ کو دکھا دوں گا کہ ایک بڑا گروہ آپ کی رائے کی تحسین کرتا ہوگا۔ گویا وہ آپ کی امت ہیں اور آپ ان کے امام۔

اللہ اکبر! نوبل صاحب اور ابن الوقت کون وقتوں کے ان باتوں میں لگے ہیں۔ گیارہ بجے کے بیٹھے بیٹھے چار بجا دیے' اور باتوں کا سلسلہ ہے کہ منقطع نہیں ہونے پاتا۔ چپڑاسی' خدمتگار ہیں کہ آئینوں میں جھانک جھانک کر چلے جاتے ہیں۔ جمعدار چپکے چپکے ایک چپڑاسی سے کہہ رہا ہے "تم ہی تو کہتے تھے نا کہ ان کو ملاقات کے کمرے میں کیوں بٹھایا۔ اب دیکھا؟ اس لیے بٹھایا تھا۔ صاحب کی نظروں میں آج جو یہ ہیں' دوسرا نہیں ہونے کا۔" اتنے میں نوبل صاحب اور ابن الوقت دونوں باتیں کرتے ہوئے باہر نکلے۔ ابن الوقت کہتے ہوئے چلے آرہے تھے کہ بیچ میں آپ کی ضرورت ہو تو بلوا لیجیے گا' ورنہ جس دن مجھ کو حاضر ہونا ہو گا' ایک دن پہلے آپ کو اطلاع دوں گا۔ اور ہاں' جاں نثار کو اتنی اجازت دیجیے کہ یہاں کے کام سے فارغ ہو کر آج رات میرے یہاں رہیں۔ علی الصباح تو آپ سے پہلے پھر اپنی نوکری پر آموجود ہوں گے۔

بری بات بھی کتنی جلدی شہرت پکڑتی ہے۔ گیارہ بجے کے قریب ابن الوقت نے نوبل صاحب کے ساتھ کھانا کھایا اور ظہر کی اول جماعت کے بعد محلے کی مسجد کے نمازی آپس میں تذکرے کر رہے تھے کہ کیوں جی' میاں ابن الوقت کی نسبت بازار میں کیا چرچا ہو رہا ہے کہ

کرسٹان وہ گئے؟۔

ایک نمازی : کرسٹان ہونے کی تو نہیں سنی البتہ اتنا سنا ہے کہ وہی انگریز جوان کے یہاں غدر میں چھپا تھا' اس کو شہر میں کوئی بڑا بھاری کام ملا ہے۔ یہ اس کے پاس آتے جاتے رہتے ہیں۔ آج اس کے ساتھ کھانا کھالیا۔

دوسرا : تم بھی عجیب آدمی ہو۔ چھی چھی انگریز کے ساتھ کھانا کھایا تو ہو کرسٹان' اس کی ہفتاد پشت کرسٹان۔ کیا کرسٹان کے سر میں سینگ لگے ہوتے ہیں؟

تیسرا : اس انگریز کے ساتھ انہوں نے کوئی نیا کھانا نہیں کھایا۔ سارے غدر وہ انگریز ان کے گھر رہا اور برابر ان کے ساتھ کھاتا رہا۔

دوسرا : دیکھو تو ظالم نے کیا غضب کیا ہے۔ خیر' انگریز کو چھپایا تھا تو وہ جانے اور اس کا ایمان جانے۔ مگر انگریز کے ساتھ کھا کر اس کو ہم لوگوں کے ساتھ کھانا پینا نہیں رکھنا چاہیے تھا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ شاید روزے اور نماز سب کی قضا لازم آئے گی۔ دیکھو' مولوی صاحب (امام مسجد) سلام پھیریں تو مسئلہ پوچھا جائے۔

پہلا : شہر پر کچھ آفتیں ٹوٹ رہی ہیں کہ کام والے کام سے گئے' نوکر نوکری سے' گھر والے گھر سے بے گھر ہوئے اور ہنوز کسی کی جان کا بھروسا نہیں۔ تحقیقات بغاوت درپیش ہے۔ وہی کہاوت ہے کہ تو ڈر اور نہ کر تو خدا کے غضب سے ڈر۔ تم کو اگر اپنی جان دوبھر ہے تو مرنے کے سو حیلے ہزار بہانے۔ ہم غریبوں کو زبردستی اپنی آنچ میں کیوں دھکیلتے ہو؟ دیوار ہم گوش دارد۔ یہی بات اگر کوئی میاں ابن الوقت سے جا لگائے تو دم کے دم میں ساری شیخی کرکری ہو جائے۔ بابا' ہمارا تو اس وقت سے جماعت کی نماز کو سلام ہے۔ کس کی شامت آئی ہے کہ بیٹھے بٹھائے کھنچا کھنچا پھرے۔

اتنے میں مولوی صاحب دعا سے فارغ ہو کر منہ پر ہاتھ پھیر رہے تھے کہ اس کٹے نمازی نے مسئلہ پوچھا ہی پوچھا۔

مولوی صاحب نے جواب دیا کہ انگریز کے ساتھ کھانے سے آدمی عیسائی نہیں ہو جاتا مگر وعید **من تشبہ بقوم فھو منھم** اس پر متوجہ ہوتا ہے۔ مسلمان کو اس سے محترز رہنا چاہیے۔ لیکن **الخبر یحتمل الصدق و الکذب** افواہ کا کیا اعتبار۔ اور لو فرضنا سچ بھی ہو تو ایک شخص کا فعل اس کے اسلاف کی طرف کیوں متعدی ہونے لگا؟

غرض اس وقت تو نمازی متفرق ہو گئے مگر انتوں کے کان پڑی ہوئی بات' سارے محلے میں ایک غل سا پڑ گیا۔ ابن الوقت لوٹ کر گھر آیا تو ہر طرف سے انگلیاں اٹھتی تھیں اور جن لوگوں کا معمول صاحب سلامت میں تقدیم کرنے کا تھا' وہ بھی آنکھیں چراتے اور منہ چھپاتے تھے۔ جونہی

ابن الوقت نے مردانے میں پاؤں رکھا' زنان خانے سے عورتوں نے ڈیوڑھی میں آکر جھکنا شروع کیا۔ ابن الوقت لوگوں کی یہ مدارات دیکھ کر جی ہی جی میں کھٹکا تو سہی مگر نہ کسی نے منہ پھوڑ کر اس سے کچھ پوچھا اور نہ اس نے اپنی طرف سے ابتدا کا کرنا مناسب سمجھا۔ ابھی درباری لباس کے بوجھ سے سبکدوش نہ ہوا تھا کہ اندر سے پھوپھی صاحبہ کی طلب آئی۔ ابن الوقت کے ساتھ چار آنکھیں ہوتے ہی وہ نیک بخت بی بی آپ ہی بولیں۔

"میں تو کچھ نہیں کہتی' بس جھوٹوں سے خدا ہی سمجھے۔ سدا سے لوگوں کو اس گھر کی جلن رہی۔ پر انشاء اللہ لوگ جلیں گے اور ہم پھلیں گے۔ تیرے پہرے سنتے سنتے کان بہرے ہو گئے کہ دشمنوں کو انگریزوں نے اپنے مذہب میں ملا لیا۔ برا چاہنے والوں کو اپنا جھوٹا کھانا کھلا دیا۔ اور میں ایک ایک سے کہتی کہ نوج! میرا بھتیجا اس قابل ہی نہیں۔ وہ تو انگریزوں کو عقل سکھانے والا ہے۔ لاکھ جتن کریں گے' ایک نہ ایک بات ایسی اتار کر کے گا کہ سب کے سب اس کا منہ دیکھنے لگیں گے۔ قربان جاؤں اس غفور الرحیم کے کہ تم بھلے چنگے لوٹ کر آئے بیٹا۔ اگر سچ مچ انگیرزوں کی نیت بدلی ہوئی دیکھو' جیسا کہ لوگ پکارا کر رہے ہیں' تو پھوپھی صدقے گئی' ایسی خیر خواہی پر لعنت بھیجو۔ قلعہ غارت ہوا تو خیر' خدا کی مرضی جس نے جان دی ہے' وہ کہیں نہ کہیں سے' ان بزرگوں کے طفیل میں جن کے ہم لیوا ہیں' نان بھی دے گا۔

ابن الوقت : یہ کیا بے ہودہ بات آپ سے کسی نے آکر کہہ دی ہے! حقیقت تو اس قدر ہے کہ میں نوبل صاحب کے پاس گیا تھا۔ کھانے کا وقت تھا۔ انہوں نے اصرار کر کے مجھ کو بھی میز پر بٹھا لیا۔

پھوپھی : پھر تم نے کھایا تو نہیں؟

ابن الوقت : کھایا تو کیا ہوا؟ وہی نوبل صاحب ہیں نا جو کامل تین مہینے ہمارے ہاں مہمان رہے تھے۔

پھوپھی : خیر وہ الگ بات تھی۔

ابن الوقت : آپ تو قرآن کا ترجمہ پڑھی ہوئی ہیں۔ سورہ مائدہ کے پہلے رکوع میں دیکھ لیجئے وطعام والذین اوتو الکتاب حل لکم وطعامکم حل لھم کے کیا معنی ہیں؟ پھر ایک انگریز کے ساتھ کھانا کھا لینے کے علاوہ آپ بے دینی کی کوئی اور بات بھی مجھ میں دیکھتی ہیں؟ میں بدستور نماز پڑھتا ہوں۔ آپ کو یاد ہو گا' عین رمضان کا مہینا تھا کہ نوبل صاحب ہمارے یہاں آئے۔ میں دن بھر روزہ رکھتا تھا۔ خدا کے فضل سے ایک روزہ قضا نہیں کیا' اور رات کے وقت صاحب کے ساتھ کھانا بھی کھاتا۔ صبح کی تلاوت جو میرا معمول تھا۔ میں نے اس کو ناغہ نہیں ہونے دیا۔ میں نہیں جانتا کہ مسلمان میں اور کیا

سرخاب کا پر لگا ہوتا ہے۔

مذہب کیا چیز ہے؟ بندے کا معاملہ خدا کے ساتھ۔ پس کسی شخص کو دوسرے کے مذہبی معاملے میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔ اور فرض کیجئے کہ نعوذ باللہ من ذالک اگر میں کرسٹان ہونا چاہوں تو کون مجھ کو روک سکتا ہے؟ میں جانتا ہوں کہ دنیا کے اعتبار سے کنگلوں کے زمرے سے نکل کر امیروں کے گروہ میں جا ملوں گا' محکوموں سے حاکموں میں' احمقوں سے عقلمندوں میں' بے عزتوں سے عزت والوں میں' مگر وہ بھی کچھ مذہب ہے جس پر دنیا کا لالچ یا خوف اثر کر سکے؟

فصل ۹

ابن الوقت تبدیل وضع کے بارے میں جاں نثار صلاح اور استمداد کرتے ہیں

ابن الوقت یہ کہہ کر پھر مردانے میں چلا آیا۔ نماز مغرب کے بعد تھوڑی دیر بعد جاں نثار آپہنچا بیٹھنے کے ساتھ ہی پہلی بات اس نے یہی کی کہ آج صاحب ہوا خوری کو بھی نہیں گئے۔ آپ کے چلے آنے کے بعد سے جو چٹھیاں لکھنے بیٹھے تو میرے شیر نے چراغ ہی جلا دیے۔ پھر مجھ کو بلا کر آپ کے پاس حاضر ہونے کا حکم دیا کہ ابھی چلے جاؤ۔ صاحب آپ سے اس قدر خوش ہیں کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ جو ملاقاتی آتا ہے' آپ کا تذکرہ اس سے ضرور کرتے ہیں۔ اور میز پر تو صاحب لوگوں میں برابر آپ کا ذکر رہتا ہے۔ وہ تو آپ شہر میں رہتے ہیں اور آپ کا مکان بھی بیچ در بیچ گلیوں میں ہے' اور گلیاں بھی صاف ستھری نہیں۔ اگر کہیں آپ انہی لوگوں کے میل میں شہر کے باہر کسی بنگلے میں رہتے ہوتے تو دیکھتے کہ سارے سارے دن اور آدھی آدھی رات تک انگریز آپ کا پیچھا نہ چھوڑتے۔

صاحب' ہیں تو یہ لوگ کہنے کو کافر مگر مروت اور خدا ترسی اور اخلاص غرض نیکی کی کل باتیں جیسی میں نے ان لوگوں میں دیکھیں' ہم لوگوں میں تو کہیں پاسنگ بھی نہیں۔ یہ نہ ملنے تک کا ہوا ہیں اور مرے پیچھے ایسے ملتے ہیں کہ کیا کوئی اپنا ملے گا۔ میم صاحب کی چٹھی ولایت سے آتی ہے تو سائیسوں تک کو سلام لکھتی ہیں' اور نام بنام ایک ایک کے بیوی بچوں کی خیر و عافیت پوچھتی رہتی ہیں۔ سامنے والی نیلی کوٹھی میں فوج کے ایک صاحب رہتے ہیں۔ ان کی میم اور بابا

لوگ بھی ہیں۔ کل نہیں پرسوں‘ کوئی رات کے دو بجے‘ ایک آیا کے سینے میں درد اٹھا۔ اسی وقت صاحب آپ جا کر ڈاکٹر کو لائے اور دونوں میاں بیوی صبح کے پانچ بجے تک اس آیا کے پاس سے ٹلے نہیں۔ بھلا آج کوئی ہندوستانی سردار ہے جو ادنیٰ نوکروں کے ساتھ اس قسم کا برتاؤ کرے؟ معاملے کے ایسے سچے کہ کسی نوکر کو کیسے ہی ناراض ہو کر موقوف کریں‘ کیا مجال کہ کسی کی تنخواہ کی کوڑی لگا رکھیں ہم لوگوں کی طرح نہیں کہ پہلے چوری کی تہمت کا منصوبہ سوچ لیں‘ تب نوکر کے نکالنے کا نام لیں۔ اور تنخواہ تو تنخواہ اگر نوکر تن بدن کے کپڑے سلامت لے کر عزت و آبرو سے رخصت ہو جائے تو بڑا خوش نصیب۔ ہم لوگوں میں سے جو کوئی تھوڑے دنوں کے لیے بھی انگریز کو چھو گیا ہے۔ پھر کسی ہندوستانی کی نوکری اس سے ہو ہی نہیں سکتی۔ اگر مذہب کا فرق نہ ہوتا تو چاہیے آپ اس کو نمک کی تاثیر سمجھیں‘ انگریز میرے نزدیک پوجنے کے قابل تھے۔ بال بچوں کی طرح نوکروں کی پرداخت کرتے ہیں۔

ابن الوقت : سب انگریز ایک مزاج کے نہ ہوں گے۔ اتفاق سے تم کو جن لوگوں کے ساتھ معاملہ پڑا‘ اچھے ہی ملے۔

جاں نثار : ہاتھ کی پانچ انگلیاں تو کیوں کر برابر ہو سکتی ہیں۔ اچھے برے سبھی جگہ ہیں۔ مگر اتنا فرق ضرور ہے کہ انگریزوں میں اکثر اچھے اور ہم میں اکثر برے ہیں۔

ابن الوقت : میں سمجھتا ہوں شاید فوجی انگریز زیادہ اکھڑ اور بد مزاج ہوتے ہوں گے۔

جاں نثار : ہرگز نہیں‘ ایسے بھلے مانس‘ دل کے سخی اور بے تکلف کہ ملکی انگریز کی دوستی نہ فوجی کی صاحب سلامت۔ ہاں دوغلے جن میں ہندوستانیوں کا تخم ملا ہے‘ ان کی جس قدر برائی کی جائے تھوڑی ہے۔ خدا گنجے کو ناخن نہ دے۔ ان کا بس چلے تو ہندوستانیوں کو کچا کھا جائیں۔ ان دونوں کا تو کچھ ٹھکانا ہی نہیں‘ غدر کے دنوں میں ہندوستانیوں کے ہاتھوں سے طرح طرح کی ایذائیں ان لوگوں کو پہنچی ہیں۔ اس سے دلوں میں غصہ بھرا ہوا ہے۔ اور کوئی ہوتا تو ملک میں گدھوں کا ہل پھروا کر بھی بس نہ کرتا۔ پھر بھی میں یہی کہوں گا کہ انہی لوگوں کے حوصلے ہیں کہ رعیب نے اتنا ظلم کیا اور ان کا رعیب کا اجاڑنا منظور نہیں۔ صاحب تو ایسے فرماتے تھے کہ یہ پکڑ دھکڑ بھی تھوڑے ہی دن کی ہے۔ میں انگریزی خوب تو نہیں سمجھتا مگر اتنا معلوم ہے کہ اب رحم کی نظر زیادہ ہے۔ یہ غدر بھی ایک کسوٹی تھی۔ جس طرح کھوٹے کھرے ہندوستانی الگ پہچانے گئے‘ اسی طرح برے بھلے انگریز۔ جو لوگ شریف خاندانوں کے ہیں‘ وہ درگزر ہی کی رائے دیتے ہیں۔

ایک روز ہمارے صاحب تذکرہ کرتے تھے کہ ولایت میں پہلے یہ قاعدہ تھا کہ سرکار شریف خاندانوں کے لڑکوں کو اپنے خرچ سے پڑھا لکھا کر ہندوستان کی نوکریوں کے واسطے تیار کرتی تھی۔

ان دنوں جو انگریز آتے تھے سب خاندانی ہوتے تھے۔ اب چند سال سے سرکار نے اس دستور کو موقوف کر کے امتحان کا طریقہ جاری کیا ہے۔ لوگ اپنے طور پر ہندوستان کی نوکری کے لیے لیاقت بہم پہنچا کر امتحان دیتے ہیں۔ جو امتحان پاس کرتا ہے اس کو نوکری مل جاتی ہے۔ شریف اور رذیل کا امتیاز نہیں ہوتا۔ اکثر عوام بلکہ دھوبی‘ حجام‘ موچی‘ بھٹیارے وغیرہ پیشہ وروں کے لڑکے جن کی ولایت میں کچھ بھی عزت نہیں‘ محنت کر کے امتحان پاس کر لیتے ہیں۔ اگرچہ ان کے تعلیم یافتہ ہونے میں کچھ شک نہیں تاہم۔

اصل بد از بدی خطا نہ کند

ان کی ذات سے رعایا کو کمتر فیض پہنچا ہے۔ مگر میں تو یہی کہوں گا کہ ان کے برے بھی اچھوں سے اچھے اور بہت اچھے ہیں۔ آپ ان سے ملیں تو میرے کہے کی آپ کو تصدیق ہو۔

ابن الوقت : نوبل صاحب بھی مجھ کو یہی صلاح دیتے ہیں۔ مگر وہ چاہتے ہیں کہ مجھ کو برابر کے دعوے سے انگریزوں میں ملائیں۔

جاں نثار : ملنے کا مزہ بھی برابری ہی میں ہے۔ یہ کیا کہ امیدوارانہ گئے‘ اردلیوں کے دھکے کھائے‘ سارے دن کی محنت میں دور سلام ہوا۔ اور خدانا خواستہ آپ کو اس طرح ملنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ چلیے‘ ادھر ہی ایک کوٹھی کرائے پر لے کر رہیے تو بڑا مزہ ہے۔

ابن الوقت : کیا تم سمجھتے ہو کہ انگریز مجھ کو اپنی سوسائٹی میں لینا پسند کریں گے؟

جاں نثار : آپ کو‘ آپ کے غلاموں کو۔ آپ کی صورت شکل اور شان میں ماشاء اللہ کسی طرح کی کمی نہیں۔ خدا نے آپ کو امیر کیا ہے۔ کچھ یہ بات نہیں کہ آپ اونچی حیثیت سے رہ نہیں سکتے۔ انگریزی میں کسی قدر کمی ہے۔ سو آپ باتیں سمجھ تو سب لیتے ہیں۔ بولنے میں جھجک ہے۔ دو چار مہینے میں ملنے جلنے سے خود بخود نکل جائے گی اور سب سے بڑھ کر تو صاحب کا زبردست پایہ ہے۔ خدا ان کو سلامت رکھے۔ آج اسٹیشن میں ان کی وہ بن رہی ہے کہ واہ واہ۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ کوئی دن جاتا ہے کہ آپ کا کچھ کام بھی ضرور ہونے والا ہے۔

ابن الوقت : مگر ہندوستانی اس کی نسبت کیا خیال کریں گے؟

جاں نثار : ہندوستانی تو یہی سمجھیں گے کہ آپ کرسٹان ہو گئے۔ اور میں تو جانتا ہوں اب بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ کوئی بیسیوں آدمیوں نے تو آج ہی مجھ سے پوچھا ہے۔

ابن الوقت : تم انگریزوں کے ساتھ کھانا کھانے کو کیسا خیال کرتے ہو؟

جاں نثار : صاحب کے منہ سے سنا ہے کہ روم‘ مصر‘ ایران اور عرب کہیں کے مسلمان

پرہیز نہیں کرتے۔ بے تکلف انگریزوں کے ساتھ کھاتے پیتے ہیں۔ مگر ہمارے ملک کے لوگ تو بڑی چھوت مانتے ہیں۔

ابن الوقت : خیر جیسی پیش آئے گی، دیکھی جائے گی۔ میں نے تو نوبل صاحب سے وعدہ کر لیا ہے مگر انگریزوں کی شان کے مطابق سامان کے بہم پہنچنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

جاں نثار : جناب، ذرا بھی مشکل نہیں۔ اس کا تو آپ خیال بھی نہ کیجیے۔ کلکتے میں جنرل سپلائز کمپنی ہے۔ اس کا ایجنٹ یہاں آیا ہوا ہے۔ ایک بنگلہ تجویز کر کے اس کو دکھا دیا جائے گا کہ اس کو سجادو۔ ہمارے صاحب نے بھی تو یہی کیا ہے۔ اس کوٹھی کی تو چھت تک بھی اکھاڑ کر لے گئے تھے۔ صاحب تجبر جاتے ہوئے اس ایجنٹ سے کہتے گئے۔ اس نے ایک ہی مہینے میں مکان بھی بنوا دیا اور جتنا سازو سامان آپ دیکھتے ہیں، سب مہیا کر دیا۔ ہماری کوٹھی کے مقابل سڑک پار ۴۳ نمبر کا بنگلہ خالی ہے۔ صاحب سے بھی قریب ہے۔ موقع بھی اچھا ہے۔ شاید چالیس پینتالیس ایسا ہی کچھ کرایہ ہے۔ اگر حکم ہو تو اس کو روک دیا جائے۔ جس مہاجن کا بنگلہ ہے، اس نے حال ہی میں اس کو درست کرایا ہے۔ غدر میں ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ جنرل سپلائز کا ایجنٹ دو ہفتے کے قریب میں جیسا فرمائیے گا سجادے گا۔ ان لوگوں میں ٹھہرانے چکانے کا دستور نہیں۔ بل بنا کر بھیج دے گا۔ آپ اس رقم کو چکا دینا۔ نہ ہڑ ہڑ، نہ کھڑ کھڑ، بلکہ فرمایئے تو میں صاحب سے عرض کر دوں۔ وہ تو خوشی خوشی اس کا انتظام کر دیں گے۔ مگر کہیں گے وہ بھی ایجنٹ ہی سے۔

ابن الوقت : نہیں، صاحب کو کیوں تکلیف دو۔ تم ہی جس طرح مناسب سمجھو، کر دھرو۔ اور ہاں بھائی، کپڑوں کے بارے میں کیا کہتے ہو؟

جاں نثار : ہر چیز میل سے بھلی معلوم ہوتی ہے۔ پیروں میں انگریزی ہاف بوٹ، ٹانگوں میں ڈھیلے پانچوں کا پاجامہ، آدھی پنڈلیاں کھلی ہوئی یا کوٹ پتلون کے ساتھ سر پر عمامہ یا اسی طرح کی دوسری بے جوڑ چیزیں مجھ کو بری معلوم ہوتی ہیں۔ نقل کیجیے تو پوری پوری کیجیے ورنہ دونوں جگہ ہنسی ہو گی۔ آگے آپ کو اختیار ہے۔

ابن الوقت : خیر تو ایک سال کے کپڑے کے لیے بھی ایجنٹ سے فرمائش کر دینا۔ اور چونکہ تم انگریزی سوسائٹی کے دستور سے بخوبی واقف ہو، اس بات کا خیال رکھنا کہ انگریزوں کی نظر میں سبکی نہ ہو۔

جاں نثار : یہ مجال خدا نے چاہا تو آپ کی کوٹھی سرتاپا ایسی آراستہ ہو کہ لیڈیں دیکھنے کو آئیں۔ اور ساری چھاؤنی میں آپ کے کھانوں کا غل ہو۔ اصل چیز ہے روپیہ اور سلیقہ سو روپے کی خدا کے فضل سے آپ کے پاس کمی نہیں، اور سلیقہ، خاک چاٹ کر کہتا ہوں،

برسوں میم صاحب کی جھڑکیاں نہیں، گھڑکیاں سہیں۔ صاحب نے لاٹ گورنر کو کھانا دیا۔ شہزادہ بلجیم کی دعوت کی۔ خیر اپنے منہ سے اپنی بڑائی کرنی مناسب نہیں۔ دیکھ لیجیے گا۔ اس بات کو آپ دریافت کر لیجیے کہ چھاؤنی میں جب کوئی بڑا کھانا دیا جاتا ہے، آپ کے خانہ زاد ہی کو بلاتے ہیں۔ فرنیچر کا سجانا بڑا مشکل کام ہے۔ اچھے اچھے چوک جاتے ہیں۔ مگر میم صاحب نے میرے پیچھے بڑی جان ماری ہے۔ تب کہیں برسوں میں جا کر یہ بات حاصل ہوئی ہے۔ خیر اب سب باتوں کو تو میں دیکھ بھال لوں گا، مگر آپ کو خود بھی انگریزی قاعدہ سیکھنا چاہیے کیوں کہ آپ ہوں گے صاحب خانہ۔ آؤ بھگت، استقبال، رخصت، مزاج پرسی، تواضع وغیرہ وغیرہ بہت سے کام آپ کو اپنی ذات سے کرنے پڑیں گے۔ ایک ذرا سی بے تمیزی سے سارا کیا دھرا اکارت ہو جاتا ہے۔ لیڈیوں کے سامنے خاص کر بڑی احتیاط کرنی پڑتی ہے۔ میم صاحب کی دی ہوئی ایٹیکیٹ کی میرے پاس ایک کتاب ہے، میں آپ کے پاس بھیج دوں گا۔ ایک دفعہ وہ کتاب نظر سے گزر جائے گی تو سارے کام سدھ ہو جائیں گے اور آخر ان لوگوں کو ایک دوسرے سے ملتے ہوئے بھی تو آپ دیکھیں گے۔ شروع شروع میں ذرا اس کا خیال رکھیے گا کہ یہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ کیوں کر برتاؤ کرتے ہیں۔

نوبل صاحب بے چارے کا کچھ دوش نہیں۔ انہوں نے اپنے انگریزی خیالات کے مطابق نیک نیتی سے اپنے دوست ابن الوقت اور اس کی قوم کے حق میں مفید سمجھ کر اس کو ایک صلاح دی۔ ابن الوقت دودھ پیتا بچہ نہ تھا کہ نوبل صاحب کے جھانسے میں آگیا۔ اس کو اپنی قابلیت قوم کی حالت، اطراف و جوانب، نتائج و عواقب پر نظر کر کے کام کرنا تھا۔ بات یہ ہے کہ خود اس کی طبیعت شروع سے اس طرف راغب تھی۔ نوبل صاحب کا کہنا اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ہو گیا۔ اپنی قوم اور قوم کی ہر چیز کی حقارت اور انگریز اور ان کی ہر بات کی وقعت پہلے سے اس کے ذہن میں مرتکز تھی۔ مگر وہ ایک شخصی رائے تھی۔ نہ کسی کے حق میں مفید، نہ کسی کے لیے کارآمد۔ اتنی بات ابن الوقت کو نوبل صاحب نے سمجھائی کہ اس خیال سے کسی طرح پر اس کو اور اس کی قوم کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ ابن الوقت کی ظاہری حالت کے بدلنے میں ابھی دیر ہے۔ مگر جاں نثار کے چلے جانے کے بعد بھی وہ اسی خیال میں مستغرق رہا۔ تھوڑی دیر کے لیے اس کو معلوم ہوا کہ گویا نوبل صاحب کی سی کوٹھی ہے اور خانہ باغ میں کرسی بچھائے، صاحب لوگوں کی شکل بنائے بیٹھا ہوا شب ماہ کے مزے لے رہا ہے۔ پھر آپ ہی آپ چونک پڑا کہ اس حالت میں کسی نے مجھ کو دیکھا تو نہیں۔ تب وہ اس خیال کو دفع کرتا ہے کہ اوکھلی میں سر دیا تو دھمکیوں کا کیا ڈر۔ رہ رہ کر اس کو خیال آتا ہے کہ اپنے عزیز رشتے دار، دوست، آشنا، جان پہچان، اہل محلہ، اہل شہر، اہل

ملک میرے ساتھ کیا معاملہ کریں گے۔ یہ تصور ہے کہ رفارم پر طبیعت کو مطلقاً" نہیں جمنے دیتا کہ اس کا کچھ منصوبہ سوچے۔ نوبل صاحب کو زبان دیئے پیچھے اس ارادے سے دست کش ہونا کسی طرح ممکن نہیں۔ کبھی جی ہی جی میں اپنے تئیں ملامت کرتا ہے۔ کہ جلدی ناحق کی۔ پھر کہتا ہے' اس سے بہتر اور کون سا موقع ہوگا کہ نوبل صاحب بیچ پر ہیں۔ غرض ابن الوقت ہر وقت سوچ میں رہتا تھا اور زیادہ دیر تک سوچتے سوچتے گھبرا اٹھتا تھا اور چاہتا تھا کہ جو کچھ ہوتا ہے' پرسوں کا ہوتا کل اور کل کا ہوتا آج ہو جائے۔

صرف ایک آدمی نوبل صاحب تھے جن کے ساتھ وہ اس بارے میں صلاح مشورہ یا گفتگو یا بحث جو کچھ کہو کر سکتا تھا۔ وہ بھی ان دنوں کسی سرکاری ضرورت سے باہر چلے گئے تھے۔ پس ابن الوقت کا ایک مہینہ کیوں خاصے دن اوپر ایک مہینا بہت ہی پریشانی میں گزرا۔ مگر اس کو انگریزی ایٹیکیٹ سیکھنے کی خوب مہلت ملی۔ اسی اثناء میں جاں نثار نے ضروری ادب و آداب اس کو سب تعلیم کرا دیے۔ گویا انگریزی سوسائٹی کی یونیورسٹی کا انٹرنس پاس کرا دیا۔ بارے مئی ۱۸۵۸ء کی تیرھویں تاریخ تھی کہ جاں نثار نے آکر خبر دی کہ لیجئے حضرت۔ آج دن کے چار بجے سب سامان آپ کو مہیا ملے گا۔ دیر تو ہوئی مگر کوٹھی کو بھی ایجنٹ نے ایسا سجایا ہے کہ پڑی جگمگا رہی ہے۔ دیکھیے گا تو پسند کیجئے گا۔ آج رات کو نو بجتے بجتے صاحب بھی خدا نے چاہا تو آپہنچیں گے۔ آپ چاہیں تو آج رات کو وہیں چل کر آرام کریں۔ دن بھی اچھا ہے' مہورت بھی اچھی ہے۔ خدا مبارک کرے۔

ابن الوقت : بہتر ہے' صاحب کو آلینے دو اور خوب دھیان کر لو۔ کسی چیز کی کسر تو نہیں رہ گئی۔

جاں نثار : میں نے اچھی طرح خیال کر لیا ہے اور دو ایک شخصوں کو بھی دکھا لیا ہے۔ بس اگر کسر ہے تو آپ ہی کی ہے۔ انشاء اللہ ہر چیز آپ تیار پائیں گے۔

آفتاب نکلا ہی تھا کہ اگلے دن نوبل صاحب کا بلاوا آموجود ہوا۔ نوبل صاحب' جیسا ان کا دستور تھا' بہت تپاک سے ملے اور کچہری کے بکس سے ایک چٹھی نکال کر ابن الوقت کے حوالے کی کہ لیجئے' مبارک' ڈھائی سو کی اکسٹرا اسسٹنٹی کی منظوری آئی ہوئی چار دن سے میرے پاس رکھی ہے۔ چونکہ میں آنے کو تھا' میں نے چاہا کہ اپنے ہاتھ سے چٹھی اور زبان سے مبارک باد دوں۔ ایک بات میں نے آپ کے بے پوچھے کی کہ مقدمات تحقیقات بغاوت میں مجھ کو آپ سے مدد لینے کی ضرورت پڑتی۔ اس کام کے ختم ہونے تک میں نے آپ کو اپنے محکمے میں لے لیا۔

ابن الوقت : آپ نے تو احسانات سے اس قدر مجھ کو لاد دیا کہ شکر گزاری کا نام بھی منہ سے نکلنا مشکل ہو گیا ہے۔ بھلا خیر' زمینداری تک تو مضائقہ نہ تھا' یہ اکسٹرا اسسٹنٹی کیونکر

میرے سنبھالے سنبھلے گی"

نوبل صاحب : ایسی سنبھلے گی کہ دوسروں کے چھکے چھوٹ جائیں گے۔ ضوابط کچہری سے آپ کو ایک طرح کی ناآشنائی بے شک ہے۔ سو کچھ بڑی بات نہیں اور اسی غرض سے میں نے آپ کو اپنے محکمے میں لیا ہے۔ ایک ہوشیار سا منشی آپ کے اجلاس میں تعینات کر دیا جائے گا اور وہ تھوڑے دنوں میں آپ کو ضوابط سے آگاہ کر دے گا۔ آپ کے لیے زمینداری کے علاوہ اس خدمت کی تجویز ہو چکی تھی۔ مگر ایک دم سے اتنی بڑی نوکری دیتے ہوئے لوگ ہچکچاتے تھے۔ آخر لاٹ صاحب کے یہاں سے منظوری منگوائی گئی۔ حسن اتفاق سے آج غدر کو بھی پورا برس ہوا۔ پس کل سے ضلع کی کچہری میں میرے اجلاس کے پہلو میں اجلاس شروع کیجئے۔ میں جاں نثار سے یہ بات سن کر بہت ہی خوش ہوا کہ آپ نے ۴۴ نمبر کا بنگلہ اپنے رہنے کے لیے تجویز کیا ہے' اور وہ بہ ہمہ وجوہ مرتب بھی ہو گیا ہے۔

ابن الوقت : شاید آپ کو یہ بھی معلوم ہوا ہو گا کہ میں مکان کے ساتھ لباس اور تمام ہندوستانی طرز کو بھی بدلنے والا ہوں۔

جاں نثار : آہا! آپ کو پورا پورا فارڈ اور فارمر جنٹلمین دیکھ کر میں بہت ہی خوش ہوں گا۔

کھانے کا وقت تھا قریب۔ نوبل صاحب نے چاہا کہ ابن الوقت بھی شریک ہو۔ مگر اس نے عذر کیا کہ بس آج اس وقت اور معاف کیجئے۔ اس وقت کے بدلے اگر آپ چاہیں تو میں رات کو کھانے میں وضع جدید کے ساتھ شریک ہو سکتا ہوں۔ مجھ کو اس حالت سے آپ کے پاس بیٹھنا باتیں کرنا اور آپ کے ساتھ کھانا کھانا بھلا نہیں معلوم ہوتا۔

نوبل صاحب

نے اس بات کو بہت پسند کیا اور فرمایا کہ آج ڈنر پر میں اپنے احباب کو بھی جمع کروں گا اور کھانے کے بعد سب سے آپ کی تقریب بھی کرا دوں گا تاکہ ایک جلسے میں سب لوگوں سے معرفت ہو جائے۔

فصل ۱۰

ابن الوقت نے انگریزی وضع اختیار کر لی

نوبل صاحب نے اس کی دعوت کی

نوبل صاحب کے پاس سے اٹھا تو جاں نثار ابن الوقت کو سیدھا اس کے بنگلے پر لے گیا' اور جاتے ساتھ حجامت کروا اصطباغ دے یعنی نہلا دھلا موسم اور وقت اور موقع کے لحاظ سے فیشن کے مطابق انگریزی سوٹ پہنا' نکٹہ دھجی پوزی یعنی برسنر تائی کالر سب کس کسا کر اس کو اچھا خاصا عین مین پورومین بنا دیا۔ ابن الوقت نے آئینے میں دیکھا تو اپنے تیئں انگریزوں کے ساتھ مشابہ پایا۔ بے اختیار تن کر لگا کپڑے بدلنے کے کمرے میں پینترے بدلنے۔ کھانے کے بعد اس کے کئی گھنٹے کوٹھی کی دیکھ بھال میں گزرے۔ گرمی کے دن۔ چاروں طرف خس کی ٹٹی لگی ہوئی۔ کوچ پر دراز ہوتا تھا کہ آنکھ لگ گئی۔ جاگا تو ہوا خوری کے کپڑے بدل باہر نکل گیا۔ کوئی دو گھڑی رات جاتے جاتے لوٹ کر آیا تو نوبل صاحب کے ہاں جانے کا وقت قریب تھا۔ ڈنر کے لیے تیاری شروع ہوئی۔ کچہری نہیں' دربار نہیں' کوئی پارٹی نہیں' اس پر بھی دن کے گیارہ سے لے کر اب یہ تیسری دفعہ ہے کہ انگریزی تہذیب کپڑے بدلنے کے متقاضی ہے۔ سڑک بیچ نوبل صاحب کی کوٹھی تھی۔ جب معلوم ہوا کہ اور مہمان آنے شروع ہوئے' یہ بھی اپنے بنگلے سے اٹھ جا موجود۔ کھانے سے پہلے اور کھانے میں صاحب لوگ اس کو اجنبی سمجھ کر بار بار دیکھتے تھے۔ لیکن چونکہ کسی نے ان کو انٹروڈیوس نہیں کیا تھا' کوئی اس سے پوچھ نہیں سکتا تھا کہ تم کون ہو۔ اور نہ یہ کسی سے بات کر سکتا تھا۔ نوبل صاحب مہمانوں کی آؤ بھگت میں لگے تھے۔ ان سے لحہ دو لحہ کا چھٹکارا پاتے تو ابن الوقت سے ایک دو بات کر جاتے۔ ڈنر تھا کہ اچھا خاصا پہر ڈیڑھ پہر کا جھمیلا تھا۔ جہان کے قصے اور دنیا کی بکواس۔ خیر خدا خدا کر کے ڈنر سے چھٹی پائی۔ ابھی سب لوگ اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے ہیں کہ نوبل صاحب نے کھڑے ہو کر یہ تقریر کی!

"صاحبو! یوں تو آپ صاحبوں سے اکیلے دکیلے یا مجمع میں ملنا ہمیشہ خوشی کا موجب ہوتا ہے' مگر آج کی رات کی ملاقات ایک خاص وجہ سے بہت بڑی خوشی کی بات ہے۔ آپ کو دعوت کے رقعوں سے معلوم ہو گا کہ آج کی دعوت سے ایک نئے دوست کو آپ کی سوسائٹی میں انٹروڈیوس کرانا مقصود تھا۔ (چیرز) اگرچہ میرے حالات غدر کے بعد سب صاحبوں نے باری باری زبان سے سنے ہیں۔ مگر میرے حق میں وہ ایسے دلچسپ ہیں کہ ہر بار کے بیان کرنے میں مجھ کو ایک نیا مزہ ملتا ہے اور اس سے میں قیاس اور امید بھی کرتا ہوں کہ اس محل پر ان کا بالتفصیل اعادہ کرنا نہیں بلکہ مختصر طور پر ان کی طرف اشارہ کر دینا کسی صاحب کی طبیعت پر ناگوار نہیں گزرے گا (ہرگز نہیں ہرگز نہیں) یہ ہرگز میرے خیال میں نہیں آتا کہ غدر میں مجھ ہی پر سب سے زیادہ مصیبت

پڑی۔ مگر اتنا میں ضرور سمجھتا ہوں کہ میرے حصے کی مصیبت بھی کچھ کم نہ تھی۔ مجھ کو غدر نے اچانک آ دبایا' جب کہ میں بہ عزم ولایت بمبئی جاتے ہوئے علالت مزاج کی وجہ سے تھوڑی دیر کے لیے مسافرانہ ڈاک بنگلے میں ٹھہرا ہوا تھا۔

میری جان پہچان یا دوست یا دردمند جو کچھ سمجھو' میرا ایک ذاتی ملازم تھا جو اب بھی میرے پاس ہے اور بمبئی تک میرے ساتھ جانے والا تھا۔ مجھ کو اس شدت کا درد سر تھا کہ تکیے پر سے سر نہیں اٹھا سکتا تھا۔ دفعتہ" دین دین اور علی علی کا غل سن پڑا اور ایک منٹ بھی نہیں گزرنے پایا تھا کہ شہر کی بازاری خلقت بنگلے پر ٹوٹ پڑی۔

میرا آدمی (مجھ کو پیچھے معلوم ہوا) اس وقت میری دوا کے لیے شفاخانے گیا ہوا تھا۔ انہی لٹیروں میں سے پانچ چار تلنگے مجھ کو کشاں کشاں کشمیری دروازے سے باغیوں کے گارد میں لے گئے۔ وہاں میں نے دیکھا کہ چند انگریز مرد اور عورتیں اور بچے قیدیوں کی طرح زمین پر بیٹھے ہیں۔ مجھ کو بھی انہی میں بٹھا دیا۔ مگر ہم ایک دوسرے سے بات نہیں کر سکتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ درد سر' جو ایک لمحے کے لیے مفارقت نہیں کرتا تھا اور جس نے مجھ کو ولایت جانے پر مجبور کر دیا تھا' اس وقت بالکل زائل ہو گیا تھا تھوڑی دیر بعد میں نے اپنے آدمی کو دیکھا کہ تماشائیوں میں ملا ہوا مجھ کو دیکھ رہا ہے۔ اس کا چہرہ اداس تھا اور اس کی صورت پریشان۔ مگر وہ ٹکٹکی باندھ کر میری طرف دیکھ بھی نہیں سکتا تھا اور دیکھ بھی سکتا تو وہ مجھے کیا فائدہ پہنچا سکتا تھا۔ لیکن جب میں نے آنکھ اٹھا کر دیکھا کسی نہ کسی طرف اس کو کھڑا ہوا پایا۔ اس سے میں سمجھا کہ وہ میری مصیبت پر متاسف ہے۔ حوالات کی مصیبت کا بیان کرنا دیر طلب بات ہے اور میں اس تذکرے سے سکوت کرتا ہوں' کیونکہ مجھے اور بھی کچھ کہنا ہے۔ تیسرے دن ہم سب کو گھیر کر میگزین کے میدان میں لے گئے اور جب تک قلعے کے حوالاتی آئے' ہم کو کھڑا رکھا۔ پھر سب کو بٹھا کر باڑھ مار دی۔ اس وقت تک بھی میں نے اپنے آدمی کو کالج کے دروازے کے پاس دیکھا۔ شاید میرا دماغ مدتوں کے درد سر سے ضعیف ہو رہا تھا کہ باڑھ کے صدمے سے یا زخموں کی وجہ سے مجھ کو غش آ گیا۔

اس وقت تک جو کچھ میں نے بیان کیا' وہ میری ذاتی معلومات ہیں۔ اس کے بعد میں نے آدھی رات کے بعد آنکھ کھولی اور مجھ کو ہوش آیا تو میں اپنے تیئں ان کے (ابن الوقت کی طرف اشارہ کر کے) مکان میں پایا' جن سے ملنے کو میں نے آپ صاحبوں کو بلایا ہے (چیرز) میں یہ بات کچھ اس نظر سے نہیں کہتا کہ اپنے وفادار نوکر کی خیر خواہی کو میں اعلیٰ درجے پر نہیں خیال کرتا۔ اس پر میرے احسانات اور نمک کے حقوق ثابت تھے مگر ان صاحب کو بلکہ ان کے معزز خاندان میں سے کسی کو بھی کسی انگریز سے کسی طرح کا تعلق نہیں رہا۔ انہوں کے چند سال تک دہلی کالج

میں مشرقی علوم کی تعلیم پائی اور کالج چھوڑنے کے بعد اپنی موروثی خدمت پر شاہی ملازموں میں جا ملے۔ پس عام ہمدردی اور نیک دلی کے سوا اور کوئی خیال ان کو میری پناہ دہی کا محرک نہیں ہو سکتا تھا۔ آپ میری شکل و صورت کو دیکھتے ہیں کہ اگر میں بھیس بدل کر ہندوستانیوں میں ملنا چاہتا تو رنگ اور بال اور آنکھیں ہر چیز میرا پردہ فاش کرنے کو موجود تھی۔ اس کے علاوہ ان کا گھر خانقاہ سے، جس کو مجاہدین کا اکھاڑہ کہنا چاہیے، بہت ہی قریب ہے۔ پس میرا پناہ دینا بڑی خطرناک بات تھی، خصوصاً ملازم شاہی کے حق میں پھر مدارات جو انہوں نے کی، شروع سے آخر تک یکساں تھی۔ اور یہ بھی اس بات کی ایک دلیل ہے کہ میری پناہ دہی میں کسی غرض دنیاوی کو دخل نہ تھا۔

میں ان باتوں کا چنداں اپنی احسان مندی ظاہر کرنے کے ارادے سے ذکر نہیں کرتا بلکہ آپ صاحبوں کے ذہن سے اس غلط اور بے اصل خیال کو نکالنا چاہتا ہوں کہ حکومت انگریزی کا سب سے بڑا دشمن مذہب اسلام ہے۔ باقی اسلام نے بالتخصیص عیسائیوں کی نسبت قرآن میں اپنی رضا مندی اور خوشنودی صاف طور پر ظاہر کی ہے۔ انہوں نے اپنے معتقدین کے لیے ہمارے ساتھ کھانا اور رشتہ و پیوند کرنا جائز قرار دیا ہے۔ اور میں نے قسطنطنیہ اور دوسری اسلامی سلطنتوں میں مسلمانوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ انگریزوں کے ساتھ بے تامل کھاتے پیتے ہیں اور ان کا لباس بالکل ہم لوگوں سا ہے۔ صرف ان کا شعار قومی مابہ الامتیاز ہے جس سے وہ پہچانے جاتے ہیں۔ ساتھ کھانا اور رشتہ و پیوند کرنا دو بڑے ذریعے اتحاد پیدا کرنے کے ہیں اور دونوں باتوں کی اجازت سے ثابت ہے کہ مسلمانوں کے پیغمبر ﷺ صاحب کو منظور تھا کہ ان کے گروہ کے آدمی ہم لوگوں کے ساتھ دوستانہ برتاؤ رکھیں۔ اور ہندوستان کے مسلمانوں کے سوائے اور ملکوں کے مسلمان اس حکم کی پوری پوری تعمیل کرتے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو ہندوؤں کی صحبت نے بڑے بڑے نقصان پہنچائے ہیں۔ اور منجملہ ان کے ایک یہ بھی ہے کہ یہاں کے مسلمان انہی کی طرح شکی اور وہمی ہو گئے ہیں۔ پس جو نفرت ہندوستان کے مسلمانوں کو انگریزوں سے ہے، ہرگز مذہبی نہیں ہے بلکہ ایک رسم ہے جو انہوں نے ہندوؤں سے اخذ کی ہے۔ اور جتنی مسلمان اپنے مذہب سے بخوبی آگاہ ہیں، ہرگز اس نفرت میں شریک نہیں مجھ کو معلوم ہے کہ دہلی کے مسلمانوں میں جو مستند عالم تھے، باغیوں نے ہرچند ان پر سختی کی مگر انہوں نے جہاد کا فتویٰ دینے سے انکار کیا اور ان ہی انکار کرنے والوں میں یہ میرے دوست بھی تھے۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ باغیوں میں بہت سے مسلمان بھی ہیں، مگر کون مسلمان؟ اکثر عوام الناس، پاجی، کمینے، رذیل جن کے پاس رسم و رواج کے سوائے مذہب کوئی چیز نہیں۔ یا اگر کسی روادار مسلمان نے بغاوت کی ہے تو مذہب کو اس نے صرف آڑ بنایا ہے اور اصل میں غصہ یا لالچ یا کوئی اور سبب محرک ہوا ہے۔ جس طرح ہماری قوم ہمیشہ سے بہادری میں نامور رہی ہے اسی طرح ہمارا سچا مذہب بردباری

اور درگزر میں۔ اور خدا کی مقدس مرضی نے ہم کو ان دونوں صفتوں میں آزمانا چاہا۔ ہم بہادری کی آزمائش میں خدا کے فضل سے پورے اترے۔ اب ہم کو دوسری آزمائش میں پورے اترنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جب تک ہم مغلوب تھے، ہم نے بہادری سے کام لیا۔ اب ہم کو خدا نے غلبہ دیا ہے تو چاہیے کہ بردباری اور درگزر سے کام لیں۔ قدرت پا کر معاف کر دینے سے ایشیائی قومیں ہم کو ضعیف سمجھنے کے عوض بہت زیادہ طاقت ور خیال کریں گی۔ سلطنت کی عمارت میں بہادری نے اگر گارے کا کام دیا ہے تو بردباری چونے گچ کا کام دے گی (ابن الوقت کی طرف اشارہ کر کے) انہوں نے مجھ پر اپنا یہ ارادہ بھی ظاہر کیا ہے کہ آئندہ ہندوستانیوں یعنی کم سے کم اپنے ہم قوم مسلمانوں اور انگریزوں میں اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔ اگر انہوں نے ایسا کیا اور مجھ کو پورا بھروسہ ہے کہ ضرور کریں گے تو گورنمنٹ کو چاہیے کہ میری پناہ دہی سے بڑھ کر ان کی اس کوشش کی قدر کرے۔ میری پناہ دہی کے صلے میں گورنمنٹ نے ان کو ڈھائی سو روپے ماہوار کے منافع کی زمینداری عطا فرمائی ہے اور اکسٹرا اسسٹنٹی کی خدمت، جو ہندوستانی کے لیے اعلیٰ درجے کی نوکری ہے۔ تمام زمانہ غدر میں ان کے پاس رہنے سے مجھ کو ان کے تفصیلی حالات معلوم ہیں۔ علوم مشرقی کے یہ بڑے عمدہ سکالر ہیں۔ انہوں نے دہلی کالج میں جغرافیہ، تاریخ، پولیٹیکل اکانمی اور ریاضی وغیرہ علوم بخوبی پڑھے ہیں۔ ان کی عام معلومات اونچے درجے کی اور قابل قدر ہے۔ ان کو اخبار بینی کا بڑا شوق ہے۔ ان کے خیالات وسیع اور شگفتہ ہیں۔ غرض آپ لوگ ان کے ساتھ ارتباط پیدا کرنا چاہیں گے تو مجھ کو امید ہے کہ آپ ان کی ملاقات سے ہمیشہ محظوظ رہیں گے۔ اب شاید آپ صاحبوں کو زیادہ دیر تک باتوں میں لگائے رکھنا موجب تصدیع ہوگا، اس واسطے شکر قدم پر تقریر ختم کرتا ہوں۔

فصل ۱۱

انگریزی دستور کے مطابق ابن الوقت نے نوبل صاحب کی دعوت میں کھانے کے بعد تقریر کی

نوبل صاحب بیٹھنے کو تھے کہ ابن الوقت اٹھے۔ مہمانوں میں سے کسی کو بلکہ خود نوبل صاحب کو بھی توقع نہ تھی کہ یہ بھی کچھ کہیں گے۔ مگر کھڑے ہوئے تو انہوں نے کہنا شروع کیا!

صاحبو! مجھ کو اس طرح کے معزز جلسے میں پہلے پہل حاضر ہونے کا اتفاق ہوا ہے اور مجھ کو

آپ صاحبوں کے روبرو بات کرنے کی عادت و صلاحیت دونوں نہیں۔ مگر نوبل صاحب نے ایسی مہربانی کے ساتھ میری تقریب آپ صاحبوں سے کی ہے کہ ان کی شکرگزاری کو میں اپنا فرض موقت خیال کرتا ہوں۔ میں نے اپنے پندار میں کوئی کام ایسا نہیں کیا جس کے واسطے نوبل صاحب یا گورنمنٹ میری احسان مند ہو۔ میں نے نوبل صاحب کو مردوں کے انبار میں سے اٹھایا اور اپنے گھر لے جا کر رکھا لیکن اگر ایسا نہ کرتا تو میں مسلمان بلکہ انسان نہ تھا۔ پس میں نے اپنا فرض مذہبی بلکہ فرض انسانیت ادا کیا اور میں نہیں سمجھتا کہ مجھ کو کسی طرح کی خاص مدح کا استحقاق حاصل ہے۔ یہ نوبل صاحب کی ذاتی شرافت اور گورنمنٹ کی فیاضی ہے کہ نوبل صاحب میرا احسان مانتے ہیں اور گورنمنٹ نے کثیر النافع زمینداری اور یاوقعت بیش بہا ماہانے کی نوکری مجھ کو عطا فرمائی۔ ابھی تک غدر سے پوری پوری نجات حاصل نہیں ہوئی' لیکن اس کی جڑ کٹ گئی ہے اور شاخ و برگ' اگر کوشش نہ بھی کی جائے تو آپ ہی آپ خشک ہو کر اور گل سڑ کر خاک میں مل جائیں گے۔ دنیا کا قاعدہ ہے کہ نتیجے کے واقع ہونے کے بعد اس کے اسباب کی جستجو کی جاتی ہے لیکن مبارک ہیں وہ لوگ جو وقوع نتیجہ سے پہلے اسباب پر نظر کرتے ہیں۔

مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست

خیر' اگر وہ موقع ہم سے فوت ہو گیا تاہم بعد الوقوع اسباب غدر کا خیال کرنا اس وقت دلچسپ اور آئندہ مفید ہو گا۔ اخبار والوں نے اس کی چھیڑ چھاڑ شروع کر دی اور ہر شخص جو کچھ اس کے منہ میں آتا ہے' کہتا ہے۔ لیکن اگر گورنمنٹ جس کو واقعی اسباب غدر کا جاننا سب سے زیادہ ضروری ہے' اخبار والوں کی رائے پر عمل کرے گی' اور اخبار والے تو آخر اسی غرض سے خامہ فرسائی کر بھی رہے ہیں' تو میں گورنمنٹ سے اور آپ سب صاحبوں سے معافی مانگ کر یہ بات کہتا ہوں کہ گورنمنٹ بڑا دھوکا کھائے گی۔ اور گورنمنٹ کی خیر خواہی مجھ کو اس بات کے کہنے پر مجبور کرتی ہے کہ شاید وہ ویسی ہی ناواقف اور بے خبر گورنمنٹ رہے گی جیسی غدر سے پہلے تھی۔ سلطنت میں رعایا اور گورنمنٹ دونوں کے اغراض وابستہ یک دگر ہیں۔ اگر ہندوستانیوں کو انگریزی سلطنت سے امن و آزادی کے گوناگوں فائدے پہنچے ہیں' جو فی الواقع ان کو کسی زمانے میں نصیب نہیں ہوئے۔ تو اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ انگلستان اسی سلطنت کی بدولت مالا مال ہو گیا ہے اور اسی سلطنت کے برتے پر اس نے تمام یورپ کی سلطنتوں کی کنی دبائی ہے۔ ممکن ہے کہ بعض احمق ہندوستانی اسی کو انگلستان کا بڑا مفاد سمجھتے ہوں کہ انگریز بڑی بڑی تنخواہیں پاتے ہیں۔ یہ تو ان فائدوں کا پاسنگ بھی نہیں۔ بات یہ ہے کہ انگلستان ہنرمندی اور صناعی کا گھر ہے اور اس کے تمول کا بڑا ذریعہ' بلکہ میں کہہ سکتا ہوں تنہا ذریعہ تجارت ہے۔ سو ہندوستان کی

سلطنت نے انگلستان کی تجارت کو ہزار ہا گونہ تو اب بڑھا رکھا ہے اور کوئی کہہ نہیں سکتا کہ آئندہ اس میں کہاں تک افزائش ہو گی۔ پس اگر اغراض کا موازنہ کریں تو میرے نزدیک انگلستان کی اغراض کا پلہ جھکتا رہے گا۔ یہ سبب ہے کہ انگریزوں کو غدر کا زیادہ فکر ہونا چاہیے۔ میں اس کو انگریزوں کی اقبال مندی سمجھتا ہوں کہ حسن اتفاق سے اس وقت کوئی معاصر سلطنت ہندوستان کے دعوے دار نہیں ہوئی اور اہل ہند میں اس سرے سے اس سرے تک کسی فرد بشر میں سلطنت کی صلاحیت نہ تھی اور ہندوستان کی مختلف اقوام میں اتفاق کا رنگ پیدا نہیں ہونے پایا تھا۔ انگریزوں نے اس ملک کو بزور شمشیر فتح کیا اور بزور شمشیر اس پر قابض رہے اور بہ زور شمشیر غدر کو بھی فرو کر دیا۔ مگر بہ زور شمشیر رعایا کے جسموں کو مسخر کر سکتے ہیں نہ کہ دلوں کو۔ یہ ملک صدہا بلکہ ہزار ہا برس سے شخصی سلطنتوں کا محکوم رہا ہے اور یہاں کی رعایا نے ابھی تک انگریزی سلطنت کی حقیقت کو نہیں سمجھا اور یہ لوگ حکام ضلع کو بادشاہ کا اوتار خیال کرتے ہیں پس اس ملک کے عہدہ داران انگریزی کے ذمے دوسرے فرائض خدمت کے علاوہ ایک بڑا ضروری فرض مزید یہ بھی ہے کہ ہر وقت اپنے تئیں ملکہ کا قائم مقام سمجھ کر لوگوں کے ساتھ اس طرح کا برتاؤ کریں جو ملکہ کے لیے زیبا ہے۔ آپ صاحبوں میں سے ہر شخص اپنے دل میں خیال کر سکتا ہے کہ اس نے اپنے فرض کو کہاں تک ادا کیا ہے۔ انگریز الا ماشاء اللہ اس ملک میں ایسا روکھا مزاج بنائے رکھتے ہیں اور ہندوستانیوں کو ایسی نفرت اور حقارت سے دیکھتے ہیں کہ کوئی ان کے پاس نہیں پھٹکتا' تاوقتیکہ اس کو ضرورت مجبور نہ کرے۔ انگریزوں اور ہندوستانیوں میں محبت اور اخلاص کا ہونا ایسا دشوار ہے جیسے شیر اور بکری ہیں۔ میں ہندوستانیوں کے ڈفنس میں ایک لفظ نہیں کہنا چاہتا اور اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ کوئی انگریز جنٹلمین ان کی ملاقات سے کبھی محظوظ نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر بروں سے پالا پڑ جائے تو تھوڑا بہت انہیں طبیعت پر بھی جبر کرنا چاہیے۔

چو تواں کرد مرد ماں استند

اور جو شخص اس تکلیف کا متحمل نہیں ہونا چاہتا تو اس کو ان بروں سے بھلائی کی توقع بھی نہیں رکھنی چاہیے۔ غدر کے بعد سے انگریزوں کو یہ شکایت پیدا ہوئی ہے کہ ہندوستان نے اس کی مدد نہیں کی۔ لیکن انگریز گریبان میں منہ ڈال کر دیکھے کہ وہ کس احسان' کس مہربانی کے عوض میں اس کا مستحق تھا؟ وہ شاید اپنا ایک حق بھی کسی ہندوستانی پر ثابت نہیں کر سکے گا۔ اس اصول منصفانہ کو پیش نظر رکھیں تو بغاوت کی لمبی فہرست صرف ایک فرد مختصر رہ جائے گی۔ اب رہ گئی بغاوت بہ مقابلہ سرکار' سو میں آپ صاحبوں کی خدمت میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ہندوستانیوں کے نزدیک سرکار کوئی چیز نہیں۔ احسان فراموشی انسان کی نیچر یعنی تقاضائے طبیعت ہے۔ غدر'

جس کا لوگوں نے اتنا بڑا بتنگڑ بنا رکھا ہے' میرے نزدیک انسانی نیچر کے ظہور سے کچھ زیادہ نہ تھا۔ ہرچند انگریزی عملداری سے ہندوستانیوں کو بہت سے فائدے پہنچے تھے' مگر ان کو واقعی یا ادعائی' واجب یا غیر واجب چند در چند شکایتیں تھیں۔ پس اگر انہوں نے شکایتوں کے جوش میں فائدوں پر نظر نہ کی تو اس کو ضعف بشریت اور انسان کی نیچر کے نقصان کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ انگریزی اور ایشیائی حکومتوں کا طرز ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہے کہ ایک کو دوسرے سے کچھ مناسبت نہیں۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں برسوں سے ہندوستانی خوگر تھے اپنے ہم وطنوں کی حکومت کے جن کے درباریوں میں ان کی رسائی بہ آسانی ہو سکتی تھی۔ ملک کی تمام آمدنی بادشاہ کی خاص ملکیت ہوتی تھی اور وہ اس کو بلا مزاحمت جس طور پر چاہتا تھا خرچ کرتا تھا مگر اس بدنصیب ملک کی ساری دولت ایشیائی حکومتوں میں سدا بے ہودہ نمود و نمائش اور ممنوع عیاشی میں برباد ہوا کی اور اس سے متمتع ہوتے رہے خوشامدی خود غرض۔

بہرکیف' دولت کا دریا ایک رخ کو بہتا اور ان لوگوں کو سیراب کرتا رہا جن کی قسمتوں میں اس سے فائدہ اٹھانا تھا۔ ہندوستانی عملداری جا کر انگریزی عملداری کا آنا اس سے تو کسی طرح کم نہیں کہ وہ دریائے زخار ایک سمت کو بہتے بہتے لگا بالکل سمت مخالف میں بہنے۔ یعنی ایک ایسی سلطنت شروع ہوئی جس کی مثال اس ملک میں نہ دید ہے نہ شنید ہے' خلق خدا کی' ملک وکٹوریہ بادشاہ زادی کا اور حکم کمپنی بہادر کا۔ خلقت ایک اور کاٹھے تین تین فرمانروا' اور تینوں نظر سے پوشیدہ۔ آپ صاحب یہاں کے لوگوں کی حیرت پر تعجب کریں گے۔ مگر اس میں رتی برابر مبالغہ نہیں۔ انگریزی سلطنت رعایائے ہندوستان کے حق میں ایک پہیلی ہے جس کو اس وقت تک اکثر عوام الناس نہیں بوجھ سکے۔ تبدیلی سلطنت یوں کچھ آسان بات نہیں اور پھر ایسا تبدل کہ حاکم و محکوم دونوں میں کسی طرح کی مناسبت نہیں۔ نہ وطن ایک نہ زبان ایک' نہ مذہب ایک۔ پس ہندوستانیوں کے حق میں سلطنت کیا بدلی گویا ساری خدائی بدل گئی۔ اگلے تمام ذریعے معطل' ساری لیاقتیں بے کار' کل تدبیریں بے اثر بس شاہی متوسل اور متوسلوں کے متوسل کہ ان کا مجموعہ بجائے خود ایک جم غفیر ہو گا' بے آسرے اور بے سہارے ہو کر بیٹھ رہے۔ اب ہر ایک منصف مزاج آدمی خیال کر سکتا ہے کہ اس گروہ کو انگریزی عملداری سے ناخوش ہونے اور رہنے کی وجہ معقول تھی یا نہیں۔ پھر انگریزی عملداری اتنی پرانی ہو گئی تھی کہ جن لوگوں نے بادشاہی وقت دیکھے تھے مرکھپ چکے تھے اور چاہیے تھا کہ اس زمانے کی باتیں بھی بھول بسر جاتیں' مگر ہم دیکھتے ہیں تو ان کی یادگار ہر دم تازہ ہے۔ اس وجہ سے کہ اب بھی چھوٹی بڑی محکوم اور خود مختار بہتیری ہندوستانی ریاستیں جگہ جگہ موجود ہیں اور ان میں بلا کم و کاست ایشیائی حکومتوں کے نمونے باقی ہیں۔ اگر سرکار انگریزی کو اپنی رعایا کا دل خوش رکھنا منظور ہے تو چار دانگ ہندوستان میں اس

سرے سے اس سرے تک ایک طرح کا انتظام ہونا چاہئے۔

مجھ کو بیرون شہر کسی ہندوستانی ریاست میں رہنے یا نوکری کرنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ مگر لوگوں کے کہے سننے سے' اخبار سے' بعض ریاستوں کے عام حالات معلوم ہیں۔ یہ ریاستیں باستثنائے معدودے چند اس قدر پیٹ بھر کر خراب ہو رہی ہیں کہ ان کی حالت نہ صرف انہی کے حق میں خطرناک ہے بلکہ انگریزی طرز انتظام' انگریزی رعایا' سبھی کے حق میں۔ اور جب تک ان ریاستوں کی پوری پوری صلاح نہ ہو' انگریزی گورنمنٹ کو کبھی اپنے انتظام کی طرف سے مطمئن نہیں ہونا چاہئے۔ ان میں سے ایک ایک ریاست' اگر اس کے انتظام میں فساد ہے' انگریزی گورنمنٹ کے حق میں بغلی گھونسا ہے۔ فساد سے میری مراد یہی نہیں کہ رئیس اپنے تئیں انگریز کا مدمقابل سمجھتا ہو یا نافرمانی یا عدول حکم سے گورنمنٹ کا استخفاف کرتا ہو۔ میں اس بات کو پکار کے کہتا ہوں کہ ہندوستانی رئیس ہندو ہو یا مسلمان آرام طلب ہو گا' کاہل ہو گا' احمق ہو گا' جاہل ہو گا' عیاش ہو گا' غافل ہو گا' مسرف ہو گا' خرچ آمد سے فاضل ہو گا۔ غرض اس میں ہر طرح کے جنون ہوں گے' مگر نہیں ہو گا تو ایک جنون بغاوت۔ سرکار نے اپنی فوجی طاقت کو ہندوستان میں خصوصاً بعد غدر ایسے زور سے ثابت کر دیا ہے جیسے آگ نے جلانے کی خاصیت کو پس ہندوستانی رئیسوں کی طرف ایسا خیال بالکل لغو اور محض بے اصل ہے۔ لیکن جس چیز سے گورنمنٹ انگریزی کو ہندوستانی ریاستوں کی طرف سے میں ڈرانا چاہتا ہوں' وہ یہ ہے کہ اکثر ہندوستانی رئیس اپنی چند در چند نالائقیوں اور گوناگوں بدکرداریوں کی وجہ سے ایسی خرابیاں کر رہے ہیں کہ اول تو خود انہی کی رعایائے نامہذب و ناشائستہ سے انگریزی گورنمنٹ کو ہمیشہ خائف رہنا چاہئے' دوسرے ان ریاستوں کے برے نمونے دیکھ کر رعایائے انگریزی کی طبیعتیں بگڑی چلی جاتی ہیں۔

جسد سلطنت میں یہ ریاستیں گویا برص کے چھٹے ہیں۔ کیوں کر اطمینان ہو سکتا ہے کہ ان چھٹوں کا فساد دوسرے اعضائے صحیح تک متعدی نہیں ہو گا؟ اگر میری تقریر سے ایسا مستنبط ہوا کہ میں ان ریاستوں کے ضبط کرانے کی رائے رکھتا ہوں تو مجھ سے بڑھ کر قوم و ملک کا کوئی دشمن نہیں۔ لیکن میری رائے ضرور ہے کہ اگر گورنمنٹ اپنے تئیں ان ملکی گورنمنٹوں کا مربی اور حامی اور محافظ سمجھتی ہے اور فی الواقع وہ ہے بھی' تو ان کی اصلاح اس کا فرض لازمی ہے۔ لیکن انگریزی گورنمنٹ نے اس فرض کے ادا کرنے میں کماحقہ' اہتمام نہیں کیا۔ بے شبہ سرکار کی طرف سے ایجنٹ یا ریذیڈنٹ کے نام سے ایک عہدہ دار ہر ایک ہندوستانی ریاست پر مسلط ہے مگر اس کو ریاست کے اندرونی انتظام میں حکماً" کچھ مداخلت نہیں۔ وہ اتنی ہی بات کی نگرانی رکھتا ہے کہ ریاست میں سرکار انگریزی کا رعب و داب اچھی طرح قائم رہے اور کوئی عام بدنظمی نہ ہو۔

اگر ایک باپ اولاد کے ساتھ وہ کرے جو انگریزی گورنمنٹ نے ہندوستانی ریاستوں کے ساتھ اب تک کیا ہے تو ہم ایسے باپ کی مدح نہیں کر سکتے۔ جتنا اس نے کیا' اچھا کیا۔ مگر اس کو اس سے بہت زیادہ کرنا چاہئے تھا۔ مہذب دنیا کی نظر میں انگریزی گورنمنٹ کبھی من حیث المجموع منتظم نہیں سمجھی جائے گی تاوقتیکہ اس کی تمام قسمی گورنمنٹیں اسی طرح منتظم نہ ہوں جیسے اس کا اپنا علاقہ۔ انگریزی گورنمنٹ کبھی بیرونی دشمنوں کے خدشے سے خالی نہیں رہتی اور اس کو خالی رہنا چاہئے بھی نہیں۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ میں اس کو قسمی ہندوستانی ریاستوں کی طرف سے کبھی خدشہ کرتے ہوئے نہیں پاتا حالانکہ اگر یہ ریاستیں نا منتظم رہیں' جیسا کہ اب ہے تو یہ اندرونی دشمن بیرونی دشمن سے بہت زیادہ خطرناک ہیں۔

اب میں آپ صاحبوں کو ایک دوسرے مطلب کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ دنیا کی قوموں میں نفرت اور عداوت کی بہت سی وجوہ ہو سکتی ہیں' مگر سب سے زیادہ شدید اختلاف مذہب ہے' خصوصاً ہندوستانیوں کے نزدیک۔ ہندو اپنے مذہب کے ایسے سخت متعصب ہیں کہ کسی دوسرے مذہب کے لوگوں سے ملنا نہیں چاہتے۔ جو لوگ دوسری قوموں کا چھوا پانی نہ پی سکیں ان سے دوستی اور اتحاد کی کیا توقع ہو سکتی ہے؟ ہندوستان کے باشندوں میں انگریزوں کے ساتھ ارتباط اور اختلاط کرنے والے کچھ لوگ اگر ہیں تو مسلمان ہیں' کیونکہ سچا مذہب اسلام ایسے تعصبات سے بالکل بری ہے۔ صرف یہی نہیں کہ مسلمانوں کی مقدس آسمانی کتاب یعنی قرآن اس سے ساکت ہے بلکہ اس میں انصاریٰ کے ساتھ مواکلت اور مناکحت دونوں کی صاف و صریح اجازت موجود ہے۔ اور میں نہیں سمجھتا کہ مواکلت اور مناکحت سے بڑھ کر دوستی پیدا کرنے کا کوئی اور بھی ذریعہ ہو سکتا ہے۔ لیکن ہندوستان کی حالت میں ہم اس بات کا کافی ثبوت رکھتے ہیں کہ مذہب کہاں تک رسم و رواج سے متاثر ہو سکتا ہے۔ ہندوستان میں ایک مدت سے ہندوستانی ملے جلے رہتے آئے ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ دونوں قوموں نے ایک دوسرے سے بہت باتیں اخذ کر رکھی ہیں' اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ دونوں میں اختلاف مذہب اور خاص کر مذہب ہنود کے روکھے پن کی وجہ سے جو منافرت ہونی چاہئے تھی مدتوں کی یکجائی نے اس کو بہت کم کر دیا ہے۔ مسلمانوں کی دیکھا دیکھی ہندو دھوتیاں اور کھڑاویں چھوڑ کر پاجامے اور جوتیاں پہننے' اپنی عورتوں کو پردے میں بٹھانے اور مسلمانوں کے علوم پڑھنے لگے۔ ہزار ہا ہنود محرم میں' جو مسلمانوں کا مشہور مذہبی تہوار ہے' تعزیہ داری کرتے ہیں' مسلمان بزرگوں کی قبروں کی تعظیم کرتے ہیں ان سے منتیں مانگتے ہیں کہ یہ ایک قسم کی پرستش ہے۔ اسی طرح مسلمان ہندوؤں کی تقلید سے کھانے پینے کا پرہیز کرنے لگے ہیں۔ اپنی بیوہ عورتوں کا نکاح نہیں کرتے۔ اکثر نجوم کے معتقد ہیں۔ شادی بیاہ میں بہت سی ایسی رسمیں جن کی مذہب میں کچھ اصل نہیں' ہندوؤں سے لی گئی ہیں۔

غرض ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلاط کا یہ نتیجہ ضرور ہوا ہے کہ ایک دوسرے سے وحشت نہیں رہی۔ لیکن یہ کیفیت کہیں صدہا سال میں جا کر پیدا ہوئی ہے اور پھر بھی میں اس کو اتحاد کے درجے میں نہیں سمجھتا۔ دونوں کے دل بدستور ایک دوسرے سے پھٹے ہوئے ہیں۔ آج کوئی بھڑکانے والا کھڑا ہو تو مسلمانوں کے نزدیک ہندو ویسے ہی کافر و مشرک ہیں اور ہندوؤں کی نظر میں مسلمان ویسے ہی ہتیارے' بھرشٹ۔ اور یہ نا اتفاقی انگریزی گورنمنٹ کے حق میں ایک فال مبارک و شگون نیک ہے' مگر وہیں تک کہ باہم رعایا میں ہو۔ اب دیکھنا یہ چاہئے کہ سرکار نے کہاں تک مذہبی نارضامندی کو اپنے مقابلے میں پیدا نہیں ہونے دیا۔ سو لوگوں میں تو یہی بات مشہور ہے کہ تمام فساد چربی کے کارتوسوں کا تھا۔ مگر میرے نزدیک یہ ایک نہایت نحیف رائے ہے۔ عوام کو ایسا مغالطہ واقع ہو سکتا ہے کیونکہ ان کے نزدیک ہر انگریز سرکار ہے' اگرچہ وہ امریکہ کے کسی مشن کا پادری یا سوداگر یا سیاح یا شکاری ہی کیوں نہ ہو۔ مگر جو لوگ انگریزی گورنمنٹ کے حالات سے کسی قدر بھی واقف ہیں' بخوبی جانتے ہیں کہ سرکار کسی مذہب سے سروکار نہیں رکھتی اور سرکار نے ابتدائے عملداری سے اپنے تئیں مذہبی بکھیڑوں سے ایسا الگ تھلگ رکھا ہے کہ سرکار پر مذہبی طرفداری کا الزام بہتان اور افترا ہے۔ لیکن رعایا کے خیالات نہ جاننے یا جان کر ان کی پروا نہ کرنے سے سرکاری عہدے دار یعنی حکام انگریزی سے اس طرح کی غلطی کا ہونا ممکن ہے جس سے لوگوں میں مذہبی ناخوشی پیدا ہو۔ اور میں خیال کرتا ہوں کہ چربی کا کارتوس اس کا محرک ہو گیا۔

غدر کا اصلی سبب ہے رعایا کی نارضامندی' اور اس کی بہت سی وجوہ ہیں۔ منجملہ ان کے کارتوس بھی ہے۔ اب دیکھنا چاہئے کہ لوگوں کو صرف اسی کارتوس سے شبہ ہوا کہ سرکار مذہب میں مداخلت کرنا چاہتی ہے یا سرکار کی کسی کاروائی سے لوگوں کو پہلے سے بھی بدگمانی کا موقع تھا۔ اگر سرکار انگریزی اس معنی کر کے مذہب سے الگ تھلگ رہی ہے کہ اس نے ہندو مسلمانوں میں سے کسی کو فرائض مذہبی ادا کرنے سے نہیں روکا یا کسی کو زبردستی یا کسی طرح کا لالچ دکھا کر عیسائی نہیں کرنا چاہا تو یہ بالکل صحیح ہے اور اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن مذہب کا اور خاص کر ہندوؤں کے مذہب کا بڑا ٹیڑھا معاملہ ہے۔ ان کا مذہب ہی فی نفسہ تار عنکبوت سے زیادہ بودا اور چھوئی موئی سے بڑھ کر نازک ہے۔ اس کا مدار نہ صرف دل کے خیالات پر ہے کہ ان پر کسی کا دسترس ہو نہیں سکتا بلکہ ایک ہندو بے قصد و ارادہ کھانے پینے سے' چھونے سے بے دین ہو سکتا ہے اور ان کے مذہب کا یہی ضعف دیکھ کر بعض مسلمان بادشاہوں کو موقع ملا کہ ہزار ہا ہندوؤں کو زبردستی مسلمان کر ڈالا۔ غرض مسلمانوں کی مدارات دیکھ کر ہندو پہلے سے سہمے ہوئے تھے۔ اب جو آئے انگریز تو انہوں نے دیکھا یہ مسلمانوں سے چند قدم آگے بڑھے ہوئے ہیں یعنی

جن چیزوں سے مسلمانوں کو پرہیز ہے یہ ان کو بھی نہیں چھوڑتے۔ مذہب کے پھیلانے میں سرگرمی اس درجے کی ہے کہ گلی گلی پادری وعظ کہتے، مذہبی کتابیں مفت بانٹتے پھرتے ہیں۔ چمار ہو، بھنگی ہو، ان کو اپنی ذات میں ملا لینے سے انکار نہیں۔ یوں ہندوؤں کے دلوں میں از خود سرکار انگریزی کی طرف سے مذہبی بدگمانی پیدا ہوئی۔ بدگمانی کی مثال اس درخت کی سی ہے کہ کائی کی طرح ذرا سا آسرا پا کر جم کھڑا ہوتا ہے اور کانس کے مانند جلانے سے لہلہاتا اور کاٹنے سے بڑھتا ہے۔ بدگمان آدمی کے ساتھ کتنا ہی سلوک، کیسی بھلائی کرو، وہ ہمیشہ اس کا برا ہی پہلو سوچا کرتا ہے۔ سرکاری تعلیم سے شکرگزاری اور احسان مندی کے عوض الٹی مذہبی بدگمانی کو ترقی ہوئی۔ لوگوں نے سمجھا کہ انگریز احمق اور عقل سے خارج تو ہیں نہیں کہ کھلم کھلا زور ظلم کر کے اپنے آپ کو بدنام اور رسوا کریں۔ یہ ہیں میٹھی چھری زہر کی بجھی۔ سر سہلائیں، بھیجا کھائیں۔ دیکھو تو لوگوں کو کرسٹان بنانے کی کیا تدبیر نکالی ہے۔

گڑ سے جو مرے تو زہر کیوں دو؟

پھر اس بدگمانی پر طرہ یہ کہ انگریزی خوانوں کو جو دیکھا تو عقیدے کے متزلزل، مذہب سے برگشتہ اب وہ بدگمانی نہ رہی بلکہ مرتبہ یقین کو جا پہنچی۔ یہ باتیں جو میں آپ صاحبوں کے روبرو بیان کر رہا ہوں، اگرچہ فرداً بعض ان میں کی آپ صاحبوں کی نظر میں بے وقعت بھی ہوں گی۔ مگر جب آپ سب کو جمع کر کے دیکھیں گے تو آپ خود بھی تسلیم کریں گے کہ مجموعی اسباب غدر و بغاوت کے لیے کافی تھے۔ ہندوستانیوں کے معابد کی تعظیم میں بھی انگریز ضرور کمی کرتے رہے۔ دہلی کی جامع مسجد ایک مشہور عمارت ہے۔ ایسا کونسا مردہ دل انگریز ہو گا کہ اس شہر میں کسی تقریب سے اس کا آنا ہو اور وہ اس مسجد کو دیکھنا نہ چاہے۔ یہاں تک تو کوئی حرج کی بات نہیں۔ مگر جب مسلمان جوتیاں پہن کر مسجد میں جانا اپنے مذہب کی توہین کا موجب خیال کرتے ہیں تو اگرچہ انگریزوں کے یہاں جوتی کا اتارنا خلاف تہذیب ہو، مگر اس میں ایک حرج ہے کہ یا تو دروازے میں سے دوربین لگا کر دیکھ لیا کریں یا جوتی اتار کر اندر چلیں پھریں۔ پھر یہ تو مسلمانوں کا حال ہے، ہندو تو کسی حالت میں دوسرے مذہب والے کا اپنے معابد میں جانا جائز نہیں رکھتے۔ مانا کہ عمدہ اور مشہور عمارتوں کا دیکھنا ایک طبعی شوق ہے، مگر شوق کے لیے دوسروں کی دل آزاری کیا ضروری ہے؟ میں نے ایک مسلمان کے روبرو ایک بار عذر پیش کیا تھا تو اس نے کیسا معقول جواب دیا کہ کیوں صاحب آج کو تو عمارت کے دیکھنے کا شوق ہے کل کو اگر کسی کو شوق ابھرا کہ دیکھیں ان کی عورتیں گھروں میں کیوں کر اٹھتی بیٹھتی ہیں تو کیا یہ لوگ ہمارے زنان خانوں میں گھسیں گے؟

بات یہ ہے کہ معاملہ پڑا ہے ناوانوں کے ساتھ۔ اگر ان کی دلجوئی مدنظر ہو تو ہزار تدبیریں ہیں اور اگر سرے سے کچھ حقیقت ہی نہ سمجھو اور ان کی رضامندی نارضامندی کا خیال ہی نہ کرو جیسا کہ ہوا، تو پھر عذر کی شکایت کیا۔ ہندوستانیوں کو حقیر سمجھنا اور ان کی خوشی ناخوشی کی مطلق پروا نہ کرنا، یہ رنگ نہ صرف عہدہ داران انگریزی کی مدارات بلکہ خود گورنمنٹ کے تمام کاموں میں بھی جھلکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ گورنمنٹ کی نیت بخیر ہے، اور وہ رعایا کو ہر طرح سے آسودہ اور خوشحال رکھنا چاہتی ہے، مگر وہ دیکھتی ہے اپنے عہدیداروں کی آنکھوں سے اور سنتی ہے انہی عہدیداروں کے کانوں سے جن کو رعایا کا حال گورنمنٹ پر منکشف نہیں ہونے پاتا۔ میں اس بات کو مانتا ہوں کہ سارے ہندوستان میں اس سرے سے اس سرے تک کوئی شخص ایسی معلومات اور لیاقت و دیانت کا نظر نہیں آتا کہ گورنمنٹ اس کو رعیت کا وکیل سمجھ کر اس سے مشورہ لے اور اس کی بات پر اعتماد کرے۔ جن لوگوں پر وجاہت اور تمول کے اعتبار سے نظر پڑتی ہے، مثلاً ہندوستانی رئیس، اکثر مٹی کے تھوے ہیں، جن کو اتنا بھی معلوم نہیں کہ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں۔ پس ان کا عدم اور وجود دونوں برابر۔ اگر یہ لوگ گورنمنٹ انگریزی کو صلاح دینے کی قابلیت رکھتے ہوتے تو اپنی ہی ریاستوں کو درست نہ کرتے زیادہ نہیں، گنتی کے چند رئیس کچھ سمجھدار بھی سنے جاتے ہیں۔ وہ شاید کم فرصتی کا حیلہ کریں اور اصل بات یہ ہے کہ ان کو گورنمنٹ انگریزی کی مدد کا شوق کیوں ہونے لگا اور مانا کہ شوق ہو بھی تو کونسل کے خرانٹ تجربہ کار ممبروں کے ساتھ بحث کرنے کو بڑی لیاقت چاہیے۔ پس گورنمنٹ کی وہی مثل ہے کہ طفل بہ مکتب نمی رود ولے بر بندش۔ کسی ہندوستانی رئیس کو زبردستی لے جا کر کونسل میں بٹھا دے تو وہ بے چارہ سوائے اس کے ٹکر ٹکر بیٹھا دیکھا کرے اور بے فائدہ لوگوں کی نظر میں خفیف ہو، کیا کر سکے گا۔ کونسل میں ممبر ہیں کہ باہم رد و قدح کر رہے ہیں، اور یہ سمجھتا بوجھتا خاک نہیں۔ اسی سوچ میں ہے کہ لاٹ صاحب کس کے لے پر رہیں۔ آخر جب ادائے رسم کے طور پر اس سے پوچھنے کی نوبت آئی تو لاٹ صاحب کی ہاں میں ہاں ملا کر اپنا پیچھا چھڑا کر الگ ہو گیا۔ اب رہ گئے وہ لوگ جنھوں نے انگریزی کالجوں میں تعلیم پائی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستانیوں میں سے اگر کسی میں مشیر گورنمنٹ ہونے کی صلاحیت ہے تو ان میں ہے جو انگریزی جانتے ہیں۔ اپنے ملک کے حالات سے بھی واقف ہیں۔ خیالات بھی روشن اور وسیع ہیں۔ آزادی اور قومی ہمدردی کے بھی لمبے چوڑے دعوے ہیں۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ انگریزی گورنمنٹ کی ماہیت اور اس کی منشا کو خوب پہنچے ہوئے ہیں۔ مگر نقص سے یہ گروہ بھی خالی نہیں۔ اول تو یہ لوگ، چھوٹا منہ بڑی بات، انگریزوں کے ساتھ مساوات کا دم بھرتے ہیں اور اسی وجہ سے انگریزوں کی نظر میں کھٹکتے ہیں۔ دوسرے چونکہ خود انگریزوں کی قوم کے نہیں، ان کے حقوق پر

بالکل نظر نہیں کرتے اور ان سے منصفانہ صلاح کی توقع نہیں۔ لیکن بایں ہمہ غایت مانی الباب یہ کہ اس راہ میں چند مشکلات ہیں تو کیا مشکلات پر نظر کر کے وہ راستہ چھوڑ دیا جائے گا جس میں چلنا ضروری ہے؟ اگر شروع سے گورنمنٹ نے اس کا خیال کیا ہوتا تو آج کو یہی ہندوستانی رئیس جن کو میں ننگ ہندوستان کہتا ہوں، یہاں کی کونسل تو خیر ولایت کی پارلیمنٹ کے قابل ہوتے۔ لیکن گورنمنٹ نے ان ہندوستانی ریاستوں کے بارے میں بڑی غلطی کی۔ ان کو شتر بے مہار کی طرح مطلق العنان رہنے دیا کہ پیٹ بھر کر بگڑیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ان ریاستوں کی خرابی کو گورنمنٹ اپنے استحکام کا موجب سمجھتی ہے۔ اب فرض کیجئے کہ ہم ان رئیسوں کو کونسل میں بٹھانے لگیں تو شروع شروع میں ان کی کاروائی ضرور بالکل ویسی ہی ہوگی جیسی تھوڑی دیر ہوئی میں نے بیان کی۔ لیکن اگر ہم چندے صبر کریں تو آخر ان رئیسوں کے حق میں تو یہی کونسل کافی ہے۔ علیٰ سبیل البدلیت سب کو کونسل میں بٹھایا جائے اور پھر ایسا چکر بندھے کہ مثلاً ہر پانچویں برس کونسل میں حاضر ہونے پر مجبور کیے جائیں۔ پھر دوسری ہی نوبت میں دیکھیے کہ ان کی حالت میں کس قدر ترقی ہوتی ہے۔ غرض گورنمنٹ کا یہ رنگ کہ وہ ملک کا انتظام رعایا کی رائے پر کرنا چاہتی ہے، ہندوستان کی گورنمنٹ میں تو ہے نہیں۔ ہندوستانیوں کی قسمت کی ڈس پائنگ گورنمنٹ سدا سے تھی، اب بھی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے اپنی گورنمنٹ تھی، اب اس پر اجنبی مسلط ہیں ہمیشہ سے ہندوستان سارے جہان میں بدنام ہے کہ اس میں چاندی سونے کی ندیاں بہتی ہیں اور اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ یہ ملک زرخیز اور سیر حاصل ہونے میں روئے زمین پر اپنا نظیر نہیں رکھتا۔ لیکن ایشیائی شاعر نے ہندوستانیوں کے حسب حال کیا اچھا کہا ہے۔

تہی دستان قسمت راچہ سود از رہبر کامل
کہ خضر از آب حیواں تشنہ می آرد سکندر را

اگر آپ صبر اور توجہ سے سننا چاہیں تو قبل اس کے کہ میں اپنی جگہ پر بیٹھوں، میں آپ صاحبوں کو اس کا یقین کرا دوں گا کہ ہندوستان کی رعایا پہلے کی نسبت بہت سقیم الحال ہو گئی ہے اور یوماً فیوماً سقیم الحال ہوتی چلی جا رہی ہے۔ ذرائع معاش کے اعتبار سے ہندوستان کے لوگ چار طرح کے ہیں۔ اول کسان، دوم اہل حرفہ، سوم نوکری پیشہ، چہارم تجارت پیشہ۔ کسان کی قسم میں تعلقہ دار سے لے کر ہواہے تک، زمیندار، کاشتکار باقسامہم سب داخل ہیں جو زمین سے معاش پیدا کرتے ہیں۔ انگریزی عملداری سے پہلے نہ کوئی رقبے کی پیمائش کرتا تھا اور نہ اقسام زمین دیکھتا تھا، پچھلی جمع پر نظر کر کے یا بہت سیانپت کی تو سرسری طور پر صورت حال دیکھ کر گاؤں پیچھے اٹکل پچو ایک جمع ٹھہرا دی۔ چھٹی پائی۔ اس کے ہزاروں لاکھوں تحریری ثبوت موجود ہیں کہ

ہندوستانی گورنمنٹوں میں طرح طرح کے ظلم ہوتے تھے مگر سرکاری مالگزاری کے بارے میں ہمیشہ الٹی سرکار ہی مظلوم تھی۔ زمیندار لوگ کار پرداز ان سرکاری کے ساتھ سازش کر کے جمع کم کراتے چلے جاتے۔ پھر جمع کے وصول کا یہ حال تھا کہ شاذ و نادر کوئی بھلا مانس زمیندار وقت پر دیتا ہو گا۔ دو دو چار چار برس کی باقی داری تو ایک بات تھی۔ جب باقی بہت بڑھ جاتی تھی تو آخر کو آدھی تہائی پر فیصلہ ہوتا تھا رہے کاشتکار، ان کو تو یوں سمجھو کہ گویا سرکار کی رعیت ہی نہ تھے۔ ان کا نیک و بد، نفع و نقصان، سب بااختیار زمیندار۔ مگر چونکہ زمیندار کا اپنا مفاد تھا۔ ہر زمیندار کاشتکاروں کو اپنی دولت سمجھتا تھا۔ ضرورت پڑنے پر تخم و تقاوی سے اس کی مدد کرتا تھا۔ خرید مویشی اور شادی بیاہ تک کے لیے اس کو قرض دیتا۔ پھر نقدی لگان کا دستور نہ تھا۔ فصل پک کر تیار ہوئی، زمیندار کاشتکار دونوں نے آپس میں غلہ بانٹ لیا۔ کم ہوا تو کم اور زیادہ ہوا تو زیادہ۔ نہ حجت نہ تکرار۔ اللہ اللہ خیر سلا۔

یہ خلاصہ ہے ہندوستانی سرکاروں کے انتظام مالگزاری کا۔ اب گورنمنٹ انگریزی کے انتظام کو دیکھنا چاہیے کہ اول تو مزروعہ افتادہ بنجر، چپے چپے زمین کی پیمائش کرائی۔ پھر مٹی کی ذات اور کھاد اور آبپاشی کے لحاظ سے کھیت کھیت کی حیثیت، دریافت کیا اور پھر کاغذات دیہی اور لوگوں کی گواہی اور ذاتی تجربے سے یہاں تک تحقیق کیا کہ اس کھیت میں یہاں تک پیداوار کی قابلیت ہے۔ اس پر جزرسی کے ساتھ گاؤں کی نکاسی نکال کر کہنے کو آدھ اور واقع میں اچھا خاصا کسا ہوا اور تہائی حق سرکار ٹھہرا دیا اور اتنی کاوش پر بھی ہمیشہ کے لیے نہیں بلکہ غایت درجے صرف تیس برس کے لیے کہ اتنے میں زمیندار پھر کچھ پنپیں گے تو پھر نچوڑیں گے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سرکار اپنا حق واجب نہ لے۔ اس نے پیمائش اقسام زمین وغیرہ کی تحقیقات سے اپنے مطالبے کے ٹھہرانے میں اگر احتیاط کی تو ٹھیک کیا، درست کیا۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ رعایا اور سرکار کا تعلق من وعن بندے اور خدا کا تعلق ہے۔ یہاں انصاف سے کام نہیں چلتا بلکہ رحم و رعایت سے۔ سرکار کو قرار داد جمع میں ایک سود خوار بنیے کی طرح دمڑی دمڑی اور ادھی ادھی کا حساب نہیں کرنا چاہیے تھا۔ خصوصاً ایسی رعایا کے ساتھ جو پچھلی سلطنتوں میں کار پردازان سلطنت کی نمک حرامی یا بددیانتی یا خود سری اور چالاکی سے چٹکی کی طرح سرکاری مالگزاری ادا کرنے کی خوگر رہی ہے پھر بندوبست کا معیادی ہونا گروہ زمینداران کی سخت بے دلی کا موجب ہے۔ اور اگر سچ پوچھیے تو ملکی ترقی کا مانع کوئی رعایا کیسی ہی سرکار کی خیر خواہ اور اطاعت گزار کیوں نہ ہو کیوں پسند کرے گی کہ محنت کرے وہ لاگ لگائے وہ، اور جب زمین کی حیثیت درستی پر آئے تو سرکار محاصل میں سے آدھا تقسیم کرانے کو آموجود ہو۔ پچھلی سلطنت میں ہر گاؤں بجائے خود ایک چھوٹی سی ریاست تھا۔ اب سرکار انگریزی کے انتظام مالگزاری نے زمینداروں کو ایسا مجبور و بے دست و پا کر دیا ہے

کہ اکثر صورتوں میں زمینداری ایک مصیبت ہو گئی ہے۔ سرکار نے کاشتکاروں کے لیے ایسے حقوق تسلیم کر لیے ہیں کہ زمینداروں کا کاشتکاروں پر ذرا بھی دباؤ باقی نہیں رہا۔ زمیندار کسی کاشتکار کو کھیت سے بے دخل کرنا چاہے' کیا مقدور۔ کھیت کی پیداوار کو اٹھانا چاہے' کیا طاقت' سختی اور تنگ طلبی کے ساتھ لگان وصول کرنا چاہے' کیا مجال۔ سرکار اپنا لینا عین وقت پر زمیندار سے لیتی ہے۔ اور جو زمیندار کو کاشتکار سے پانا ہے اس کے لیے حکم ہے کہ نالش کرو۔ ڈگری جاری کراؤ۔

خلاصہ یہ ہے کہ سرکار کے انتظام مالگزاری نے زمینداروں اور کاشتکاروں میں ہمدردی اور معاونت کی جگہ عداوت اور کشمکش پیدا کر دی ہے۔ اب وہ اگلے دیہی جتھے ٹوٹ پھوٹ کر گھر گھر چودھری اور کھیت کھیت زمیندار ہو گئے ہیں۔ نہیں جانتا کہ آپ لوگوں میں اس طرح کی کوئی کہاوت ہے یا نہیں۔ مگر میں یقین کرتا ہوں ضرور ہو گی۔ عربی میں تو ایک مشہور مثل ہے **الاتفاق قوۃ** پس ہر ہر گاؤں اگر اگلی سی زمینداری ہو تو اپنی اپنی بساط کے موافق ایک قوت ہے۔ اور ان کا مجموعہ ایک بلا کا زور ہے' ناممکن المقاومت۔ یہ اگر گورنمنٹ کا معاون ہو سکے تو میں نہیں خیال کر سکتا کہ گورنمنٹ کو روپے کی' سپاہ و آلات حرب کی' اعوان و انصار کی' کسی قسم کی دوسری قوت درکار ہو' لیکن گورنمنٹ نے' بجائے اس کے کہ اس قدرتی خداداد زور سے فائدہ اٹھائے' اسکو ضائع اور معدوم کر دیا۔ اس بارے میں گورنمنٹ کی عقل اس جوگی کی عقل سے کچھ زیادہ تعریف کی مستحق نہیں جو اپنے ہاتھ کو خشک کر ڈالتا ہے' اس خیال سے کہ وہ شاید اس ہاتھ سے کسی گناہ کا مرتکب ہو۔ زمیندار تو اس وجہ سے گرے کہ ان کو گورنمنٹ نے قصداً" گرا دیا' رہ گئے عام کاشتکار وہ سدا سے اس بات کے خوگر تھے کہ زمیندار ان کو انگلی پکڑا کر لے چلے تو آگے کو پاؤں اٹھائیں۔ اب وہ زمیندار تو ہوا دست بردار۔ ان میں کھڑا رہنے کا بوتا نہیں' یہ بھی گرے اور اس بری طرح سے گرے کہ سرکار نے ان کو اپنے پندار میں گڑھے میں پڑا ہوا دیکھ کر باہر نکالا۔ یہ جو لڑکھڑائے' دھڑام سے کنوئیں میں زمیندار ان کو دباتے بھی تھے' ستاتے بھی تھے' مگر یہ بھی نہیں دیکھ سکتے تھے کہ بگڑ جائیں' اجڑ جائیں۔ اب ان کا پالا پڑا بلیوں سے' ساہوکاروں سے' مہاجنوں سے' جن کا دھرم یہ ہے کہ ان تلوں کو پیلیے جہاں تک پیلا جائے اور پھر ان کی کھلی کو سانی والوں کے ہاتھ بیچ کر کوڑے سیدھے کیجئے۔ اب کاشتکاروں کا حال کیا ہے کہ ہزار میں شاید دو چار بچے ہوں تو خبر نہیں ورنہ سب کے سب گویا مہاجنوں کے مزدور ہیں۔ اتنا نہیں کہ کسی کے گھر سے وقت پر بیج نکل آئے۔ کھیت میں ہزار نعمتیں کیوں نہ پیدا ہوں' ان کی اور ان کے بال بچوں کی تقدیر کا ساداں کو دوں جو بنی اسرائیل کے من و سلویٰ کی طرح ستو باندھ کر پیچھے پڑا ہے۔ کیا مجال کہ کبھی ناغہ ہو لے۔ ایک دفعہ مہاجن کو پھر جانا شرط ہے۔

غرض جتنے کسان پیشہ ہیں' کیا زمیندار کیا کاشتکار' سب تباہ اور خستہ حال ہیں۔ چونکہ سرکاری مالگزاری وقت مقررہ پر وصول ہو ہی جاتی ہے۔ سرکار سمجھتی ہے کہ انتظام مالگزاری اچھا ہے۔ زمیندار کاشتکار مقدور والے ہیں۔ رعایا کا اصلی حال سرکار پر منکشف ہو بھی تو کیونکر ہو۔ جو شخص ایسی فریاد کو سرکار کے کان تک پہنچا سکتا ہے' ہو نہ ہو یورپین ہی حاکم ضلع ہو۔ ہندوستانی حاکموں میں سے نہ کسی کی ایسی وقعت اور نہ کسی میں اتنی جرات۔ رہا حاکم ضلع' وہ حتی الوسع سوتی بھڑوں کو کیوں جگانے لگا۔ اگر وہی مجوز جمع بھی ہے تو پہلے اس کو اپنی غلطی کا اعتراف کرنا ضرور ہو گا اور معمولی حالتوں میں انسان سے ایسی توقع کرنی فضول ہے۔ اور وہ مجوز جمع نہ بھی ہو' تاہم محصل تو چاروناچار ضرور ہو گا۔ وہ جوش اظہار کارگزاری میں وصول جمع کو ملتوی یا موقوف کر نہیں سکتا اور پھر تخفیف جمع کی تحریک کرنا بیٹھ بٹھائے ایک جواب دہی کا مول لینا ہے گورنمنٹ ایسے مین میکھ نکالتی ہے (اور اس کا حق بھی ہے) کہ اس کا رضامند کرنا ایک مصیبت ہے' یہ ہے خلاصہ ہمارے انتظام مالگزاری کا جو کم سے کم دو ثلث رعایا پر موثر ہے۔

اہل حرفہ کی کیفیت کسانوں سے کہیں بدتر ہے' یہ سچ ہے کہ گورنمنٹ ان کے حال سے کمتر تعرض کرتی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ نہیں کرتی۔ مگر یورپ کی کلوں نے ان کو مار پٹسڑا کر دیا ہمارے دیکھتے دیکھتے بہت سے عمدہ اور دریافت کے پیشے معدوم ہو گئے اور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اب کہاں ہیں وہ ڈھاکے کی ململ' بنارس کے مشروع' اورنگ آباد کے کمخواب' بیدر کے برتن' کالپی کے کاغذ' کشمیر کی شالیں' لاہور کے ریشمی جوڑیے؟ اہل یورپ کیا اس پر کاربند ہیں کہ جس چیز کی مانگ ہندوستان سے ہوئی' بنائی اور بھیج دی؟ نہیں۔ وہ لوگ رات دن اس ٹوہ میں لگے ہیں کہ ہندوستان میں کیا کیا چیز ہوتی ہے اور وہ انسان کے کس مصرف کی ہے اور اس ملک کے لوگوں کو کیا درکار ہے۔ ہندوستان سے ہر طرح کی پیداوار ولایت ڈھلی چلی جاتی ہے۔ کچھ یورپ میں کھپی اور کچھ ہندوستانیوں کے مصرف کی بن کر الٹی آ گئی۔ ہندوستانی اہل حرفہ تھکے تو یوں تھکے کہ یہ جو کچھ کریں اپنے ہاتھ پاؤں سے اور انسان کی قوت کا اندازہ معلوم ہے۔ آٹھ پہر میں آخر وہ دم بھی لے گا' آسائش بھی کرے گا اور وہاں یورپ میں کلیں ہیں کہ سارے سارے دن' ساری ساری رات' بے تکان پڑی چل رہی ہیں۔ ہندوستانیوں میں کلوں کا ایجاد کرنا تو کجا ابھی تو کلوں سے کام لینے کے سلیقے کی بھی عمریں چاہئیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ ہندوستان کے اہل حرفہ کی تباہی خود انہی کی نادانی کی وجہ سے ہے۔ مگر ہندوستانی اس درجے کے جاہل اور کاہل ہیں کہ ان میں اپنی حالت کے درست کرنے کی گدی گدی خدا نے پیدا ہی نہیں کی۔ یہ تو گورنمنٹ سے چاہتے ہیں کہ لاد دو' لدا دو' لادنے والا ساتھ دو۔

یورپ کی تمام تر ترقی کا اصلی اور حقیقی سبب علوم جدیدہ ہیں اور اس زمانے میں تعلیم وہی

مفید ہو سکتی ہے جس سے یہاں کے لوگ ان علوم سے آگاہی بہم پہنچائیں اور ان کی طبیعتوں میں اس بات کا شوق پیدا ہو کہ واقعات کو سوچیں اور موجودات میں غور کریں۔ سو سررشتہ تعلیم کا اتنا اثر تو ضرور دیکھنے میں آتا ہے کہ لکھنے پڑھنے کا چرچا پہلے سے بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ جن لوگوں میں لکھنے پڑھنے کا دستور نہ تھا' وہ بھی اپنے بچوں کو پڑھانے لگے ہیں۔ بلکہ اس قسم کے لوگ بکثرت ہیں۔ انگریزی کا شوق بھی روبہ ترقی ہے اور شکر ہے کہ اگلی سی وحشت اور نفرت کا کہیں پتا نہیں۔ صرف مسلمانوں کو احمقانہ تعصب کی وجہ سے رکاوٹ ہے۔ وہ بھی عارضی چندہ روزہ۔ مگر اس تعلیم سے ملک کو فائدے کے عوض الٹا نقصان پہنچنے والا ہے۔ لوگ صرف نوکری کی طمع سے پڑھتے ہیں۔ نوکری ہی ان کے نزدیک پڑھنے کی غرض و غایت ہے۔ نوکری ہی کے لیے ان کو تیار بھی کیا جاتا ہے۔ اور ان کا مبلغ علم بھی وہیں تک ہے۔ مجھ کو حقیقت میں سخت حیرت ہے کہ اتنی نوکریاں کہاں سے آئیں گی۔ میں ایسا خیال کرتا ہوں کہ انگریزی عمل داری میں لکھنے پڑھنے کی اس قدر کثرت کچھ اس وجہ سے بھی ہے کہ سرکاری نوکری بلا امتیاز شریف و رذیل ہر ایک کو حاصل ہو سکتی ہے اور یہی سبب ہے کہ کمینوں میں علم کا رواج زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ پس اگر سچ پوچھیے تو سررشتہ تعلیم سے' جیسا کہ اب ہے ملک کا الٹا علاج ہو رہا ہے۔ ہم کو درکار تھے وہ علوم جو صنعت و حرفت کو ترقی دیں' اور اب لوگوں کو ایسی پٹی پڑھائی جاتی ہے کہ موروثی اور آبائی پیشوں اور حرفوں سے گریز اور نفرت کرتے ہیں۔ بلکہ انھوں نے اسی عار سے بچنے کے لیے پڑھنا اختیار کیا تھا۔

اب مجھ کو صرف تجارت پیشہ لوگوں کی نسبت کچھ کہنا چاہیے سو میں اس کو مانتا ہوں کہ انگریزی عملداری میں اس پیشے کے لوگوں کو کسی طرح کی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔ ان میں کسی طرح کا تنزل نہیں۔ مال کی آمد و شد میں یوما" فیوما" سہولت زیادہ ہوتی چلی جا رہی ہے۔ عدالت کی کارروائی لائق اطمینان ہے۔ تاجر کو اور کیا چاہیے؟ مگر تجارت کو چاہیے' سرمایہ' اور سرمائے ہی کا تو بڑا رونا ہے۔ پس یہ پیشہ ایک محدود پیشہ ہے جس کو ہندوستان میں صرف معدودے چند اختیار کر سکتے ہیں۔ ایک دوسرے حرفے اور صنعت کا کساد عین تجارت کا کساد ہے' اور میں ابھی تھوڑی دیر ہوئی ثابت کر چکا ہوں کہ ہمارے ملک کی صنعت پر اوس پڑتی چلی جاتی ہے۔ پس اسی نسبت سے تجارت میں بھی کمی ہے۔ سچ پوچھیے تو ساری تجارت اہل یورپ کی مٹھی میں ہے۔ اور میں ہندوستانیوں کو تاجر نہیں بلکہ تاجروں کا دلال سمجھتا ہوں۔ ولایت سے مال منگواتے ہیں۔ اس کے طفیل روپے پیچھے دھیلا دمڑی آپ بھی جھاڑ کھاتے ہیں۔

اس وقت تک میں نے رعایائے ہندوستان کو چار بڑے پیشوں پر تقسیم کر کے ہر ایک کی خستہ حالی کو اپنے پندار میں دلائل عقلی سے ثابت کیا۔ اب میں بہت نہیں گنتی کی چند باتیں بیان

کروں گا' جو بلا تخصیص کسی بھی پیشے کے عام ہندوستانیوں پر موثر ہیں اور ان کو کم و بیش ہندوستانیوں کے افلاس میں دخل ہے۔ ہندوستان کے لوگ عادتا" سادگی اور کفایت شعاری سے زندگی بسر کرنے والے ہیں۔ ان کے پاس اگر روپیہ ہو تو کھانے پینے کے ضروری مصارف کے بعد اس کا زیور اپنی عورتوں کو گھڑا دیتے ہیں۔ یا یوں کہو کہ اس کو اس پیرائے میں جمع رکھتے ہیں تو جس قوم میں عموماً سادگی اور کفایت شعاری کا دستور متوارث ہو' اس کے اکثر افراد اعلیٰ قدر مراتب سرمایہ دار ہونے چاہئیں' اور انگریزی عملداری سے پہلے ہم میں اکثر لوگ خوشحال تھے بھی۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ ادنیٰ اور اعلیٰ سب کے خرچ بڑھتے چلے جاتے ہیں اور اس کے چند در چند اسباب ہیں۔ اول یہ کہ تکلف اور آسائش اور نمود و نمائش کی نئی نئی چیزیں ولایت سے آکر رواج پاتی ہیں' اور زندگی کے لیے جدید ضرورتیں پیدا ہوتی جاتی ہیں۔ خرچ کے لیے اس کثرت سے موجبات ترغیب جمع ہو گئے ہیں اور ہوتے جاتے ہیں کہ انسان کیسا ہی جزرس کیوں نہ ہو' ہاتھ کو نہیں روک سکتا۔ مثلاً جہاں کہیں ریل جا رہی ہے' آمد و شد میں ریل کی وجہ سے اس قدر سہولت ہو گئی ہے کہ جو لوگ کبھی گھر سے باہر نکلنے کا نام نہیں لیتے تھے اب ذرا ذرا سی ضرورتوں پر چل کھڑے ہوتے ہیں۔ پھر ریل میں چلنا ٹھہرا تو کپڑوں کی گٹھڑی کو کون سنبھالتا پھرے؟ سب سے بھلا بیگ کپڑے اور ضروریات کی چھوٹی موٹی چیزیں بھر اوپر سے قفل لگا' مزے سے ہاتھ میں لٹکا لیا۔ پھر سفر کا نام سقر۔ دور جانا ہو یا نزدیک آخر روپیہ بھی تھوڑا بہت ساتھ رکھنا ہی پڑتا ہے۔ نیفے میں رکھو تو مشکل۔ ازار بند میں باندھو تو بدنما جیب کا بھروسا نہیں۔ بار بار بیگ کا کھولنا بند کرنا کیا ضرور۔ لاؤ' گلے میں لٹکانے کا چمڑے کا بٹوا خرید لیں۔ مدتوں کے لیے چھٹی ہوئی۔ لیکن کم بخت حقے کی کیا تدبیر کرنی ہو گی؟ سنا ہے کہ چلتی گاڑی میں لوگ چوری چھپے کوئلے سلگا کر اپنا کام کر لیتے ہیں۔ پر ایسے حقے میں کیا خاک مزہ ملتا ہو گا؟ سوکھا ہوا نیچا' خالی حقہ' اس پر گھبراہٹ کہ ایسا نہ ہو اسٹیشن آجائے۔ چرٹ سب سے اچھا کہ خاصی طرح دندناتے ہوئے پیتے چلے جا رہے ہیں۔ کسی کی مجال نہیں کہ ہوں تو کرے۔ اور ساتھ کے بیٹھنے والے بھی جی میں کہتے ہوں گے کہ ہاں بھئی' یہ بھی کوئی ہیں۔ پر چرٹ میں کڑک جانے کا بڑا عیب ہے۔ اور پھر کمبخت دھواں نہیں دیتا۔ سارا بکس لیں تو حفاظت سے رہے۔ بنچ کے نیچے کہیں بھی ڈال دو۔ کچھ پرواہ نہیں۔ چھوٹے سے چھوٹا دیسی چرٹوں کا بکس آٹھ دس آنے کو آئے گا کیا بڑی بات ہے راستہ تو آرام سے کٹے گا۔ ریل میں نکمے بیٹھے ہوئے اس سے بہتر دوسرا مشغلہ نہیں۔ حقے میں بڑا کھٹ راگ ہے۔ نیچہ' حقہ' چلم' توا' کوئلے' خدا کی پناہ! ایک آدمی کا بوجھ تو یہی ہو گیا۔ آدمی اپنے تئیں سنبھالے یا اتنے بکھیڑے کو لادے پھرے؟ چرٹ کے لیے صرف ایک ڈبیا دیا سلائی کی چاہیے ہو گی۔ سو حقے کی صورت میں رکھنی پڑتی۔ سڑک کے کنارے لڑکے بیٹھے ہوئے پکار رہے ہیں

"دمڑی ٹکے میں تین بکس۔" دمڑی تو اپنے منہ سے کہتا ہے ٹکے کے تین دے گا۔ ایک پیسے کا ڈیڑھ۔ یہ حساب تو ٹھیک نہیں بیٹھتا۔ ایک بکس لیں تو کوڑیاں باندھنی پڑیں گی۔ کام کی چیز ہے سیل بھی جائے تو جہاں دھوپ دکھائی' بارود کی طرح چھٹنے لگی۔ آؤ اکٹھے تین بکس لے لو۔ پڑے رہیں گے۔ پھر کام آئیں گے۔ یوں ضرورتوں کا سلسلہ ہے کہ چپکے چپکے یکے بعد دیگرے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اسی طرح ڈاک کے انتظام نے باہمی خط و کتابت کو اس قدر آگے بڑھا دیا ہے کہ کاتب اور مکتوب الیہ چاہے دونوں میں ایک بھی پڑھا ہوا نہ ہو اور کتنے ہی غریب کیوں نہ ہوں' زیادہ نہیں تو خیر مہینے کے مہینے ایک دوسرے کی خیر صلاح کی خبر لینی تو ضرور ہے

یہ میرے ہوش کی بات ہے کہ ہمارے ملک میں چھتری کو لازمہ امیری سمجھا جاتا تھا۔ اب یہاں تک نوبت پہنچی ہے کہ کسی بڑے بازار میں دھوپ کے وقت کھڑے ہو کر دیکھیے تو اس سرے سے اس سرے تک چھتریوں کا ایک سائبان تنا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں کیا اب ہمارے ملک میں موم کے آدمی پیدا ہوتے ہیں کہ دھوپ لگی اور پگھلے؟ مثلاً ایک کپڑے پر نظر کیجئے کہ اس کے ضروری ہونے میں کلام نہیں۔ ولایت سے قسم قسم کے وضعدار کپڑے بن بن کر چلے آتے ہیں۔ کہ خواہ مخواہ آدمی کا دل ان کے پہننے کو چاہتا ہے۔ اور چونکہ کلوں کی وجہ سے سستا بہت ہے' اکثر آدمی اس کی وضعداری پر فریفتہ ہو کر بلا ضرورت بھی بنا لیتے ہیں اور پھر اس کے استعمال میں بھی چنداں احتیاط نہیں کرتے۔ میں ایسا خیال کرتا ہوں کہ سویلیزیشن اور اسراف لازم و ملزوم ہیں۔ پس جس قدر ہندوستانیوں میں سولیزیشن کی ترقی ہو گی ضرور ہے کہ ان کا خرچ بڑھے۔ اگر اسی نسبت سے ہندوستانی اپنی آمدنی بھی بڑھا سکتے تو کچھ پروا کی بات نہ تھی۔ مگر آمدنی الٹی گھٹ گئی ہے اور خرچ کی زیادتی ان کو اکھرا ہی چاہیے۔ عام لوگ جن کی معلومات کا دائرہ تنگ ہے اور جن کو سوچنے اور غور کرنے کی عقل نہیں' سب کے سب بالاتفاق کہتے ہیں کہ انگریزوں کی عملداری میں امن ہے۔ انصاف ہے زور نہیں۔ ظلم نہیں مگر خدا جانے کیا بات ہے اگلے وقتوں کی سی خیر و برکت نہیں۔ روپیہ ہے کہ ٹھیکری کی طرح سے اٹھا چلا جاتا ہے اور اس پر پیٹ کو روٹی ہے تو تن کو کپڑا نہیں' اور کپڑا ہے تو روٹی نہیں۔ اور ہو تو کہاں سے ہو' وہ اگلے سے سے ہی گئے گزرے ہوئے۔ بزرگوں کے عیش بزرگوں کے ساتھ گئے۔ یہ تو ہمارے ہوش کی بات ہے کہ ایک روپیہ کا غلہ ایک آدمی کے اٹھائے نہیں اٹھتا تھا۔ بھلا سے کا کچھ ٹھکانا نہیں۔ روپے کے چھ دھڑی گیہوں داؤدی صاف ستھرے۔ ساڑھے تین چار سیر کا دانہ دار خالص گھی۔ پانچ سیر کی سفید براق کھانڈ۔ بیس سیر کا گڑ تو دس دس من کے اپلے اور علی ہذا القیاس۔ اب جس چیز کو دیکھو آگ لگ رہی ہے۔ روپیہ ادھر بھنا ادھر ندارد۔ سبب کے ٹھہرانے میں غلطی ہو مگر سے کی شکایت بھی بے اصل نہیں۔ یہ بالکل سچ ہے کہ اگلی سی برساتیں نہیں ہوتیں۔ زمین ہے کہ جنگل اور

باغات کٹ کٹ کر برابر مزروعہ ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور علم طبعی میں یہ مسئلہ حد متیقن کو پہنچ گیا ہے کہ درخت بالخاصہ افراط بارش کے سبب ہوتے ہیں اور جنگلی علاقوں میں بارش کا بکثرت ہونا اس کا شاہد ہے پھر زمینداروں کو تشخیص جمع میں ایسا دھر کر کسا ہے کہ گاؤں کا سارا رقبہ ہر سال جوتا بویا نہ جائے تو سرکاری جمع گھر سے بھرتی پڑے۔ پس زمیندار بہ مجبوری زمین کو مطلق دم نہیں لینے دیتے۔ ان کا بس چلے تو ایک فصلی زمین سے دو اور دو فصلی سے چار فصلیں پیدا کریں یوں زمین بے دم اور کمزور اور اس کی قوت پیداوار گھٹتی چلی جا رہی ہے۔ جس کو عوام بے برکتی سے تعبیر کرتے ہیں۔

لوگ انگریزی عملداری کی نسبت ایسا بھی خیال کرتے ہیں کہ اس عملداری میں بے ایمانی سمیت پھیلتی جاتی ہے۔ لوگوں میں اگلی سی راست معاملگی نہیں رہی۔ نیتوں میں فساد' دلوں میں دغا' باتوں میں جھوٹ جس کا ضروری نتیجہ یہ ہے کہ بات بات میں لوگ ایک دوسرے سے لڑ پڑتے ہیں۔ جس عدالت میں جا کر دیکھو مقدمات کی یہ بھیڑ ہے کہ حاکم کو سر کھجانے کی فرصت نہیں۔ اور جہاں ایک دفعہ عدالت جھانکی اور جھگڑا سریش کی طرح چمٹا۔ اول تو ایک کے اوپر ایک عدالتیں ہی اتنی ساری ہیں کہ ان شیرے کے کھیتوں میں سے نکلنا مشکل۔ دوسرے وکیل' مختار' ایسے جھانسے دیتے ہیں کہ کیسا ہی سیانا آدمی کیوں نہ ہو' ان کے دھوکے میں آ ہی جاتا ہے۔ پھر عدالت کے انصاف کی نسبت لوگوں کی عام رائے ہے کہ جو جیتا وہ ہارا اور جو ہارا سو مرا۔ اور فی الواقع عدالتوں کی کاروائیاں اس قدر الجھی ہوئی ہوتی ہیں کہ اسٹامپ اور طلبانوں اور محنتانوں اور شکرانوں کے خرچوں کے مارے فریقین ادھڑ جاتے ہیں۔ یعنی عدالت میں مقدمہ جیتنے کے معنی یہ ہیں کہ جائیداد متنازعہ فیہ نذر خرچہ عدالت حقیقت میں کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب قاعدے قانون انسداد فساد کی غرض سے جاری کیے جاتے ہیں اور نتائج دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا قانون باعث فساد ہے۔

میرے ایک دوست ایک ہندوستانی ریاست میں نوکر ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا تھا۔ کہ کیوں صاحب' آپ کے یہاں عدالتوں کا چنداں اہتمام معلوم نہیں ہوتا۔ اور قانون بھی آپ فرماتے ہیں ہمارے یہاں منضبط نہیں۔ پھر لوگ کیا کرتے ہوں گے؟ انہوں نے جواب دیا کہ اول تو ہماری رعایا اس قدر جھگڑالو نہیں۔ کسی بات میں اختلاف ہوا بھی تو اکثر آپس میں رفع دفع کر لیتے' اور شاذ و نادر ہم تک فریاد لائے تو ذرا سی کوشش میں ایک دوسرے کے حلف پر حصر کر دیتے ہیں یا پنچایت پر راضی ہو جاتے ہیں۔ وہ اس بات کی تصدیق کرتے تھے کہ وہاں کے لوگ جھوٹ کم بولتے ہیں اور بڑے شدومد کے ساتھ کہتے تھے کہ میں پندرہ برس سے ایک بڑے علاقے کا عامل ہوں اور صدہا مقدمے میرے ہاتھ تلے آئے آج تک میری کان میں یہ بھنک نہیں پڑی کہ

کسی نے جھوٹا حلف اٹھایا۔ اگر عدالت کو لوگوں کے اخلاق کی کسوٹی نہ سمجھا جائے تو میں ایک دوسری دلیل پیش کرتا ہوں۔ شراب خوری کی کثرت۔ جو شخص اس چیز کو مذہباً" ممنوع نہ سمجھے اور وہ اعتدال کے ساتھ اس کا استعمال کرے تو مجھ کو اس پر طعن کرنا منظور بھی نہیں۔ میں اس موقع پر اتنا ہی ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ آیا تمول کے اعتبار سے ہندوستانیوں کی ایسی حالت ہے کہ ان کو شراب خوار بننے دیا جائے۔ جس سے آخر کار جواری، فضول خرچ، کاہل، عیاش، چور، ڈاکو اور انواع و اقسام کے امراض خبیثہ میں مبتلا ہو کر ایسی مصیبت مندانہ زندگی بسر کریں کہ عذاب ہوں اپنے حق میں اور سوسائٹی کے حق میں؟ یہ ہرگز اصول نہیں ہونا چاہئے کسی عاقل گورنمنٹ کا، اور خاص کر انگریزی گورنمنٹ کا جو عقل کے علاوہ ایک پاکیزہ مذہب بھی رکھتی ہے۔ اگر گورنمنٹ ایسی بری چیز کو جس کو ہمارے سچے پیغمبر ﷺ نے اور آپ کے نزدیک عرب کے بڑے رفارمر نے ام الخبائث کہا ہے، اور ہر ایک زمانے کے عقلا نے اس کی برائی اور ڈاکٹروں نے اس کے نقصانات پر اجماع کیا ہے، بند ہی نہیں بلکہ روک سکتی ہے تو گورنمنٹ بہ تقاضائے مصلحت ملکی کیوں اپنا سارا زور سختی کے ساتھ اس کے روکنے میں صرف نہ کرے؟

اب مجھ کو آپ صاحبوں کی سامعہ خراشی کرتے ہوئے بہت دیر ہو گئی اور میں ڈرتا ہوں کہ کہیں میں نے نوبل صاحب کی لذیذ ضیافت کو تو بے مزہ نہیں کر دیا۔ بات آپڑی اسباب غدر کی، اور یہ مضمون اس قدر وسیع ہے کہ ہر روز اگر اسی طرح کہا کروں تو کہیں ہفتوں میں جا کر ختم ہو تو ہو۔ تاہم میں نے اجمالی طور پر جس قدر بیان کیا، اس سے اتنی بات تو غالباً آپ صاحبوں پر ثابت ہو گئی ہو گی کہ انگریزی گورنمنٹ غدر سے پہلے تک ممدوح خلائق نہیں رہی۔ مجھ کو میرے ایمان نے اور گورنمنٹ اور رعایا دونوں کی سچی خیر خواہی نے اس کے ظاہر کرنے پر مجبور کیا۔ غدر سے پہلے تک مجھ کو انگریزی گورنمنٹ سے کسی طرح کا تعلق نہیں رہا اور سوائے اس کے کہ شہر میں رہتا تھا گورنمنٹ کا کوئی حق مجھ پر نہ تھا۔ مگر خدا کو یوں منظور تھا کہ مجھ سے نوبل صاحب سے ایک عجیب اور غیر متوقع طور پر معرفت ہو۔ میں نے صاحب کو اس افسوس ناک بے ہوشی کی حالت میں اگر لے جا کر اپنے گھر رکھا تو سوائے فرض انسانیت کے اور کوئی خیال باعث نہیں ہوا۔ اس وقت کوئی دور اندیش سے دور اندیش بھی نہیں سمجھ سکتا تھا کہ غدر کا انجام کیا ہو گا اور یہ اونٹ کب اور کس کروٹ بیٹھے گا مجھے خوب یاد ہے کہ جس وقت میں نے صاحب کو مردوں میں پڑا دیکھا، میرا دل بالکل بے قابو ہو گیا تھا۔ میں نے اس وقت اتنا بھی تو نہیں سوچا کہ ان کو لے جا کر کہاں چھپاؤں گا اور کیا انتظام کروں گا کہ کسی پر ان کا میرے گھر میں ہونا ظاہر نہ ہو۔ مگر نوبل صاحب کے بارے میں شروع سے آخر تک خدا کی قدرت کاملہ کے ایسے ایسے کرشمے دیکھے کہ بالکل عقل کام نہیں کرتی۔ پس سچ پوچھئے تو ان کو صرف خدا نے بچایا ہے اور میری یا کسی کی تدبیر

کو اس میں کچھ دخل نہیں۔ اگر ان کا بچنا خدا کی اور خدا کی قدرت کی دلیل نہیں ہے تو میرے نزدیک پھر دنیا میں کوئی چیز کسی چیز کی دلیل نہیں۔ مجھ کو جہاں تک نوبل صاحب کے بچانے سے تعلق ہے، وہ میری نظر میں اس قدر بے حقیقت ہے کہ مجھ کو اس کا تذکرہ کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ یہ صرف نوبل صاحب کی کریم النفسی تھی کہ انہوں نے ایک ذرا سی بات کو اس قدر رونق دی۔ اگر نوبل صاحب کی خاطر سے میں اس کا قابل قدر ہونا تسلیم بھی کروں تو نوبل صاحب اپنی ذات سے اس کا دو چند، چار چند اور اس سے بھی زیادہ معاوضہ ادا کر چکے ہیں۔ پس گورنمنٹ نے مجھ کو جاگیر دی، نوکری دی، صرف احسان ہے۔ بلا سابقہ استحقاق اور اگر اتنے بڑے احسان کو خالی شکر گزاری کے ساتھ قبول کر لوں تو اس کے معنی ہوں گے کہ بے استحقاق کے علاوہ نااہلی کا الزام بھی اپنے اوپر لوں۔ جونہی مجھ کو نوبل صاحب سے معلوم ہوا کہ گورنمنٹ میرے ساتھ سلوک کرنے والی ہے، مجھ کو سوچ پیدا ہوئی کہ میں اس کے معاوضے میں گورنمنٹ کی کون سی خدمت کروں گا۔ نہ تو میرے پاس مال ہے کہ گورنمنٹ کی نذر کروں، نہ میرا پیشہ سپہ گری ہے کہ میں اپنا سر گورنمنٹ کے لیے کٹوا دوں، تب میں نے خیال کیا کہ میرے پاس دل ہے۔ پس میں آپ سب صاحبوں کے روبرو اس بات کو ظاہر کرتا ہوں کہ میں اپنا دل گورنمنٹ کی نذر کر چکا۔ خدا نے چاہا تو میری تمام عمر اسی میں بسر ہو گی کہ جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا گورنمنٹ کی فلاح میں، گورنمنٹ کے قیام و ثبات میں، گورنمنٹ کے عام پسند ہونے میں کوشش کرتا رہوں گا۔ اے خدا! تو میرا مددگار رہ!

میں نے اپنی کاروائی کا منصوبہ ذہن میں ٹھہرا لیا ہے اور میں آپ صاحبوں کی اجازت سے مجملاً" اس کو بیان کرنا چاہتا ہوں۔ مجھ کو ابتدائے شعور سے تاریخ اور اخبار کا بہت شوق رہا ہے۔ اگرچہ اس سے تھوڑی دیر پہلے میں نے گورنمنٹ کے انتظام پر سختی سے نکتہ چینی کی ہے، بایں ہمہ میں اقرار کرتا ہوں کہ انصاف میں، انسانی ہمدردی میں رعایا کے مہذب بنانے میں، ملک کی فلاح و بہبود میں، ملک کی ترقی میں، دنیا کی کوئی گورنمنٹ، انگریزی گورنمنٹ کو نہیں پاتی۔ انگریزی گورنمنٹ میں جو نقصان ہیں، عملی قسم کے ہیں ورنہ اس گورنمنٹ کے اصول ایسے عمدہ ہیں کہ ان سے بہتر نہ کبھی ہوئے اور نہ اب روئے زمین کے کسی حصے میں ہیں۔

میں انگریزی گورنمنٹ کو ہندوستان کے حق میں خدا کی بڑی رحمت اور برکت سمجھتا ہوں۔ پس میری تمام ہمت اس میں مصروف ہو گی کہ رعائے ہندوستان اس رحمت اور برکت سے پورا پورا فائدہ اٹھائے۔ انگریزی گورنمنٹ میں جتنے نقصان ہیں، آخر کو سب کا یہی ایک سبب جا کر ٹھہرتا ہے کہ حاکم و محکوم میں اختلاط نہیں اور ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف نہیں۔ میں نے اس پیرائے میں گورنمنٹ کی خیر خواہی کا بیڑا اٹھایا ہے کہ حاکم و محکوم میں سے اجنبیت کو دور

کر دوں۔ رعایائے ہندوستان میں صرف مسلمانوں کو میں اس قابل سمجھتا ہوں کہ گورنمنٹ کو ان کی تالیف و استمالت کی سردست بہت ضرورت ہے۔ کچھ تو اس سبب سے اور کچھ اس وجہ سے کہ میں خود مسلمان ہوں، میری کوشش مسلمانوں میں محصور رہے گی۔ میں مسلمانوں کے رگ و ریشہ سے واقف ہوں اور مجھ کو ہونا بھی چاہئے کیوں کہ مجھ کو خود مسلمان ہونے کا فخر حاصل ہے۔

میں بہت وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ مذہب اسلام میں کوئی بات ایسی نہیں جس کی وجہ سے گورنمنٹ مسلمانوں کی طرف سے نامطمئن ہو۔ ہمارے پیغمبر صاحب (ﷺ) کی زندگی میں دونوں طرح کے نمونے موجود ہیں۔ ان کی پیغمبری کی عمر میں سے آدھی سے زیادہ مغلوبی کی حالت میں گزری، جب کہ قریش مکہ صرف مذہبی مخالفت کی وجہ سے ان کو اور ان کے رفقاء کو جو ان پر ایمان لائے تھے، طرح طرح کی ایذائیں دیتے تھے اور فقط اس وجہ سے کہ یہ لوگ ایک خدا کو مانتے تھے اور بت پرستی کی مذمت کرتے تھے ان کو کعبے کے معبد گاہ عالم میں آنے سے روکتے۔ ان کو اپنے طور پر خدا کی عبادت نہ کرنے دیتے۔ ان کے ساتھ لین دین تک موقوف کر دیا تھا اور موقع پاتے تو ان پر دست درازیاں کرتے۔ اس حالت میں، جو مسلسل گیارہ برس تک رہی، پیغمبر صاحب ﷺ کی اپنے معتقدین کو برابر یہی تاکید تھی کہ خدا کی راہ میں دنیوی تکلیفات کو بہ امید فلاح عاقبت صبر کے ساتھ برداشت کرو۔ اور مذہب اسلام تھا کہ ان مزاحمتوں اور مصیبتوں میں اپنی صداقت کی وجہ سے چپکے چپکے ترقی کرتا رہا تھا۔ مسلمانوں نے ان تکلیفات سے عاجز آکر دوبار ترک وطن بھی کیا، جس کو ہجرت کہتے ہیں۔ پھر بھی لوگوں نے چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ اس اثناء میں مسلمانوں کا گروہ اتنا بڑھ گیا تھا کہ وہ اپنی حفاظت کر سکتے تھے۔ دوسری ہجرت کے دوسرے برس بدر کی مشہور لڑائی ہوئی جس سے اسلام کے غلبے کی ابتدا ہوئی۔ جزیرہ عرب میں مسلمانوں کی بہت سی فتوحات ہوئیں جن میں سب سے مشہور (جس نے تمام جزیرہ عرب کو رجس بت پرستی سے پاک کر دیا تھا) فتح مکہ تھی میں نے تاریخ میں صدہا فتح مند بادشاہوں اور جنرلوں کا بلاد مفتوح میں داخل ہونا پڑھا ہے۔ آگے آگے قتل اور پیچھے پیچھے لوٹ۔ اور ایک فتح مند پیغمبر ﷺ کا مکے میں داخل ہونا تھا جہاں کے لوگوں نے ان کے ساتھ ایذا دہی اور بے حرمتی کا کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا تھا کہ آپ کعبے میں تشریف رکھتے تھے اور شہر مکہ میں امن عام کی منادی ہو رہی تھی۔

غرض یہ ہے کہ اسلام فی نفسہ ایسا عمدہ مذہب ہے کہ ہارے درجے کی مغلوبیت اور اعلیٰ مرتبے کا غلبہ دونوں حالتوں میں اس کے پیرو صلح کاری کے ساتھ زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ مانا کہ انگریزی عملداری میں اسلام کو غلبہ نہیں مگر وہ اس قدر مغلوب بھی نہیں جیسا ہجرت سے پہلے

مکے میں تھا۔ بدون سلطنت کے جس قدر مذہبی آزادی ممکن ہے، مسلمانوں کو انگریزی عملداری میں پوری پوری حاصل ہے۔ بلکہ خود مسلمانوں کی عملداری میں بھی آزادی کا یہ رنگ نہیں۔ پس من حیث المذہب کوئی مسلمان کسی فرقے اور عقیدے کا کیوں نہ ہو، انگریزی عملداری کا شاکی ہو نہیں سکتا۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ہندوؤں کی دیکھا دیکھی کھانے میں، پینے میں، پہننے میں، نشست برخاست میں، چھوت بہت ماننے لگے ہیں۔ دوسرے ملکوں کے مسلمانوں کے تنزل کا جو کچھ سبب ہو، ہندوستان کے مسلمانوں پر تو ہندوؤں کے اختلاط نے بہت برا اثر کیا ہے۔

ہندوؤں میں رہ کر یہ بھی انہی کی طرح شکی، ڈرپوک، پست حوصلہ، گھر گھسنے، آرام طلب ہو گئے۔ مسلمانوں کا یہ عیب کہ انگریزوں سے پرہیز کرتے ہیں اور اس وجہ سے انگریزی عملداری کے بہت سے فائدوں سے محروم ہیں اور یوماً "فیوماً" مفلس ہوتے، بے وقعت ہوتے جاتے ہیں اور گورنمنٹ کو اپنی طرف سے بدظن رکھتے ہیں، یعنی مسلمانوں کی اتنی ہندویت تو انشاء اللہ میں رفع کر دوں گا۔ مسلمانوں کا مذہب جدید العہد ہے اور ابھی اس کی اصلیت دوسرے مذہبوں کی طرح معدوم نہیں ہوئی۔ پس مجھ کو اپنی کوشش میں ہر طرح کامیابی کی امید ہے۔ میں جانتا ہوں نصیحت کا بڑا موثر پیرایہ نمونے کا دکھا دینا ہے۔ سو میں نے یہ باتیں منہ سے نہیں نکالیں جب تک کہ میں نے خود اس وضع کو اختیار نہیں کر لیا، جس کو میں چاہتا ہوں کہ سب مسلمان اختیار کریں۔ میں نے آپ سب صاحبوں کے ساتھ ایک میز پر کھانا کھایا اور آپ کے روبرو میں انگریزی لباس پہنے کھڑا ہوں۔ اور میں یقیناً ویسا ہی مسلمان ہوں جیسا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ خود مسلمان جن کے مفاد کے لیے میں نے یہ وضع اختیار کی ہے، چھیڑ چھیڑ کر اور ہنس ہنس کر میری زندگی تنگ کر دیں گے۔ مگر ان کی چھیڑ جیسی ناچیز ہوگی، ویسی ہی بے ثبات بھی ہوگی۔ تقاضائے وقت اور تعلیم دو بڑے مددگار ہیں اور ان کی تائید سے مجھ کو پورا بھروسا ہے کہ بہت جلد ایک گروہ میری وضع کی تقلید کرے گا۔ اب میں اپنی تقریر کو طوالت کی معذرت پر ختم کرتا ہوں۔

فصل ۱۲

ابن الوقت کا منصوبہ اور لوگوں کی مخالفت

دنیا میں شاید قوم کی رفارم (اصلاح) سے زیادہ مشکل کوئی اور کام نہیں ہو سکتا۔ سوا بھی یہاں پوری رفام کا کیا مذکور ہے۔ پوری رفارم تو وہ تھی جس کا بیڑا ہمارے پیغمبر(ص) نے اٹھایا تھا۔ آپ معبوث ہوئے عرب میں جن سے بدتر اس وقت روئے زمین پر کوئی قوم نہ تھا۔ اس رفارم کے مقابلے میں کیا بے چارہ ابن الوقت اور کیا اس کی رفارم۔ وہی مثل ہے کیا پدی اور کیا پدی کا شوربا۔ اس کی اتنی ہی بساط تھی کہ اس کو آپ سوجھی اور نوبل صاحب نے بھی جھائی کہ انگریزی عملداری میں مسلمان بگڑتے چلے جاتے ہیں۔ یہ تھا ایک واقعہ جس کی سبب کی تفتیش کی تو معلوم ہوا کہ انگریزی عملداری میں مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ دریا میں رہنا اور مگرمچھ سے بیر۔ رعیت ہو کر بادشاہ سے نفرت۔ محکوم رہ کر حاکم سے گریز۔ یہاں تک ابن الوقت کی رائے نہایت درست تھی۔ اب اس نے قومی ہمدردی اور سرکاری خیرخواہی کے تقاضے سے چاہا کہ مسلمانوں کی وحشت اور اجنبیت کو دور کر کے حاکم و محکوم میں ارتباط و اختلاط پیدا کرا دوں۔ بس یہ ہے خلاصہ ابن الوقت کی رفارم کا۔ اس نے سوچا کہ معاملہ ہے قوی و ضعیف اور غالب و مغلوب میں۔ قوی اور غالب پر تو اثر کیسے ڈال سکوں گا' نزلہ بر عضو ضعیف مسلمانوں کو ترغیب دو کہ مماثلت سے' مشابہت سے' انگریزی سیکھنے سے' انگریزی تمدن اختیار کرنے سے' غرض جس ڈھب سے ممکن ہو انگریزوں کی طرف کو جھکیں۔ ابن الوقت کے حالات مابعد سے ظاہر ہو جائے گا کہ جو تدبیر اس نے اختیار کی غلط تھی یا صحیح' اور کہاں تک اس کو اپنے ارادے میں کامیابی ہوئی؟ ہم اس کو ابن الوقت کی کامیابی کی تمہید سمجھتے ہیں کہ سب سے پہلے اس نے آپ وہ طرز اختیار کر لی جس کو رواج دینا چاہتا تھا۔ اس نے غدر کے دنوں میں نوبل صاحب کی جان بچانے سے سرکار انگریزی کی خیرخواہی کی اور سرکار نے بھی اس خیرخواہی کا بدلہ دینے میں ایسی جلدی کی کہ برس کے اندر ہی اندر ابن الوقت جاگیردار بھی ہو گیا۔ ایک دم سے اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بھی ہو گیا۔ اب اس نے قوم کی خیرخواہی کا دم بھرا اور رفارمر بنا تو رفارمروں کو جو انعام ہمیشہ سے ملتا آیا ہے' اس کے لیے بھی تیار تھا۔ یعنی اگلے ہی دن سارے شہر میں غل تھا کہ ابن الوقت کرسٹان ہو گیا۔ انگریزوں کے ساتھ کھانا کھایا۔ انہی کی طرح کپڑے پہنے۔ افواہ کا قاعدہ ہے کہ لوگوں کے منہ بات پڑی اور ایک ایک

کی چار چار ہوئیں۔ کوئی یہ بھی کہہ دیتا تھا کہ میں نے اپنی آنکھوں سے ان کو انگریزوں کے ساتھ گرجا میں دیکھا۔ آخر نمازی کو گئے ہوں گے۔

دوسرا : ارے میاں' تم مسلمان ہو کر کہتے ہو کہ وہاں گئے ہوں گے؟ توبہ کرو' توبہ!

تیسرا : کیوں جی' پہلے سے تو ہم نے کوئی بات دیکھی کیا سنی بھی نہ تھی۔ یہ ایک دم سے ہوا تو کیا ہوا؟

دوسرا : خوب ایک نہ شد دو شد۔ تم شہر میں رہتے ہو اور اتنا معلوم نہیں (آگے کو جھک کر دبی زبان سے) کہ اس نے غدر میں ایک انگریز کو چھپایا تھا؟

تیسرا : چھپایا تھا تو چھپانے دو۔ اور بھی بہتیروں نے خیرخواہیاں کیں' مخبر بنے' لوگوں کے گڑے دبے مال نکلوائے' آپ کھڑے ہو کر گواہیاں دیں' پھانسیاں تک دلوائیں۔ خیرخواہی سے اور کرسٹان ہونے سے کیا تعلق؟

دوسرا : میاں' بات یہ ہے کہ دنیا کا لالچ بہت برا ہوتا ہے اور دنیا بھی ایسی کہ بس غدر تو اس شخص کو پھلا ہے۔ کسی بچے کی نکسیر تک نہیں پھوٹی۔ ایک پیسے کے مال کا نقصان نہیں ہوا۔ گوڑگانوے کے ضلع میں کسی بے چارے زمیندار کا کئی ہزار کا علاقہ اسی غدر کی علت میں ضبط ہوا تھا۔ وہ ملا۔ ڈپٹی کی نوکری پائی۔ ایک خیرخواہی میں تو اتنی ساری کرامت تھی۔

چوتھا : مگر ہوا بڑا غضب۔ ایسا عالم فاضل خاندانی آدمی کرسٹان ہو جائے اسلام کی بڑی بے عزتی ہوئی۔

دوسرا : اسلام کو خدا نے عزت دی ہے اور انشاء اللہ تاقیامت معزز رہے گا۔ اور علم و فضل کی کچھ نہ پوچھو۔ شیطان معلم الملکوت تھا۔ یعنی تمام فرشتوں کا استاد۔ پھر وہ علم اس کے کیا کام آیا؟

ہفتوں نہیں بلکہ مہینوں' جہاں دیکھو ابن الوقت ہی کا چرچا تھا۔ عوام نے تو ایک بات پکڑ پائی تھی۔ کرسٹان ہو گیا۔ کرسٹان ہو گیا۔ ان کے نزدیک انگریزوں کی ساتھ کھانا بلکہ انگریزوں کی طرح میز کرسی پر چھری کانٹے سے کھانا' انگریزی لباس پہننا' سب کرسٹان ہونے میں داخل تھا۔ ہندوستانی اخبار والوں کو مضمون کہاں نصیب ہو۔ ان کو ایک اچھا شغلہ ہاتھ لگا۔ ابن الوقت نے اگر شہر کا رہنا چھوڑ دیا نہ ہوتا تو لڑکوں کا اس کے پیچھے ہرا پیٹ دینا بھی کچھ تعجب نہ تھا۔ مگر شہر کے باہر چھاؤنی میں اتنی دور جاتا ہی کون تھا اور پھر انگریزوں کے ڈر کے مارے کسی کی ایسی جرات نہ تھی۔ مگر ہاں' کچہری میں ہر روز پچاس آدمی اس کو انگریزی لباس پہنے' انگریزوں کے ساتھ ٹفن کھاتے' چرٹ پیتے دیکھتے ہی تھے۔ شامت تو اگر سچ پوچھو تو ابن الوقت کے گھر والوں کی تھی کہ

ناحق لوگ ان کو آ آ کر چھیڑتے تھے اور یہ بے چارے ابن الوقت کے کارن مفت میں نکو بن رہے تھے۔ قاعدہ ہے کہ جب کسی قوم پر ادبار آتا ہے تو اس کے حرکات' سکنات' معاملات' خیالات' معتقدات' سبھی میں کمی آجاتی ہے۔ کیا خوب کہا ہے۔

ہر چہ گیرد علتے علت شود

مسلمانوں کو خدا نے کیسا عمدہ مذہب دیا تھا کہ اس کی بدولت عرب کے وحشی اونٹوں کے چرانے والے اس قدر تھوڑے عرصے میں' جس کی نظیر ساری دنیا کی تاریخ میں مفقود ہے' گویا تمام روئے زمین کے بادشاہ ہو گئے۔ پھر وہ مذہب سہل و سلیس ہونے کے علاوہ نظر غائر سے دیکھو تو اختیاری نہیں بلکہ فطری یعنی بہ عبارت دیگر اضطراری لازمہ انسانیت کہ کسی حال میں انسان سے منفک ہو ہی نہیں سکتا۔ پیغمبر اسلام کا خاتم النبین اور مرسل الی کافۃ الناس ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ دائرہ اسلام بہت وسیع ہے۔ اور پیغمبر صاحب کو کثیر الاتباع ہونے پر بھی ناز تھا۔ غرض ایک مسلمان تو قرون اولیٰ کے مسلمان تھے جن کی تمام ہمت تکثیر گروہ مسلمانان میں مصروف تھی یا ایک مسلمان ہمارے زمانے کے مولوی ہیں کہ بات بات پر لوگوں کو کافر یعنی اسلام سے خارج ٹھہرا دیتے ہیں۔ ابن الوقت تو ان کے نزدیک نرا کافر بھی نہیں بلکہ مجموعہ کفار تھا۔ حنفی' شافعی' سنی' شیعہ' وہابی' بدعتی' مسلمانوں کے جتنے فرقے ہندوستان میں ہیں' سب کے علماء نے قرآن کی آیتوں سے' حدیثوں سے' سند پکڑ پکڑ بالا جماع ابن الوقت کے کفر کے فتوے لکھ دیے۔ ایک فتویٰ تو خود ہماری نظر سے بھی گزرا۔ فتویٰ کاہے کو تھا' اچھا خاصا اقلیدس کا پہلا مقالہ معلوم ہوتا تھا۔ کیونکہ مربع' مستطیل' بیضوی' سب شکلوں کی مہریں اس میں تھیں اور پھر بعضی کف دست کے برابر چوڑی چکلی۔ طغرے کیسے کیسے پیچیدہ کہ ہمایوں کی بھول بھلیاں کی کیا اصل ہے۔ دلی کا فتویٰ اور دلی ہی کے علماء کی مہریں اور پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ کون سی کس کی مہر ہے۔ آخر نہ رہا گیا۔ پوچھنا ہی پڑا' کیوں صاحب' یہ خادم الشریعت الغراء والتملۃ البیضا المحمدیہ الحافظ الحاج الشیخ ابو الفضائل محمدن اسیر معین الدین الحنفی القادری الاویسی اسازند رانی ثم بخاری کون بزرگ ہیں؟

صاحب فتویٰ : آپ نے انہیں نہیں پہچانا؟ مولوی مونا جو موچیوں کی مسجد میں جمعے کے جمعے وعظ کہا کرتے ہیں۔ ہم بارے مولوی مونا صاحب کی مہر بھی فتوؤں پر ہونے لگی۔

صاحب فتویٰ : اجی حضرت' اگر ان کی مہر نہ کراؤ تو وعظ میں نام لے لے کر ایسی بے نقط سناتے ہیں کہ معاذ اللہ! مگر بے چارے ہیں صلح کل۔ اختلافی مسائل میں دونوں طرف والے مہر کرا لے جاتے ہیں۔ انکار نہیں کرتے۔

ہندوستانیوں کی یہ چھیڑ چھاڑ جو اکثر گلیوں کے قریب قریب ہوتی تھی' ابن الوقت کو بری تو

کیوں لگتی نہ ہو گی مگر ظاہر میں تو اس نے کبھی اس کا اعتبار کیا نہیں۔ ہمیشہ کراہت کے ساتھ ایک کان سے سنا اور حقارت کے ساتھ دوسرے کان سے نکال دیا۔ اگر ابن الوقت ایک دم سے کرشان ہو گیا ہوتا تو لوگ ایسے اس کے پیچھے نہ پڑتے۔ اس کے عزیز و قریب رو دھو کر اور ماؤ شاتک ہار کر' جھک مار کر' کبھی نہ کبھی چپ کرتے پر کرتے۔ مگر مشکل یہ تھی کہ ابن الوقت کا ظاہر حال بالکل انگریزوں کا سا تھا اور پھر وہ کہتا تھا کہ میں مسلمان ہوں۔ اس کی اسی بات سے مسلمان چڑتے تھے۔ نوبل صاحب کے ڈنر میں ملکی' فوجی' جتنے انگریز اس وقت دہلی میں تھے' سبھی تو موجود تھے۔ سب نے ابن الوقت کو دیکھا۔ حرف بہ حرف اس کی تقریر کو سنا۔ چند روز بعد ابن الوقت نے ساری چھاؤنی کو بڑا کھانا دیا۔ اس میں سب تو نہیں مگر جس جس سے نوبل صاحب کو زیادہ ربط تھا' چاروناچار آیا اور دو چار صاحب لوگ اور بھی آئے۔ بے تکلفی ہوتے ہی ہوتے ہوتی ہے۔ ایسا کہیں دیکھنے میں نہیں آیا کہ صاحب سلامت کے بعد ہی تپاک شروع ہو جائے۔ اور یہاں تو رکاوٹ کی بہت سی وجوہ تھیں۔ اول تو بالکل ایک نئی بات تھی۔ شروع عملداری سے آج تک ان اطراف میں کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا کہ کسی ہندوستانی نے انگریزی وضع اختیار کر کے برابری کے دعوے سے انگریزی سوسائٹی میں گھسنے کا ارادہ کیا ہو۔ راجا' نواب' بابو' بڑے بڑے عہدہ دار' انگریزوں سے ملنے کی سبھی کو ضرورت واقع ہوتی رہتی تھی' مگر اپنے ہندوستانی قاعدے سے ملتے تھے۔ سر پر پگڑی' شملہ' عمامہ' گلے میں قبا' چغہ۔ جاڑا ہو تو اوپر سے شالی رومال' اندر کمر بندھی ہوئی۔ اتوار اور کچہری کا وقت بچا کر سویرے سے جا موجود ہوئے۔ سواری کو احاطے کے باہر چھوڑا۔ چپڑاسی سے اطلاع کرائی منتظر طلب برآمدے میں بیٹھے۔ بلائے گئے جوتیاں دروازے کے باہر اتاریں۔ سامنا ہوا دور سے جھک کر سلام کیا۔ آہستہ سے مختصر طور پر مطلب کی دو باتیں کیں اور رخصت چاہی۔ صاحب کا سامنا کتراتے ہوئے باہر نکلے۔ اردلیوں' شاگرد پیشوں کا معمول دیا اور گھر کا رستہ لیا۔

ابن الوقت نے ملاقات کا ایک نرالا ڈھنگ نکالا کہ جب تک کوئی دوست معرفت نہ کرا دے وہ کسی انگریز سے ملتا ہی نہ تھا اور ملتا بھی تو کس طرح کہ گھوڑا ہے تو گھوڑا اور بگھی ہے تو بگھی دھر برآمدے میں۔ اردلی دور سے گھوڑے کی ٹاپ سن کر کارڈ کے لیے منتظر کھڑا ہے۔ چند قدم استقبال کر کے کارڈ لے' بھاگا ہوا اندر آگیا۔ آگے آگے اردلی پیچھے پیچھے ابن الوقت بس ہوئے تو صاحب خانہ سے برآمدے میں مٹھ بھیڑ ہوئی' ورنہ خیر' عین کمرے کے دروازے میں اور اگر صاحب خانہ اس میں مضائقہ کریں تو ابن اوقت سوار ہو' یہ جا وہ جا۔ پھر اوب قاعدے کی تو خبر نہیں۔ آنکھیں چار ہوتے ہی ایک ساتھ دونوں کے منہ سے نکلا۔ گڈ مارننگ۔ ہاؤ ڈو یو ڈو۔ ایک ساتھ ہاتھ بڑھائے' مصافحہ ہوا دونوں اندر داخل۔ معلوم نہیں کیا کیا باتیں ہوئیں۔ مگر زور سے

ہنسنے کی آواز تو برابر چلی آتی تھی۔ غرض ابن الوقت نے انگریزوں کے ساتھ برتاؤ ہی اس طرح کا شروع کیا کہ اکثر انگریز اس کے ملنے سے پہلو تہی سی کرتے تھے۔ پھر ابن الوقت میں زبان انگریزی کی بھی کوتاہی تھی۔ علاوہ بریں اس کا تعلق تمام تر انگریزوں ہی کے ساتھ تھا۔ ان وجوہ سے اس کو انگریزوں نے اپنی سوسائٹی میں لیا تو سہی مگر کشادہ دلی کے ساتھ نہیں۔ تاہم اس کا تعارف انگریزوں کے ساتھ آہستہ آہستہ بڑھتا چلا جاتا تھا' اور ہندوستانی بھائیوں کے حسد کے مشتعل کرنے کو اتنا کافی تھا۔ یہی وہ مخالفت تھی جو تمام عمر ابن الوقت کو ایذائیں دیتی اور اس کے اصل مطلب میں کھنڈت ڈالتی رہی۔

انگریزوں کو رشک و حسد کی کوئی وجہ نہ تھی۔ مگر ان میں بھی اکثر بہ زعم حکومت ابن الوقت کے سخت مخالف تھے۔ اس میں شک نہیں نوبل صاحب اس کے پورے طرف دار تھے۔ وہ شریف تھے۔ معزز عہدہ دار تھے۔ انگریزوں میں ان کی بڑی وقعت تھی۔ ان کی کارگزاری اور لیاقت گورنمنٹ کے نزدیک مسلم تھی اور سب سمجھتے تھے کہ ایک نہ ایک دن ان کو کوئی بڑا کام ملنے والا ہے۔ مگر آخر تھے تو ایک متنفس۔ ان کی مدد سے سرپرستی اتنا بھی کیا کم تھا کہ تمول اور تعزز کے اعتبار سے ابن الوقت کو حکام وقت سے ملنے کا حوصلہ ہوا اور انگریزوں کے ساتھ جو معرفت ہوئی وہ بھی انہی کی وجہ سے ہوئی۔ اگر نوبل صاحب کا قدم درمیان میں نہ ہوتا تو منہ سے رفارم کا نام نکالنا بھی مشکل تھا۔ غرض بہ نظر ظاہر جتنے اتفاقات مساعد کا جمع ہونا ممکن تھا' سب مہیا تھے۔ نوبل صاحب جیسا عالی رتبہ انگریز مربی اور سرپرست' خود ابن الوقت خیر خواہ سرکار' جاگیردار' اکسٹرا اسسٹنٹ' اپنے ہی شہر میں حاکم اور کام بھی بغاوت کی تحقیقات کہ ان دنوں کوئی حکومت اس کو لگا نہیں کھاتی تھی۔ زمینداری اور نوکری دونوں ملا کر آمدنی ایسی معقول کہ جس کی ایک ٹانگ انگریزوں کی طرح ولایت میں پھنسی ہوئی ہو جس شان سے چاہے رہے۔ پھر جیسی وضع سے رہنا چاہتا تھا بہ اعتبار شکل و صورت اس کے قابل اور مناسب بایں ہمہ ابتدا سے جو مزاحمتیں پیش آنی شروع ہوئیں تو آخر تک بے چارے ابن الوقت کو دم نہ لینے دیا۔

اور کوئی ہوتا تو ہجوم مخالفت سے گھبرا کر اس کو کبھی کا چھوڑ بیٹھا ہوتا' مگر ابن الوقت پرلے درجے کا مستقل مزاج آدمی تھا۔ مشکلات کو دیکھ کر اور دلیر ہوتا۔ وہ رنجیدہ ہوتا۔ افسوس کرتا۔ اس کو غصہ بھی آتا۔ مگر کبھی ایک لمحے کے لیے بھی اس کو خیال نہیں ہوا کہ جو وضع اختیار کی ہے' اس کو چھوڑ دوں یا جس رفارم کا بیڑا اٹھا چکا ہوں اس کے رواج دینے میں کوتاہی کروں۔ شروع میں مذہب بحث ابن الوقت کے پروگرام سے بالکل خارج تھی۔ مگر مسلمانوں نے چھوٹتے ہی اس سے مذہبی چھیڑ نکالی' جس سے ابن الوقت کو یہ خیال ہوا کہ مذہب ہی نے مسلمانوں کو بنایا اور مذہب ہی ان کو بگاڑ رہا ہے۔ بے مذہب کے یہ ٹکرا تو توڑتے ہی نہیں تاوقتیکہ ان کے دین

میں دست اندازی شروع نہ کی جائے یہ بحث اگر اسی حد تک رہتی جہاں تک ابن الوقت کو اپنی رفارم میں اس کی ضرورت تھی تو چنداں حرج نہ تھا مگر بحث کا نام آیا اور طرفین سے کٹھ حجتی شروع ہوئی۔ ہمارے ہندوستان ہی میں کوڑیوں مذہب ہیں' اور ہمیشہ ایک دوسرے کو رد کرتے رہتے ہیں۔ ہم نے تو دیکھنا کیسا' سنا بھی نہیں کہ کوئی مذہب مناظرے میں مغلوب ہو کر معدوم ہو گیا ہو۔ بلکہ اختلاف مذہب یوماً "فیوماً" بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یوں تو سنتے تھے کہ مسلمانوں میں ستر دو بہتر فرقے ہوں گے' مگر ہندوستان میں سنی' شیعہ' حنفی' شفعی' صوفی گنتی' کے چند فرقے دکھائی دیتے تھے۔ اب ہمارے دیکھتے دیکھتے ایک سینوں میں وہابی' بدعتی' مقلد' غیر مقلد' دوالین' ذوالین' کتنے سارے نئے نکل کھڑے ہوئے اور یہ آفت اختلاف نہ صرف ہندوستان میں ہے اور نہ فقط مذہب میں' بلکہ ہر ملک میں اور ہر بات میں۔

الغرض مذہب کے اعتبار سے ابن الوقت نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی جدا مسجد بنا کھڑی کی۔ انگریزی تعلیم آزادی کے خیالات دلوں میں پیدا کر چکی تھی اور مطلق العنان کی دھن نے ہزارہا آدمیوں کو بے چین رکھا تھا اور وہ دنوں کی بھڑاس نکالنے کے لیے موقع تاک رہے تھے۔ ایسے لوگوں نے ابن الوقت کی آڑ کو غنیمت سمجھا اور نئے طور کے مسلمانوں کا گروہ بہت جلد کثیر التعداد ہو گیا' جیسے حشرات الارض کہ برسات کا چھینٹا پڑا اور لگے رینگنے۔ اگر تبدیل وضع اور ترمیم عقائد کے ساتھ موجبات ترغیب بھی ہوں تو ہم لوگوں میں ایسی بھیڑ چال ہے کہ آدھے سے زیادہ مسلمان نیا طریق اختیار کر لیتے مگر ادھر تو بھائی بندوں نے تاڑا' ادھر انگریزوں نے بے رخی کی اور تبدیلی کسی کو سزاوار نہ ہوئی تو ان لوگوں کی وہی مثل ہو گئی کہ ازیں سو رانده وازاں سو درمانده یعنی پیدا ہوتے ہی کچھ ایسی اوس پڑی کہ ٹھٹھر کر رہ گئے۔

فصل ۱۳

انگریزی وضع کے ساتھ اسلام کا نبھنا مشکل ہے

مذہب نام ہے انسان کے خاص طرح کے دلی خیالات کا۔ اور اس خانے کو خدا نے ایسی مضبوطی سے بند کیا ہے کہ ایک کے ضمائر سے دوسرا شخص کسی ڈھب سے مطلع ہو ہی نہیں سکتا۔ علاوہ ازیں مذہب ایک معاملہ ہے بندے میں اور خدا میں۔ اور کسی شخص کو یہ حق نہیں اور

ضرورت بھی نہیں کہ دوسروں کے مذہبی معاملات میں دخل دے۔ ان اصولوں کی بناء پر ہم کو ابن الوقت کے مذہب سے معترض ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ مگر از بس کہ وہ مسلمانوں کو دنیا و دین دونوں کی اصلاح کا مدعی تھا' ہم کو چارو ناچار دیکھنا پڑا کہ اس کے مذہبی خیالات کیا تھے۔ ہم ان لوگوں سے سنی ہوئی کہتے ہیں جن کو ابن الوقت کے ساتھ رات دن کی نشست برخاست' ہمسائی اور قرابت قریبہ کے تعلقات تھے' کہ اٹھارہ بیس برس کی عمر تک ابن الوقت کا یہ رنگ رہا کہ جیسے بڑے عابد متشرع مسلمان ہوتے ہیں وہ نوافل اور مستحبات کا اس قدر اہتمام رکھتا تھا کہ ایسا اہتمام فرض و واجب کا خدا ہم سب کو نصیب کرے۔ پانچوں وقت جامع مسجد کی اول جماعت کی تکبیر تحریمہ ناغہ نہیں ہونے پاتی تھی' اور تہجد اور اشراق کے علاوہ تحیۃ المسجد' صلوٰۃ التسبیح' منزل لیل' دلائل الخیرات' حزب البحر اور خدا جانے اور کتنے اور اوو وظائف جمعے کے دن کبھی اس کے گھر جانے کا اتفاق ہوا تو پہر دن چڑھے سے نماز جمعہ کی تیاری ہو رہی ہے۔ ایام بیض کے روزے داخل معمولات تھے۔ پھر مدت تک ترک حیوانات اور چلہ کشی وغیرہ مذہبی ریاضتوں کی زحمت اٹھاتا رہا۔ ان ہی دنوں لوگ خیال کرتے تھے کہ شاید وہ شاہ حقانی صاحب سے بیعت کرنے والا ہے۔

پھر ایک زمانے میں اس کو ہندو جوگیوں اور سنیاسیوں کی طرف میلان رہا۔ پھر جو سنبھلا تو اہلحدیث میں جا شامل ہوا' جنہیں لوگ مفتنا" دہابی کہتے ہیں۔ غدر سے چند روز پہلے وہ پادریوں کا ایسا گرویدہ تھا کہ بس کچھ پوچھو ہی نہیں۔ نوبل صاحب کی صحبت میں اس کے مذہبی خیالات نے دوسرا رنگ پکڑا۔ یہاں تک کہ انگریزوں میں جا ملا۔ اس سے تو انکار ہو نہیں سکتا کہ اس کے مذہبی خیالات میں ایک طرح کا تزلزل ضرور تھا' مگر تبدیل وضع تک ضروریات دین میں اس سے کمی سرزد نہیں ہوئی بلکہ تبدیل وضع کے بعد بھی لوگوں نے اس کو مسجد میں جماعت سے تو نہیں بارہا اکیلے نماز پڑھتے دیکھا۔ یہاں تک کہ شروع شروع جن دنوں اس کو نماز روزے کی بہت پرچول تھی کچہری کے عملے ہندو مسلمان سب قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ کیسے ہی کام میں مصروف ہوں' دیر سویر کی تو کہی نہیں جاتی مگر نماز ابھی تک تو چھوڑی نہیں۔ ہم تو ہر روز پرائیویٹ روم میں ظہر کی بلکہ جس دن دیر تک کچہری رہتی ہے' عصر کی بھی نماز پڑھتے دیکھتے ہیں۔ لیکن انگریزی وضع کے ساتھ نماز روزے کا نبھنا ذرا تھا مشکل۔ کوٹ تو خیر اتارا' الگ کھونٹی پر لٹکا دیا۔ کمبخت پتلون کی بڑی مصیبت تھی کہ اس کا اتارنا اور پھر پہننا وقت سے خالی نہ تھا۔ اس سے کہیں زیادہ وقت طہارت کی تھی جو نماز کی شرط ضروری ہے۔ پھر اکثر اتفاق پیش آجاتا تھا کہ ابن الوقت اپنے پرائیویٹ روم میں نماز پڑھ رہا ہے اور کوئی صاحب اس کی کچہری میں آنکلے اور اجلاس خالی دیکھ کر واپس چلے گئے۔ یا نماز کا وقت ہے' انگریزوں نے آگھیرا ہے۔ ان کو چھوڑ

کر جا نہیں سکتے۔ یا کوئی صاحب کچہری برخاست کر کے جانے لگا تو ابن الوقت کے پاس ہو کر نکلا "کیوں مسٹر ابن الوقت ہوا خوری کے لیے چلتے ہو؟" یا چلو ذرا بلیرڈ کھیلیں" یہ اور اس قسم کے دوسرے اتفاقات ہر روز پیش آتے تھے اور نماز کا التزام ممکن نہ تھا کہ باقی رہ سکے۔

ایک بڑی قباحت یہ تھی کہ اکثر مطلق پابندی مذہب کو حمق سمجھتے تھے۔ غرض نماز پر تو انگریزی سوسائٹی کا اثر یہ دیکھا کہ پہلے وقت سے بے وقت ہوئی' پھر نوافل' پھر سنتیں' جا کر نرے فرض رہے۔ وہ بھی پانچوں وقت پہلی رکعت میں سورہ عصر تو دوسری میں سورہ کوثر۔ پھر جمع بین العصرین والمغربین شروع ہوا۔ پھر قضائے فاتہ پھر بالکل چٹ۔ کھانے پینے میں احتیاط کے باقی رہنے کا کوئی محل نہ تھا۔ ابن الوقت کو انگریزوں کے پرچانے کی پڑی تھی اور وہ بے شراب کے پرچ نہیں سکتے تھے۔ ابن الوقت نے کونسی بات اٹھا رکھی تھی کہ وہ شراب خوری کے الزام سے ڈرتا۔ مگر ہم کو تحقیق سے معلوم ہے کہ وہ شراب سے نہ بہ پاس مذہب اسلام محترز تھا بلکہ اس وجہ سے کہ ڈاکٹر نے اس کو ڈرایا تھا کہ اگر تم شراب پیو گے تو کوڑھی ہو جاؤ گے۔ اس پر بہت سے انگریزی کھانے ہیں کہ شراب ان کے مسالے میں داخل ہے۔ بہتیری دوائیں ہیں کہ بدون شراب کے نہیں بن سکتیں۔ بلکہ ان لوگوں کی طب میں شراب خود دوا ہے کثیر الاستعمال۔ انگریزی تمدن اختیار کرنا اور شراب سے پرہیز رکھنا ایسا ہے کہ کوئی شخص کوئلوں کی دکان میں رہے اور منہ کالا نہ کرے۔ رہے انگریزی سوسائٹی کے معزز ممبر کتے' کیونکر ممکن تھا کہ جاں نثار جو ابن الوقت کی تبدیل وضع میں مشاطہ کا کام دے رہا تھا' انگریزیت کی شرط ضروری کو بھول جاتا۔ اس نے پہلے ہی سے ابن الوقت کے لیے کئی قسم کے کتے بہم پہنچا رکھے تھے۔ ان میں بعض ایسے بھی تھے کہ ہروقت ہم زاد کی طرح ابن الوقت کے ساتھ لگے رہتے تھے۔

غرض تبدیل وضع سے ایک ہی مہینے کے اندر اندر ظاہر اسلام کا کوئی اثر ابن الوقت اور اس کے متعلقات میں باقی نہ تھا۔ اگر کوئی انجان آدمی ابن الوقت کی کوٹھی میں جا کر کھڑا ہوتا' ہرگز نہ پہچان سکتا تھا کہ اس میں کوئی انگریز رہتا ہے یا ہندوستانی۔ بھلا آدمی جس کو انگریزی کے خبط نے گھر سے' خاندان سے' ابنائے جنس سے' شہر سے چھڑا کر تن تنہا جنگل میں لا کر ڈال دیا ہے۔ کسی انسان سے کسی طرح کی غلطی ہونا کچھ تعجب کی بات نہیں' مگر یہ کہ خدا نے اس کو معصوم پیدا کیا ہو۔ ابن الوقت سے بھی ایک غلطی ہوئی کہ اس نے تبدیل وضع کو مفید سمجھا۔ یہاں تک اس غلطی سے اس کے یا کسی دوسرے کے حق میں کوئی بڑی قباحت پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ مگر آدمی تھا ذہین کمبخت لگا اپنے افعال و استحسان کی تاویلیں گھڑنے۔ اول تو اصرار خلقتہ اس کے مزاج میں داخل تھا' دوسرے مسلمانوں نے جو اس کی تمام حرکات و سکنات کو ارتداد کہنا شروع کیا' اس سے اس کی ضد اور بھی بڑھتی گئی۔ اور مسلمانوں کو تو خیر اس سے کوئی فائدہ پہنچا ہو یا نہ' مگر باب تاویل

مفتوح کر کے اس نے مذہب اسلام میں تو بڑا بھاری رخنہ ڈال دیا۔ انگریزی تعلیم کی گھونس عمارت مذہب کے پیچھے ایسی بیچ جھاڑ کر پڑی ہے کہ کھود کھود کر سارے مذہبوں کی جڑیں کھوکھلی کر دیں، حتیٰ کہ عیسائیت کی بھی۔ اسلام کے حصے کی یہ دیمک اور نکل پڑی۔ قید مذہب سے طبیعتیں تھیں ملول۔ اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ملا۔ کیا کریں؟ دل تو ہمارا بھی للچاتا ہے کہ چلیں ابن الوقت کے ہاتھ پر بیعت کر لیں اور امرونواہی کی کشمکش سے نجات ملے۔ مگر کانشنس بھی چین لینے دے۔ ابن الوقت اور اس کے سارے اتباع یایوں کہو کہ جو اس کے ہم خیال تھے، عقل کے کھونٹے کے بل پر کودتے، اور یہی وجہ تھی کہ انگریز، جو نری ٹوٹی پھوٹی انگریزی پڑھ لینے سے اپنے تئیں بڑا دانشمند سمجھنے لگے تھے، جلد اس کے مغالطے میں آجاتے تھے۔

فصل ۱۴

مذہب اور عقل

ہم کو اس کتاب میں ان لوگوں کے ساتھ مناظرہ کرنا منظور نہیں۔ مگر اتنا تو خواہی نہ خواہی کہنا ہی پڑتا ہے کہ بلاشبہ مبدءِ فیاض نے انسان کو ظاہری یا باطنی جتنی قوتیں دی ہیں، سب میں عقل بڑی زبردست ہے، اور وہی مدار تکلیف شرع بھی ہے۔ لیکن بیش بریں نیست کہ عقل بھی ایک قوت ہے اور جس طرح انسان کی دوسری قوتیں محدود اور ناقص ہیں، مثلاً آنکھ کہ ایک خاص فاصلے پر دیکھ سکتی ہے، اس سے باہر نہیں۔ پھر وہ بے روشنی کے کام نہیں دیتی۔ اجسام کثیف میں نفوذ نہیں کرتی۔ اگر دیکھنے والا خود متحرک ہو مثلاً فرض کرو کہ کشتی یا ریل میں ہو تو وہ الٹا ٹھہری ہوئی چیز کو متحرک دیکھتا ہے اور اپنے تئیں ٹھہرا ہوا۔ تیز حرکت مشکل سے معلوم ہوتی ہے۔ جیسے لڑکے لٹو سے کھیلتے ہیں۔ پیالے میں تھوڑا سا پانی بھر کر لکڑی کھڑی کر دیں تو وہ ٹیڑھی ہوئی دکھائی دے گی۔ شفاف پانی کی تہ کی چیزیں اوپر کو ابھری ہوئی نظر آیا کرتی ہیں اور اسی طرح کی اور بہت سی غلطیاں نظر سے ہوتی ہیں جن کی تفصیل علم مناظر میں موجود ہے۔ غرض جس طرح مثلاً ہماری قوت باصرہ محدود اور ناقص ہے، اسی طرح عقل کی رسائی کی بھی ایک حد ہے۔ وہ بھی نقصان سے بری نہیں اور اس سے بھی غلطیاں ہوتی ہیں۔ غلطی کے لیے تو اختلاف رائے کی دلیل کافی ہے، ہندسے کے علاوہ، جس کے اصول بدیہات پر مبنی ہیں، اور اسی وجہ سے اس میں اختلاف ہو نہیں

سکتا۔ ڈاکٹر، فلسفی، جج، ایسٹرانومرز، پالیٹیشنز مدبران ملک) اہل مذہب وغیرہ وغیرہ سبھی کو دیکھتے ہیں کہ ایک دوسرے سے لڑتے مرتے ہیں منطق کے قاعدے منضبط ہوئے۔ مناظرے کے اصول ٹھہرائے گئے مگر اختلاف نہ کم ہوا اور نہ تا قیامت کم ہو۔ **ولا یزالون مختلفین الا من رحم ربک ولذالک خلقھم** جب ہست و نیست کا اختلاف ہو تو ضرور ایک بر سر غلط ہے۔ اگرچہ عقل انسان کا نقصان اختلاف رائے سے بھی مستبط ہو سکتا ہے، مگر ہم اس کو ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتے ہیں۔ دو ڈھائی سو برس کے عرصے میں اہل یورپ کو سینکڑوں باتیں ایسی دریافت ہوئیں کہ کسی کو کیمیا کا حکمی نسخہ مل گیا ہوتا اور وہ اس کو عام بھی کر دیتا تو اتنا فائدہ نہ پہنچتا جتنا کہ ان ماڈرن ڈسکوریز یعنی زمانہ حال کی دریافتوں سے ہوا۔ اور جن اقبال مندوں کو خدا نے واقعات اور موجودات نفس الامری میں غور و خوض کرنے کی دھن لگا دی ہے، خدا ان کی کوششوں کو مشکور و کامیاب کرتا ہے۔ وہ بے پایان موجودات میں غوطہ لگا رہے ہیں اور معلومات جدید کے بے بہا موتی ہیں کہ برابر نکلے چلے آتے ہیں۔

ان ماڈرن ڈسکوریز میں زیادہ نہیں صرف ایک چیز عام فہم لو جس سے انگریزوں کے طفیل میں ہم بھی فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اب ہم پوچھتے ہیں کہ دنیا میں گھر گھر آگ جلتی تھی۔ گھر گھر ہنڈیاں پکتی تھیں۔ ہر ہر متنفس بھاپ سے بخوبی واقف تھا۔ سینکڑوں ہزاروں برس پہلے سٹیم (بھاپ) کی طاقت کیوں معلوم نہیں ہوئی؟ اور یہی سوال ہر ڈسکوری کی بابت ہو سکتا ہے جو اب تک ہوئی یا آئندہ کسی وقت میں ہو۔ سر اسحاق نیوٹن، جس کو سب سے پہلے مسئلہ کشش کا الہام ہوا، کہتا تھا کہ خدا کی بے انتہا قدرت کے سمندر میں بے شمار موتی بھرے پڑے ہیں اور میں تو ابھی کنارے پر بیٹھا ہوا بچوں کی طرح سیپیاں اور گھونگے جمع کر رہا ہوں۔ یہ مقولہ تھا اس شخص کا جس نے زمین اور آسمان کے قلابے ملا کر نظام بطلیموس کی جگہ اپنا نظام قائم کیا اور آج سارا یورپ اس کے نام پر فخر کرتا ہے۔ جن کو خدا نے عقل دی ہے وہ تو یوں اپنی نارسائی کا اعتراف کرتے ہیں اور ہمارے زمانے کے انگریزی خواں ہیں کہ سیدھی سی اقلیدس کی نئی شکلیں پوچھو تو بغلیں جھانکنے لگیں۔ اور لن ترانیاں یہ کہ ہم چوما دیگرے نیست۔ پست جوں جوں زمانہ ترقی کرتا جاتا ہے، عقل میں یہ بات آسکتی ہے کہ مہینوں کی مسافت ہم گھنٹوں میں طے کر سکتے ہیں، یا کپڑے کی کل میں کپاس بھر کر اچھے خاصے دھلے دھلائے تہ کیے ہوئے تھان نکال لیا کریں گے۔ اور ابھی کیا معلوم کہ ہم کیا کیا کر سکیں گے۔ مگر پھر بھی رہیں گے ہم آدمی۔ عاجز، ناچیز، بے حقیقت بھلا آدمی کیا عقل پر ناز کرے گا جب کہ اس کو پاس کے پاس اتنا تو معلوم ہی نہیں کہ روح کیا چیز ہے، اور اس کو جسم کے ساتھ کس طرح کا تعلق ہے۔ وقت کے ازلی ابدی ہونے پر خیال کرتے ہیں تو انسان کی ہستی بے ثبات دکھائی دیتی ہے۔ جیسے دن رات میں ایک طرفۃ العین

بلکہ اس سے بھی کم۔ اور اس ہستی پر انسان کے یہ ارادے یہ حوصلے کہ گویا زمین اور آسمان میں سمانا نہیں چاہتا۔ پھر کیسے کیسے لوگ ہو گزرے ہیں کہ اس سرے سے اس سرے تک ساری زمین کو بلا مارا اور مر گئے تو کچھ بھی نہیں۔ ایک تو وہ خاک آخر وہ کیا چیز تھی جو ان سے نکل گئی: حیوانات' نباتات لاکھوں قسم کی مخلوقات کا ایک چکر سا بندھا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ زمین سے پیدا ہوتے ہیں پھر اسی میں فنا ہو جاتے ہیں۔ کسی کی عقل کام کرتی ہے کہ کیا ہو رہا ہے' اور کس غرض سے ہو رہا ہے؟ جان تو ایک قسم کی نباتات میں بھی ہے۔ مگر جانوروں کے بہت سے افعال انسان سے ملتے ہوئے ہیں۔ بلکہ بعض حیوانات بعض باتوں میں انسان پر بھی شرف رکھتے ہیں۔ مگر ہم دیکھتے ہیں تو ان کے کمالات وہبی اور فطری ہیں۔ پھر وہ کونسی تکمیل ہے جس کے لیے ان کو یہ ہستی دی گئی ہے؟

انگریزوں نے تحقیقات کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ مگر شروع سے اب تک کسی ایک جگہ یا کسی ایک چیز یا بات کا مسلسل پتانہ چل سکا۔ زمانہ حال سے جس قدر پیچھے کو دور ہوتے جاتے ہیں منظر تاریخ دھندلا ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اب سے چار پانچ ہزار برس پہلے کا کسی کو حال معلوم نہیں کہ دنیا کا کیا رنگ تھا۔ عقل انسانی کی نارسائی اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی کہ آج تک کسی چیز کی ماہیت ہی منکشف نہیں ہوئی۔ جاننا تو کیا جانا' وہ بھی شاید فیصد دو۔ مثلاً پانی کہ ہم اس کا اتنا ہی حال جانتے ہیں کہ سیال ہے' سہل الانقیاد ہے۔ یعنی جو شکل چاہو آسانی کے ساتھ قبول کر لیتا ہے۔ آمیزش سے پاک ہو تو شفاف ہے۔ نشیب کی طرف بہتا ہے۔ وزن مخصوص کے قاعدے سے ۳۳ فٹ سے زیادہ ہوا میں بلند نہیں ہو سکتا۔ حرارت کے اثر سے ہوا بن جاتا ہے یا اگر علم طبعی کے کسی ماہر سے پوچھو تو شاید دو چار خواص اور بیان کر سکے گا۔ مگر یہ سب آثار ہیں نہ ماہیت ماہیت کا نام آیا اور عقل گم ہوئی۔ اگرچہ ابن الوقت یا ہمارے زمانے کے بڑے سے بڑے انگریزی خواں ہی کیوں نہ ہوں۔

بات کیا ہے کہ دنیا ہے عالم اسباب۔ یہاں واقعات کا ایک سلسلہ ہے کہ ایک کے بعد دوسرا دوسرے کے بعد تیسرا واقع ہوتا رہتا ہے۔ ہم واقعہ متقدم کو سبب اور علت کہتے ہیں اور واقعہ متاخر کو مسبب' معلول' نتیجہ۔ اگرچہ سبب کے قرار دینے میں اکثر چند در چند غلطیاں ہوتی ہیں' مگر فرض کرو ہم سبب قرار دینے میں غلطی بھی نہ کریں' تاہم سبب اور مسبب میں جو علاقہ ہے آج تک اس کا راز کسی پر نہیں کھلا۔ مثلاً جلانا آگ کا خاصہ ہے۔ مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے۔ مگر کوئی نہیں بتا سکتا کہ کیوں؟ ذرا آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھو تو روئے زمین کے سارے ریگستانوں میں اتنے ذرے نہ ہوں گے جتنے ستارے آسمان میں بھرے پڑے ہیں۔ مگر یہ ستارے دیکھنے میں چھوٹے چھوٹے سے نقطے سے نظر آتے ہیں اور درحقیقت ایک ایک بجائے خود ایک

جہان ہے کہ ہماری زمین کی اس کے سامنے کچھ بھی حقیقت نہیں۔ سوچنے سمجھنے والے کو دنیا سراسر طلسم حیرت ہے۔ جب دنیاوی امور میں عقل انسانی کی نارسائی کا یہ رنگ کہ کسی بات کی کنہ کو نہیں پہنچ سکتی تو دین میں وہ ہماری کیا راہبری کرے گی ؟"

تو کار جہاں رانکو ساختی کہ باسماں نیز پرداختی

یہ دنیا تو پھر بھی عالم شہود ہے کہ ہم اس میں موجود ہیں اور اسے آنکھوں سے دیکھتے اور تھوڑا یا بہت اس میں تصرف بھی کر سکتے اور کرتے ہیں۔ دین خبر دیتا ہے کہ اس دنیا کے سوائے ایک جہان اور ہے یہ ظاہر ہے' وہ غائب یہ فانی ہے' وہ باقی' یہ مجاز ہے' وہ حقیقت یہ تمہید ہے' وہ نفس مطلب یہ امتحان ہے' وہ نتیجہ۔ یہ سفر ہے' وہ منزل مقصود۔ یہ خواب ہے' وہ تعبیر۔ یہ افسانہ ہے' وہ حق امر۔ ظاہر ہے کہ عقل انسانی کو اس جہان کے متعلق کچھ بھی نہیں جاننا چاہیے۔ کیونکہ وہ اس کی منتہائے رسائی سے بہت دور ہے۔ لیکن خدا کی بے انتہا مہربانی سے بعید تھا کہ انسان جو اس کی مخلوقات میں سب سے افضل ہے اس جہان سے بالکل بے خبر رہے' اور جس طرح اس نے اور چیزوں کو دوسرے خواص بخشے ہیں' عقل انسانی کو نیک و بد کی تمیز عطا فرمائی۔ جاہل سے جاہل' وحشی سے وحشی بھی بھلائی کی طرف راغب ہے۔ نہ کسی دنیاوی مفاد کی طمع سے' نہ کسی دنیاوی نقصان کے خوف سے۔ گویا انسان کا دل مقناطیسی سوئی ہے اور نیکی شمال کی سمت۔ بس اس جہان کے متعلق رسائی۔ معلومات واقفیت جو کچھ سمجھو' یہ انسانی فطرت ہے کہ آدمی بالطبع نیکی کو پسند اور برائی ناپسند کرتا ہے۔ پھر انسان کی عقل اپنی طرف سے کچھ کی نہیں کرتی بہتیرا زور مارتی ہے کہ وہاں کی حقیقت دریافت کروں مگر کچھ پتا نہیں چلتا"

حال عدم نہ کچھ کھلا گزرے ہے رفتگاں پہ کیا
کوئی حقیقت آن کر کہتا نہیں' بری بھلی

نیکی و بدی کے امتیاز کے ساتھ اس کو اتنی بات اور سوجھی ہے کہ انسان کے ہر فعل کو ایک نتیجہ لازم ہے۔ اگرچہ بسا اوقات بعض افعال کے نتائج اسی دنیا میں واقع ہو جاتے ہیں مگر بعض کے نہیں بھی ہوتے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ دنیاوی نتائج کے علاوہ طبیعتیں کسی اور نتیجے کی منتظر رہتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک جہان اور ہونا چاہیے اور اس کی ضرورت ہے۔ اور نہیں معلوم کیا سبب ہے کہ دل خود بخود اندر سے گواہی دیتا ہے۔ کہ مرنے سے تو ہمارا پیچھا چھوٹتا ہوا نظر نہیں آتا' مرے پیچھے ہم کسی حالت میں رہیں مگر رہیں گے ضرور۔ بس یہاں تک عقل کی پرواز تمام ہوئی"

اگر یک سر موئے برتر پرم فروغ تجلی بسوزد پرم

مگر اس سے تو کچھ بھی کشود کار نہ ہوا۔ دل جو اس جہان کے تفصیلی حالات کے مشتاق تھے' بدستور جویا کے جویا رہے۔ اب دین کی سرحد میں آگے بڑھنا چاہتے ہو تو چراغ عقل کو گل کرو اور آفتاب جہان تاب وحی کو اپنا ہادی اور راہنما قرار دو۔

اس بیان سے اگرچہ مختصر ہے معلوم ہو جائے گا کہ امور دین میں عقل انسانی کو کہاں تک دخل ہو سکتا ہے۔ ابن الوقت نے کچھ یہ تھوڑی غلطی نہیں کی کہ مذہب کو محکوم عقل بنانا چاہا۔ پس اس کے مذہبی رفارم کی بسم اللہ ہی غلط تھی اور اس کو نہ صرف اسلام سے اختلاف تھا بلکہ دنیا کے تمام مذاہب سے۔ یہ سچ ہے کہ انسان اپنی تمام قوتوں کے استعمال میں مجبور ہے اور نہیں ہو سکتا کہ وہ عقل رکھتا ہو اور اس سے کام نہ لے۔ مگر ہمارا مطلب یہ ہے کہ جسمانی یا عقلی جتنی قوتیں ہیں' سب کے استعمال میں اعتدال شرط ہے۔ اور علم اخلاق کا ماحصل بھی یہی ہے کہ اگر کوئی شخص عقل کو مذہب کی کسوٹی بنانا چاہے تو اس کو اس ارادے میں ویسی ہی کامیابی کی توقع رکھنی چاہئے جیسی کہ وہ شخص رکھ سکتا ہے جو باصرہ سے سامعہ کا یا شامہ سے ذائقہ کا کام لینے کا قصد کرے۔ دین کی دولت طبیعت کی چالاکی' عقل کی تیزی اور ذہن کی رسائی سے ہاتھ آنے والی چیز نہیں۔ اس کے مستحق ہیں بھولے بھالے' سیدھے سادے **اھل الجنتہ بلہ** (جنتی لوگ بھولے بھالے ہیں) منکسر' منقاد' افسردہ' متواضع' خاکسار لوگ۔ ایک بڑا خطرہ یہ ہے کہ جو شخص دین کی باتوں میں عقل کو بہت دخل دیا کرتا ہے تو شروع کرتا ہے جزئیات سے' فروعات سے' متشابہات سے۔ اور آخر کو جا پہنچتا ہے کلیات میں' اصول میں' ممکنات میں' محکمات میں۔ جیسا کہ ابن الوقت کو پیش آیا۔ پس جس شخص کی افتاد مزاج اس طرح کی ہو اس کو شروع سے احتیاط کرنی ضرور ہے۔ اسے چاہئے کہ ایسے خدشات کو دور کر کے خدائے تعالیٰ جل شانہ کی عظمت اس کی قدرت' اس کے جلال' دنیا کے انتظام' اس کے انقلابات اور کون و فساد میں شکر کیا کرے۔ امید ہے کہ ان کی طبیعت سنبھل جائے گی۔

فصل ۱۵

ابن الوقت سے لوگوں کی عام نارضامندی

ہم پھر یہی کہیں گے کہ اگرچہ لوگوں نے ابتدا کی تھی مگر ابن الوقت کو چھیڑ چھاڑ کرنی مناسب

نہ تھی۔ اس چھیڑ چھاڑ نے اس کی رفارم میں بڑی ہی کھنڈت ڈالی۔ اختلاف معتقدات کی وجہ سے "یوماً فیوماً" مسلمانوں اس سے متنفر ہوتے گئے' اور سچ پوچھو تو ابن الوقت نہ رفارمر رہا نہ مجدد بلکہ مسلمانوں میں ایک نئے عقیدے کا موجد سمجھا جانے لگا۔ اور ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں وہ مسلمانوں کو زیادہ فائدہ نہیں پہنچا سکتا تھا کیونکہ وہ کہتا تھا صبح تو مسلمان کہتے تھے شام۔ اور اس کی طرف سے مسلمانوں کے دل میں کچھ ایسی بدگمانی بیٹھ گئی تھی کہ اس کی ساری تدبیریں خود غرضی پر محمول کی جاتی تھیں۔ کچھ رفارم پر موقوف نہیں' ہر نئی بات کا قاعدہ ہے کہ شروع شروع سے آخر تک موافق و ناموافق دونوں طرح کے اتفاقات پیش آتے رہے۔ بلکہ ناموافق زیادہ تاہم اس کے شروع کے دو برس بڑی کامیابی کے برس تھے۔ کیونکہ نوبل صاحب کے اس حامی و سرپرست اس کے پاس موجود تھے۔ ان کی مہربانی اس کے حال پر یوماً فیوماً زیادہ ہوتی جاتی تھی اور ان کی مربیانہ مدارات دیکھ کر انگریز' کیا ہندوستانی' کسی کو ابن الوقت کے ساتھ پرخاش کرنے کی جرات نہ ہوتی تھی۔

غدر کے بارے میں ابن الوقت اور نوبل صاحب دونوں کے خیالات پہلے ہی سے منصفانہ تھے اور اس وقت انصاف ہی کو لوگ بڑا رحم سمجھتے تھے۔ غرض بغاوت کی تحقیقات میں بھی ابن الوقت کی لیاقت اور کارگزاری نے خاصی نمود پکڑی اور حکام بالادست اس کو صاحب الرائے' کثیر المعلومات' بے تعصب' منصف مزاج سمجھنے لگے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ نوبل صاحب سے کسی بارے میں رائے طلب ہوتی تو اس میں ایما کیا جاتا کہ اپنے اسسٹنٹ ابن الوقت سے پوچھو کہ وہ کیا کہتے ہیں۔ یہاں نوبل صاحب کا یہ حال تھا کہ بات بات میں ابن الوقت کی رائے سے استشہاد کرتے تھے۔ ان کی ہر چٹھی میں یہ فقرہ ضرور ہوتا تھا کہ میرے اسسٹنٹ ابن الوقت بھی اس رائے سے متفق ہیں یا ان کو اختلاف ہے۔ یہ سب کچھ ہو رہا تھا لیکن حسد کی آگ بھی دلوں میں بھڑک رہی تھی اور لوگ وقت کے منتظر تھے' یوں اپنی جگہ تو ہر شخص جو جس کے منہ میں آیا بک جھک لیتا تھا' ابن الوقت نے کبھی کسی کے کہنے کی پروا نہیں کی۔ مگر حاکموں کے روبرو جو لوگ جا کر الٹی سیدھی باتیں بنا آتے تھے' ان سے ابن الوقت کو اس کے منصوبوں کو بہت بڑا نقصان پہنچتا تھا۔ غدر کے مدتوں بعد تک سرکاری کچہریوں میں کام کی یہ کثرت رہی کہ باوجودیکہ تحقیقات بغاوت کا محکمہ علیحدہ تھا' اس پر بھی مسلمانوں کا تو اس وقت کہاں پتا' کیونکہ یہ تھے معتوب' ہندو بنگالی بابو اور یوریشن ملا کر ایک دم سے پانچ ڈپٹی کلکٹر تھے۔ اول تو ان دنوں کی قہرمانی کی حکومت' بغاوت کی تحقیقات در پیش ہتھیاروں کی طلبی' مخبری کا بازار گرم۔ دوسرے جتنے ہندوستانی حکام پہلے کے تھے' کوئی روپوش' کوئی ماخوذ۔ غرض سب کے سب یک قلم موقوف نہ لیاقت دیکھی نہ وجاہت' سفارشی ٹٹوؤں کو آنکھیں بند کر کے بھرتی کر لیا گیا تھا۔ ان میں ہمت کہاں؟ جرات کا کیا مذکور؟

ابن الوقت بہتیرا ٹھیل ٹھیل کر اپنی راہ پر لے جانا چاہتا تھا مگر یہ پینڈی کے بل بیٹھنے چلے جاتے تھے۔ ان کو اگر کوئی مجبور کرتا کہ سانپ کو پکڑ لو تو شاید کر بھی گزرتے، مگر کسی طرح ممکن نہ تھا کہ انگریز کے ساتھ ہاتھ ملا سکیں۔ ابن الوقت کے بہت سمجھانے پر ایک بابو ڈپٹی صاحب نے یہ جواب دیا تھا "ہم شب سمجھتا۔ پر شاہب لوگ کا سامنا ہم باش میں رہنا نہیں سکتا۔" کچھ ضعیف طبیعت' کچھ خوشامد اور کچھ ابن الوقت کے ساتھ خدا واسطے کا حسد۔ بعض تو اس طرح کے موذی تھے کہ حکام کو ابن الوقت کی طرف سے بد ظن کرنے کے لیے معمول اور ضرورت سے زیادہ حاکموں کے آگے جھکنے لگے تھے۔ ناچار ابن الوقت کو اپنے آپ کو اپنے ہی گروہ سے الگ رکھنا پڑتا تھا۔ مگر کہاں تک؟ انگریزوں کے ساتھ اختلاط پیدا کرنے ہی کے لیے تو یہ ساری مصیبت مول لی تھی۔ ان سب سے ملنا اور کثرت سے ملنا تو ابن الوقت کے سب کاموں پر مقدم تھا۔ پس یہ تدبیر کیا کرتا تھا کہ انگریزوں سے ملتا تھا مگر ہندوستانیوں اور خاص کر اپنے اقران و امثال کا وقت بچا کر۔

اس کو انگریزوں سے ملنے کے لیے بہتیرے مواقع تھے۔ بعض کو یہ کھانے پر بلاتا تھا' اور سارے اسٹیشن میں ملکی' فوجی ملا کر گنتی کے چار پانچ ایسے بھی تھے جو اس کو بھی کبھی کھانے پر بلا بھیجتے تھے۔ نوبل صاحب نے بڑی سینہ زوری سے اس کو کلب میں داخل کرا دیا تھا۔ بہتوں کے ساتھ وہاں ملاقات ہو جاتی تھی۔ پھر ہوا خوری' کرکٹ' انا' شکار' کون سی پارٹی تھی جس میں ابن الوقت کسی نہ کسی طرح اپنے تئیں لے نہیں گھستا تھا۔ بات یہ ہے کہ سارے کھیل پیسے کے ہیں اور ابن الوقت انگریزوں کے مقابلے میں خرچ کی پروا مطلق کرتا نہ تھا۔ سب سے بڑے دشمن ہندو مسلمان سب کے اور خاص کر ابن الوقت کے' یوریشین تھے' اور یہی لوگ شراب اور سوڈا اور لیمونیڈا اور چرٹ وغیرہ کی چاٹ کے مارے اس کو ہر وقت گھیرے بھی رہتے تھے۔ تبدیل وضع کی نسبت تو خیر جو چاہو سو کہہ لو' یوں ابن الوقت بڑا متین آدمی تھا۔ وہ کہیں مدتوں میں جا کر کھلتا تھا۔ سو وہ بھی ہر ایک سے نہیں۔ اس کے سیکڑوں ملاقاتیوں میں گنتی کے چند آدمی تھے جن کے ساتھ ہمہ وقت نہیں بلکہ خاص خاص اوقات میں وہ کسی قدر بے تکلفی کرتا تھا۔ ایسے مزاج کے آدمی کا قاعدہ ہوتا ہے کہ کوئی چاہے نہ چاہے مگر وہ مخالف اور موافق سب سے اپنا ادب کرا ہی لیتا ہے۔ پس ابن الوقت کے منہ پر تو کوئی نہیں کہتا تھا اور نہ کہہ سکتا تھا' مگر لوگوں کے بطون اس کی طرف سے صاف نہ تھے۔ چنانچہ ایک موقع پر سبھی نے اپنا اپنا زہر اگلا۔ قریب ہی مشن کی طرف سے ایک اسکول جاری تھا۔ اس میں پڑھنے لکھنے کے علاوہ لڑکوں کو دستکاری بھی سکھائی جاتی تھی۔ اور چونکہ ایسے مدرسے کی بہت ضرورت تھی' لڑکے ایسے گرستے تھے کہ جیسے شہد پر مکھیاں۔ پادری صاحب بڑے ملنسار آدمی تھے۔ اسکول میں برس کے برس جلسہ کرتے اور اس میں شہر کے سارے روادار آدمیوں کو بلاتے اور ان کے خوش کرنے کے لیے بجلی اور مقناطیس کے عجیب عجیب

کرتب دکھاتے۔ جلسے کے دن قریب تھے تو انہوں نے پہلے سے ابن الوقت سے کہہ دیا تھا کہ آپ کو ضرور آنا ہو گا اور مہربانی فرما کر لیکچر بھی دینا ہو گا۔

انہی دنوں ابن الوقت کے چند انگریز دوست متقاضی ہوئے کہ ہم کو اپنے علاقے کھیر پور میں لے جا کر شکار کھلاؤ۔ ابن الوقت کو پادری صاحب کا جلسہ یاد تھا' مگر ان دوستوں کو بھی ٹال نہیں سکتا تھا۔ ناچار گیا' مگر ایسے انتظام کے ساتھ کہ جلسہ ناغہ نہ ہو۔ وہاں شکار میں اتفاق سے کوئی انگریز گھوڑے پر سے گرا۔ اس کی تیمارداری نے ابن الوقت کو فرصت نہ دی۔ ناچار اس نے پادری صاحب کو عین وقت پر معذرت لکھ بھیجی۔ پادری صاحب نے بڑا افسوس کیا اور ہر چند چاہا کہ کوئی ہندوستانی لیکچر دے' کسی نے ہامی نہ بھری' غرض اور سب ہوا مگر پادری صاحب کو جس لیکچر کی بڑی خوشی تھی' وہ نہ ہو سکا خیر' جب تماشے وغیرہ ہو چکے تو سب لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے پادری صاحب بولے "افسوس ہے کہ مسٹر ابن الوقت کے نہ ہونے سے آج ہماری خوشی ادھوری رہ گئی۔ وہ ہوتے تو مجھ کو یقین ہے کہ بڑا عمدہ لیکچر دیتے اور اس سے سامعین خوش اور طالب علم مستفید ہوتے۔"

ایک انگریز جج : بے شک مسٹر ابن الوقت بڑے گویا اور روشن خیال آدمی ہیں اور میں نے ایسا بے تکان بولنے والا ہندوستانی نہیں دیکھا۔ مسٹر نوبل کے ڈنر میں جو انہوں نے پہلی اسپیچ دی تھی' آج تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ اور ہر چند آپ کے کرتب بڑے دلچسپ ہیں اور ان کے دیکھنے سے علمی مفاد میں بہت کچھ حاصل ہوتا ہے' مگر مسٹر ابن الوقت اپنی اسپیچ سے ان کرتبوں کو اور زیادہ شاندار اور بارونق کر سکتے تھے۔

ایک یوریشین ڈپٹی کلکٹر : (ایک کائستھ ڈپٹی کلکٹر سے ذرا پیچھے جھک کر) آپ کو معلوم ہے ابن الوقت صاحب کیوں غیر حاضر ہیں؟

کائستھ ڈپٹی کلکٹر : میں نے ابھی تھوڑی دیر ہوئی یہیں آ کر سنا کہ ایک ہفتہ ہوا صاحب لوگوں کے ساتھ شکار کو گئے ہیں۔

یوریشین : ابن الوقت صاحب کو شکار کا بہت شوق ہے۔ ہم اکثر اس کو شکار میں گیا ہوا سنتا ہوں۔

کائستھ ہاں صاحب' ان کو سب شوق زیبا ہیں۔

مربی بیارو ۰ مربا ب خور

ایک قسمت کے بیٹے' اسی تنخواہ اور انہی اقتدارات کے ڈپٹی ہم ہیں۔ لالہ جی بیٹھے باسی ہوئے۔

موسی مری خاوند کا رخ نہ پایا۔ رخصت کو منہ سے نہ نکال سکے۔ بندگی و بے چارگی۔

یوریشین کلکٹر : صاحب کبھی چھٹی دینا نہیں مانگتا میم صاحب اور مس بابا پہاڑ جانے لگا ہم صاحب سے بولا۔ صاحب نے بولا "نو" ہم سنتا نوبل صاحب بہت جلد ولایت جانا چاہتا ہے۔

جنٹ مجسٹریٹ : نہیں نہیں۔ انہوں نے درخواست کی تھی۔ صاحب کمشنر نے روک دیا کہ تا اختتام تحقیقات بغاوت درخواست کرنی مناسب نہیں۔

یوریشین : اگر نوبل صاحب گیا تو ابن الوقت کیا کرے گا؟ شاید وہ بھی صاحب کے ساتھ ولایت جائے گا۔

جنٹ : عجب نہیں۔ دیکھیں اس وقت کلکٹری کا چارج کس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

کائستھ : بھگوان کی دیا سے حضور والا کے دست مبارک میں ہوگا۔ مدت سے ہم نمک خوار دعائیں مانگ رہے ہیں۔

یوریشین : میں آپ کو کلکٹر دیکھ کر بہت خوش ہوگا۔

جنٹ : کیا ابن الوقت صاحب میری کوٹھی بھی جوتی پہن کر اور ٹوپی اوڑھتے ہوئے جانے کا ارادہ کریں گے؟ وہ ہندوستانی ہیں اور میں ان کو سکھاؤں گا کہ ہندوستانی کو اپنے افسروں کا ادب کس طرح کرنا چاہیے۔ مجھ کو نوبل صاحب کے ساتھ ابن الوقت کے بارے میں ہرگز اتفاق نہیں۔ میں ابن الوقت صاحب کو نوکری اور جاگیر دونوں کا مستحق سمجھتا ہوں' لیکن صاحب لوگوں کو بے عزت کرنے کا ان کو کوئی حق نہیں۔

یوریشین : میں آپ کی دانشمندانہ پالیسی کو بہت پسند کرتا ہوں۔ آخر یہ (کائستھ کی طرف اشارہ کرکے) بھی تو ڈپٹی ہیں۔ ایسے گستاخانہ خیالات ان کے دماغ میں کیوں نہیں آتے؟

کائستھ : ہم جتنے ہندو ہیں' ہمارا دھرم یہی ہے کہ حاکم اور بھگوان برابر۔

جنٹ : ہم نہیں سمجھتا کہ اس خیال اور مزاج کا آدمی غدر میں کیوں نہیں ہوا؟

یوریشین : اس کا دل باغی ہے اور میں کبھی یقین نہیں کرتا کہ اس نے نوبل صاحب کو سچے دل سے بچایا ہوگا۔

جنٹ : مجھ کو مسٹر........ تمھاری اس رائے سے اتفاق نہیں۔ اس کے بہتر جج نوبل صاحب ہیں' جو غدر میں اس کے ساتھ رہے ہیں۔ صاحب کو پورا بھروسا ہے کہ وہ دل سے سرکار کا خیر خواہ ہے۔

یوریشین : میں آپ سے معافی مانگتا ہوں حقیقت میں یہ بات سمجھ میں آنی مشکل ہے کہ ایسے خیالات اور خیر خواہی دو چیزیں ایک سر میں کیونکر جمع ہو سکتی ہیں۔ ان میں ایک اصلی ہوگی

اور دوسری بناوٹی۔

ایک مسلمان رئیس : جس طرح آپ لوگوں کو ابن الوقت کی خیر خواہی میں حیرت ہے' اس سے زیادہ سارے مسلمانوں کو ان کے اسلام میں ہے۔

پادری صاحب : آخر مسلمان ابن الوقت کے مذہب کی نسبت کیا خیال کرتے ہیں؟

مسلمان : عموماً عیسائی کہتے ہیں۔

پادری صاحب : (قہقہہ لگا کر) وہ ہرگز عیسائی نہیں' اور انہوں نے ہر موقع پر اس بات کو ظاہر کیا ہے اور مجھ سے ان کی اکثر ملاقات ہوتی ہے۔ مجھ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ خداوند عیسیٰ مسیح علیہ السلام کو خدا اور خدا کا بیٹا نہیں مانتے بلکہ عام مسلمانوں کی طرح صرف ایک پیغمبر۔ لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ اگر ابن الوقت دل سے عیسائی ہوتے تو بلاشبہ علانیہ اقرار کرتے۔ وہ اپنی رائے کو چھپانے والے آدمی نہیں۔ مگر ہمارا سارا کانگریگیشن خاص کر ان کے حق میں دعا کرتا ہے۔ خداوند عیسیٰ مسیح علیہ السلام قبول کرے۔

مسلمان : اگر ابن الوقت عیسائی نہیں ہیں' جیسا کہ آپ فرماتے ہیں' تو آپ انہیں اپنے ساتھ کھانا کیوں کھلاتے ہیں؟

(اس پر جنٹ اور یوریشین ڈپٹی کلکٹر اور دوسرے انگریز سب ہنس پڑے)۔

پادری صاحب : ہمارے مذہب میں جسمانی پاکی اور ناپاکی محض بے حقیقت چیز ہے۔ اگر ایک آدمی اپنے تئیں صاف ستھرا رکھتا ہے' وہ اپنی سوسائٹی کی تندرستی کے لیے مناسب تدبیر کرتا ہے۔ لیکن اس سے اس کی روح (ہندوؤں کی طرف مخاطب ہو کر آتما) خداوند کی نظر میں پاک نہیں ہو سکتی۔ آدمی کا جسم چند روزہ اور ناپائیدار ہے۔ وہ ایک قاعدے کے مطابق پرورش پاتا اور آخر کو فنا ہو جائے گا۔ غرض روح اور جسم کا تعلق عارضی ہے۔ جس طرح جسم نجاست اور غلاظت سے ناپاک ہوتا ہے' اسی طرح روح غصے اور لالچ اور حسد اور جھوٹ اور تکبر اور ظلم کشی اور خراب باتوں سے ناپاک ہوتی ہے جسمانی ناپاکی بہت آسانی سے دور ہو سکتی ہے۔ مگر روحی ناپاکی بدون اس کے کہ آدمی خداوند عیسیٰ مسیح کے نام سے اصطباغ لے' زائل نہیں ہو سکتی۔ سب آدمی خدا کے نزدیک یکساں اور سب ناپاک ہیں۔ اور جو شخص اپنے تئیں پاکیزہ گردانتا ہے' وہ دل کی ناپاکی کو ظاہر کرتا ہے۔ ہم نے ابن الوقت صاحب کو اپنے ساتھ کھانا کھلایا کیونکہ وہ ہماری طرح کے آدمی ہیں۔ اور ہم ہر شخص کو اپنے ساتھ کھلانے کو تیار ہیں۔ اور سب سے پہلے آپ کو اگر آپ پسند کریں۔ (اس جملے پر سب ہنسے)۔

مسلمان : اگر آپ ان چیزوں سے جو مذہب اسلام میں بہ تقاضائے مصالح چند در چند حرام کی گئی ہیں، محترز رہیں تو ہم کو آپ کے ساتھ کھانے میں ہرگز انکار نہیں۔ ہاں تو اگر ابن الوقت صاحب عیسائی نہیں؟ اور مسلمان تو یقیناً نہیں پھر کیا ہیں؟

پادری جی : وہ اپنے تئیں صاف صاف مسلمان کہتے ہیں اور بے شک مسلمان ہیں؟

مسلمان : اگر ابن الوقت صاحب مسلمان ہیں تو پھر دنیا میں کوئی کافر نہیں۔ اسی طرح ہمارے ان ڈپٹی صاحب (کائستھ کی طرف اشارہ کر کے) کو بھی اختیار ہے کہ بت پرستی کرتے جائیں اور عیسائی یا مسلمان ہونے کا دعویٰ کریں۔

کائستھ : بھگوان نہ کرے۔ میں عیسائی یا مسلمان کیوں ہونے لگا۔ سب میں اتم اور پراچین ہمارا ہی دھرم ہے، جو ہزار ہا برس سے چلا آتا ہے۔ اور ہرچند مسلمانوں نے بڑے بڑے جتن کیے کہ ہندو دھرم مٹ جائے، بھگوان کا ایسا کرنا ہوا کہ آپ ہی مٹ گئے۔

جنٹ : اچھا اگر کوئی ابن الوقت صاحب کو اپنے مذہب میں لینا نہیں چاہتا تو ان کو بھی کسی مذہب کی پروا نہیں۔ وہ صرف ایک بلند نظر آدمی ہے اور دنیا میں اس قسم کے اور بہت آدمی ہوئے ہیں۔ وہ فقط اپنی نمود چاہتا ہے۔

اس کی مسلمان اور کائستھ اور یوریشین سب نے تصدیق کی۔

پادری صاحب : میں سمجھتا ہوں کہ ان کو مسلمانوں کی رفارم کا بھی بہت خیال ہے۔

مسلمان : بس جناب، یہ ان کے دکھانے کے دانت ہیں۔

پادری صاحب : اس نے ہمیشہ انگلش سوسائٹی میں مسلمانوں کی حالت پر افسوس ظاہر کیا ہے۔ وہ دل سے مسلمانوں کا خیر خواہ ہے اور اس کے دل میں قوم کی بڑی محبت ہے۔ اور جب جب اس کو موقع ملتا ہے مسلمانوں کے فائدے میں کوشش کرتا ہے۔

مسلمان : خدا جانے اس میں کیا مصلحت ہوگی، ورنہ میرے دیکھنے میں تو اس شخص نے اسلام کی تفضیح میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ مسلمانوں کے ساتھ مدارات کا یہ حال ہے کہ آپ لوگ غیر مذہب حاکم وقت ہو کر تو سیدھی طرح بات بھی کر لیتے ہیں، اور ان کو مسلمانوں کی شکل سے نفرت ہے غیر تو درکنار وہ شخص اپنے رشتے داروں تک سے ملنے کا روادار نہیں۔ سبحان اللہ کیا حب قومی ہے۔

جنٹ صاحب یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے مائی فرینڈز مسٹر ابن الوقت کی تھا میرے سوا کسی نے نہیں پائی۔ جلسہ برخاست۔

فصل ۱۶

ابن الوقت کا انگریزی طرز سے متاذی ہونا

الغرض ابن الوقت کی نسبت لوگوں کے اس قسم کے خیالات تھے۔ ہندوستانی سوسائٹی میں بہ استثناء معدودے، چند جنھوں نے اس کی وضع کی تقلید کر لی تھی، کوئی اس کو پسند نہیں کرتا تھا۔ انگریزوں میں اعلیٰ درجے کے انگریز، وہ بھی سب نہیں، البتہ اس کے خیالات کی قدر و وقعت کرتے تھے۔ بہرکیف، اس کے مخالف بہت تھے اور یہ بات خود ابن الوقت کو بھی معلوم تھی اور یہ خیال اکثر اس کو رنجیدہ رکھتا تھا۔ اس کے اپنے بی بی بچے سب غدر سے پہلے مرکھپ چکے تھے اور یہ بے تعلقی اگر باعث نہیں ہوئی تو اس کو آزادی میں موید تو ضرور ہوئی۔ تاہم بھائی بھتیجوں اور دوسرے رشتے داروں کی مفارقت کے خیال سے بھی وہ متاذی ہوتا تھا۔ رشتے دار تو رشتے دار اس کو ہندوستانی سوسائٹی کے چھوٹ جانے کا بھی افسوس تھا۔ اور ہم نے بہ تحقیق سنا ہے کہ اس نے بارہا اپنے رازداروں سے کہا کہ میرے یہاں کے کھانے کی ساری چھاؤنی میں تعریف ہے، مگر میرا یہ حال ہے کہ انگریزی کھانا کھاتے ہوئے اتنی مدت ہوئی، سچ تو یہ ہے کہ ایک دن مجھے سیری نہیں ہوئی اور میں اکثر خواب میں اپنے تئیں ہندوستانی کھانا کھاتے ہوئے دیکھتا ہوں۔

ابن الوقت کے خاص خدمتگار کی زبانی معتبر روایت ہے کہ ایک بار اس کو تخت تپ لاحق ہوئی اور عادت کے مطابق لگا بکنے، تو وہ ہندوستانی کھانوں کے نام لے لے کر روتا تھا۔ اور کھانے بھی پلاؤ، زردہ، تنجن، بریانی نہیں بلکہ مونگ کی دال کا بھرتا، دھوئی ماش کی پھریری دال، دہی بڑے، کباب، امرود کے کچالو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چٹ پٹی چیزوں کو ترس گیا تھا۔ معلوم ہے کہ وہ ابتداء تبدیل وضع سے گھر بار چھوڑ کر باہر چھاؤنی میں جا رہا تھا۔ اس کے پاس اتنے نوکر چاکر تھے کہ اس کی کوٹھی کا احاطہ بجائے خود ایک چھوٹا سا محلہ تھا۔ لیکن اس کی زندگی ویسی ہی اداس زندگی تھی جیسی ایک بے چارگی کی ہوتی ہے۔ وہ نوکروں کے حق میں بڑا سیر چشم تھا۔ اس کے یہاں نوکروں کی ایسی بھاری تنخواہیں تھیں کہ دلی کی اتنی بڑی بھاری چھاؤنی میں بس وہ چار ہی جگہ اور ہوں گی۔ اس لیے تمام نوکر سلیقہ مند اور مستعد تھے۔ اور در حقیقت بات یہ ہے کہ انھی نوکروں نے انگریزی سوسائٹی میں اس کی اتنی بات بھی بنا رکھی تھی۔ مگر نوکر کیسے ہی ہوشیار کیوں نہ ہوں، پھر بھی مالک کی تائید کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ انگریزی زندگی ایسے

بکھیڑے کی زندگی تھی کہ ابن الوقت کو جتنا وقت کچہری اور ملاقات سے بچتا تھا' صفائی کی نگرانی اور ہر چیز کی خبرگیری کے لیے بہ مشکل وفا کرتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ اس کے نوکر انگریزی مذاق سے خوب واقف تھے' مگر ابن الوقت سے خود صبر نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اپنی طرف سے ایسی خراش تراش ایجاد کرنے لگا تھا کہ خواہی نہ خواہی اس کو دیکھنا پڑتا تھا۔ دعوت ایسے مزے کی چیز ہے کہ کھلانے والا اور کھانے والا دونوں ہی خوش ہوتے ہیں۔ مگر ابن الوقت کے یہاں کی دعوت اس کے حق میں ایک مصیبت ہوتی تھی۔ کھانا تو کہیں جا کر رات کے نو دس بجے نصیب ہوتا اور اہتمام کی آندھی صبح سویرے سے چلنی شروع ہو جاتی تھی۔ ہم کو تو کوئی دعوت ایسی یاد نہیں کہ ابن الوقت تکان کی وجہ سے اس کے بعد علیل نہ ہوا ہو۔ پھر چھٹے چھ ماہے دعوت ہو تو خیر' یہاں ہر مہینے کچھ نہ ہو تو بڑے کھانے دو تین بلکہ بعض اوقات تو ابن الوقت گھبرا کر بول بھی اٹھتا تھا کہ میں نے کہاں کا کھٹ راگ اپنے پیچھے لگا لیا ہے

یہ تو تھیں میزبانی کی لذتیں۔ مہمانی کے ذائقے ان سے بھی زیادہ تلخ۔ اگر اسٹیشن میں کسی انگریز کے یہاں کھانا ہے اور اس نے ابن الوقت کی دعوت نہیں کی' اور اکثر ایسا ہوتا رہتا تھا' تو اس کے دل پر ایک صدمہ گزر جاتا تھا اور وہ اس کو اپنی تذلیل سمجھتا تھا۔ نہ صرف انگریزی سوسائٹی میں بلکہ جی ہی جی میں اپنے نوکروں تک میں کئی کئی دن شرمندہ رہتا تھا۔ اور اگر اس کا بھی بلاوا ہوا تو صاحب خانہ کے گھر میں قدم رکھتے ہی اس کو ان فکروں نے آگھیرا کہ کسی کی کیسی آؤ بھگت ہوئی۔ لیڈی کس صاحب کے پاس بیٹھی اور اگر یہ بھٹیل رہ گیا یا کوئی چیز اپنے یہاں سے بہتر نظر پڑ گئی تو وہ دعوت اس کے لیے عداوت ہو جاتی تھی۔ الغرض انگریزی سوسائٹی میں داخل ہونے کے خبط نے اس کو ایسا بے چین کر رکھا تھا کہ دن رات میں چار منٹ کے لیے بھی شاید اس کو خوشی ہوتی ہو' ورنہ جب دیکھو منقبض' جب سنو آزردہ۔ ذرا سوچنے اور خیال کرنے کی بات ہے کہ جو شخص دنیا میں اس قدر منہمک ہو' اس کو دینداری سے کیا سروکار۔ سچی دینداری کی بڑی شناخت ہے زہد۔ جتنا جس سے ہو سکے۔ کجا زہد اور کجا یہ فضول و لایعنی بکھیڑے۔ سو بھی ہم نے ابھی تک سب نہیں بلکہ نمونے کے طور پر بعض چھوٹی چھوٹی باتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ابن الوقت بے چارے مصیبت کے مارے کو ایک سے ایک سخت مشکل درپیش تھی کہ وہ تو وہی ہٹ کا پورا تھا کہ ان آفتوں کو بری طرح جھیلتا رہا۔ دوسری تو کبھی کا بھاگ کھڑا ہوا ہوتا اور پھر ساری عمر انگریزی سوسائٹی کا نام نہ لیتا۔ ہاتھیوں کے ساتھ گنے کھانا کچھ لڑکوں کا کھیل ہے؟

ابن الوقت غدر سے پہلے بھی اچھا خاصا خوشحال تھا۔ قلعے کی تنخواہیں تو تھوڑی تھیں مگر اوپر سے انعام و اکرام وغیرہ ملا کر بہت کچھ پڑا رہتا تھا۔ ہمارے اندازے میں ابن الوقت کی آمدنی پچاس روپے ماہوار سے ہرگز کم نہ تھی اور غدر کے بعد سے تو کچھ پوچھنا ہی نہیں۔ نہ سو نہ سوا سو ماشاء

اللہ ایک دم سے پانسو۔ اس آمدنی پر اچھے سے اچھا کھاتا' اچھے سے اچھا پہنتا۔ غرض امیرانہ خرچ رکھتا' مگر ہندوستانیوں کا سا تو چند سال کے عرصے میں اس کے پاس معتد بہ سرمایہ ہو جاتا۔ لیکن اس نے کرنی چاہی انگریزوں کی ریس۔ پورا برس بھی خیریت سے گزرنے نہیں پایا کہ لگا ادھار کھانے۔ جس وقت اس کو جاں نثار نے نہلا دھلا کر پہلے پہل انگریزی کپڑے پہنائے تو کوٹھی کا ساز و سامان اور اپنی شان دیکھ کر اس کو اس قدر خوشی ہوئی تھی کہ اپنے آپے میں نہیں سماتا تھا اور ابھی اس خوشی کا اثر طبیعت پر باقی تھا کہ ایک چپڑاسی بڑا لمبا چوڑا لفافہ لیے ہوئے برآمدے تک آیا۔ قاعدے کے مطابق بیرا (بیرر) نے لفافہ کشتی میں رکھ کر نئے صاحب کے حضور میں پیش کیا۔ کھولا جنرل سپلائیر کا بل تھا۔ کتنے کا؟ کچھ اوپر پانچ ہزار کا۔ پانچ ہزار کی رقم دیکھ کر قریب تھا کہ حواس خمسہ مختل ہو جائیں مگر سنگ آمد و سخت آمد۔ چون و چرا کرنے کا موقع نہیں۔ قہر درویش برجان درویش دینا ہی پڑا۔ مگر کیونکر؟ ہزار کا توڑا نوبل صاحب کا دیا ہوا سربند رکھا ہوا تھا' وہ لیا' اور بہ ہزار مشکل دو ہزار گھر میں سے فراہم کیے۔ پھر بھی سوا دو ہزار اور ہوں تو پنڈ چھوٹے۔ بارے غدر سے پہلے نواب معشوق محل بیگم صاحب کی سرکار میں ابن الوقت کی معرفت گڑ والوں کا لین دین تھا۔ ڈرتے ڈرتے ان کو رقعہ لکھا۔ اسامی تھی کھری اور جان دار۔ انہوں نے بے تامل روپیہ حوالے کیا یوں جنرل سپلائیر کا پوت پورا ہوا۔

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت

لیکن ابن الوقت نے خرچ کا ڈربا کھول دیا تھا۔ جس نسبت سے اس کی آمدنی بڑھی تھی اگر اسی نسبت سے خرچ بھی بڑھتا تو چنداں حرج کی بات نہ تھی۔ پر اس نے لیٹتے کے ساتھ چادر کے باہر پاؤں پھیلا دیے۔ اول سہرے گھر کے تہرے چوہرے مکان ہوتے ساتے چالیس روپے مہینے کا بنگلا' پھر فٹن' ٹمٹم (ٹینڈم) بروہم' پالکی گاڑی' چار قسم کی بگھیاں اور چار کے چار گھوڑے اور ایک زین سواری کا پانچ' دھوبی' سقہ' چوکیدار' فراش' مشعلچی' باورچی' میٹ' سائیس' گراس کٹ' مہتر مالی' بیرا' دو ڈھائی درج کے قریب شاگرد پیشہ ان کی تنخواہیں اور تنخواہوں کے علاوہ وردی۔ اسی کی مناسبت سے مصارف باستثنا میز کہ اس کا کچھ اندازہ ہو ہی نہیں سکتا۔ مہینے میں اچھے جید دو کھانے بھی ہو گئے تو ساری تنخواہ پر پانی پھر جانا کچھ بات نہیں۔ ابن الوقت نے شروع شروع میں تین یا چار تنخواہیں وقت پر لی ہوں گی۔ اس کے بعد سے تو خزانچی کے ساتھ معاملہ ہو گیا۔ ایک چھوڑ دو دو مہاجن دینے والے۔ جب ضرورت ہوئی' جس سے جتنا چاہا' منگوا لیا۔ تنخواہ تو اوپر سے خزانچی لے لیا کرتا تھا اور زمینداری کا محاصل گڑ والوں کی کوٹھی میں چلا جاتا تھا۔ ان بچے کو انگریز بننے کی دھن میں اتنی بھی خبر نہ تھی کہ سر پر کتنا قرضہ لدتا چلا جا رہا ہے۔ یہ تو اپنے ان خیالات میں

مست تھا کہ صاحب کمشنر مجھ کو مائی ڈیئر ابن الوقت اور اپنے تئیں یورز سنیسرلی لکھتے ہیں۔ چیف کمشنر نے سالانہ رپورٹ میں میری کارگزاری کا شکریہ ادا کیا ہے۔ جوڈیشل کمشنر نے ایک فیصلے میں میری نسبت یہ لکھا ہے کہ اس کی طبیعت کو قانون سے فطری مناسبت ہے۔ فنانشل نے فلاں سرکلر کا مسودہ مجھ سے طلب کیا تھا۔ ان کی چٹھی موجود ہے۔ اب جو چھپ کر آیا تو میں دیکھتا ہوں کہ ایک لفظ کا ردو بدل نہیں کیا۔ قانون شہادت کی فلاں دفعہ میرے اصرار سے بڑھائی گئی۔ لیجلیٹو کونسل کے لا ممبر نے مجھ کو چٹھی میں اطلاع دی مگر معلوم نہیں اپنی اسپیچ میں میرا تزکرہ کیوں نہیں کیا۔ یا تو رپورٹر کی فروگذاشت ہے یا ممبر صاحب کو اس وقت خیال نہ رہا ہو گا۔ فلاں صاحب نے ولایت سے میرا فوٹوگراف منگوایا ہے اور لکھتے ہیں کہ میم صاحب متقاضی ہیں۔ اوہو! مس جوزف ہمارے ڈرائینگ روم کی تصویروں کو بہت پسند کرتی تھیں اور گھنٹوں ہمارے کتوں سے کھیلا کرتی تھیں۔ ابھی ولایت کی ڈاک میں اس کی چٹھی آئی ہے۔ ایک بڑے سوداگر کے ساتھ اس کی شادی ہونے والی ہے۔ میجر صاحب نے آئس کریم (ملائی کی برف) جمانے کے لیے ہمارے آدمی کو بلا بھیجا ہے۔ یہاں سے برف ہی جموا کر نہ بھیج دی جائے؟ کرنیل صاحب کا اسباب نیلام ہو گا تو دو گھوڑے ہم ضرور لیں گے کیوں کہ ہم نے خوب خیال کر کے دیکھا تو ہمارے دو گھوڑے ہمیشہ صاحب لوگوں کی سواری میں رہتے ہیں اور چڑیوں اور پھولوں کے گملوں کو تو ہم ان سے زبانی کہہ چکے ہیں۔ پرسوں کیا اتفاق ہوا کہ میں ٹھنڈی سڑک پر جا رہا تھا۔ کپتان صاحب بہادر اور ان کی میم آتے ہوئے ملے۔ بڑے تپاک سے صاحب سلامت ہوئی۔ میم صاحب کے ہاتھ میں ایک پھول تھا۔ انہوں نے میری طرف پھینک دیا۔ کپتان صاحب بولے۔ ''مسٹر ابن الوقت' میرے پاس کوئی پھول نہیں کہ میں تم کو دیتا۔'' تو میں نے کہا ''آپ کے پاس تو نہایت خوبصورت گلدستہ ہے۔'' میم صاحب نے اس کا بڑا شکریہ ادا کیا اور دونوں میاں بیوی ہنستے ہوئے برابر سے نکل گئے۔ فرینڈ آف انڈیا ایک آرٹیکل میں مجھ کو مسلمانوں کا مشہور ریفارمر لکھا ہے۔

غرض جس طرح ایک آدمی کو کسی بات کی زز نہیں لگ جاتی' پس ابن الوقت کو انگریز بننے کی زز تھی۔ شروع شروع میں تو اس کی مسلمانوں کے حال پر بھی ایک طرح کی نظر تھی لیکن چند روز کے بعد اس کی رفارم اسی پر منحصر ہو گئی کہ انگریزی اوضاع میں سے کوئی وضع و اطوار اور کوئی طور چھوٹنے نہ پائے۔ کمبخت آپ بھی برباد ہو رہا تھا' اور اس کی دیکھا دیکھی کچھ ایسی ہوا چلی کہ مسلمانوں کے نوجوان لڑکے خصوصاً جنہوں نے ذرا سی انگریزی پڑھ لی تھی یا جو گھر سے کسی قدر آسودہ تھے' تباہی کے لچھن سیکھتے چلے گئے۔ اس کے اندرونی حالات کی تو کسی کو خبر نہ تھی' ظاہر میں دیکھتے تھے کہ انگریزوں میں ملتا جلتا ہے۔ جو بات کسی ہندوستانی عہدے دار کو نصیب

نہیں' اس کو حاصل ہے اور لوگوں کی نظر میں انگریزی وضع خدا کے فضل سے جو کسی ایک کو پھلی ہو سبھی نے تو اپنی اپنی جگہ تھوڑا بہت نقصان اٹھایا۔

کسی جگہ شروع کتاب میں کہا جا چکا ہے کہ نوبل صاحب کو ایک طرح کا ہلکا ہلکا درد سر ہر وقت رہتا تھا اور اسی کے علاج کے لیے رخصت لے کر ولایت جا رہے تھے کہ غدر کی وجہ سے دلی میں گھر گئے۔ کیا خدا کی شان ہے کہ نہ دوا نہ درماں سارے غدر' اور غدر کے بعد بھی مدتوں تک' آپ ہی آپ اس درد کا کہیں پتا نہ تھا۔ ہرچند اپنے عزیزوں سے ملنے کے لیے ان کا جی ولایت جانے کو چاہتا تھا مگر دیکھتے کہ سلطنت متزلزل ہو رہی ہے' کام کی ہر جگہ کثرت ہے (ایسے وقت میں اگر صاحب ولایت بھی ہوتے تو ان سے ایک دن وہاں نہ ٹھہرا جاتا) کیسے ہو سکتا تھا کہ اس حالت میں ولایت چلے جائیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے گھر لکھ بھیجا تھا کہ جب تک تمام ملک میں انتظام سابق دستور نہ ہو جائے' میں قصد نہیں کر سکتا۔ لیکن جوں جوں بغاوت فرو ہوتی گئی' اس درد کی کسک ابھرتی چلی گئی۔ ایک بار انہوں نے ولایت جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو چیف کمشنر صاحب نے فرمایا کہ تم جا تو سکتے ہو مگر میں چاہتا تھا کہ تحقیقات بغاوت کا کام تمہارے ہاتھ سے اختتام پاتا۔ خیر' یہ پھر چپ ہو رہے۔ لیکن درد سر زور پکڑتا جاتا تھا' یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء کی گرمیوں میں تو یہ حال ہو گیا کہ جس روز گرمی کا اشتداد ہوتا' سارے سارے دن ان سے اٹھا نہیں جاتا تھا۔ اور ڈاکٹر تو مدتوں سے کہہ رہا تھا۔ اب اس نے بھی سختی کی کہ اگر تم برسات میں ٹھہرو گے تو یقیناً ہلاک ہو جاؤ گے۔ میں نے تمہارے درد سر کی نسبت یہ خوب تشخیص کر لی ہے کہ سمندر کی ہوا کے سوا اس کی اور کوئی دوا نہیں۔ مگر صاحب کا ارادہ تھا کہ آخری رپورٹ روانہ کر دوں تب جاؤں' کام بھی بہت سمٹ آیا تھا۔ لیکن قاعدہ یہ ہے کہ کام کا پچھاہی بھاری ہوتا ہے۔ برسات چلی آ رہی تھی اور ابھی رپورٹ کا لکھنا بھی شروع نہیں ہوا تھا۔ نوبل صاحب کا یہ حال تھا کہ درد سر نے بہت ستایا' پڑ رہے۔ پھر ذرا طبیعت سنبھلی' اٹھ بیٹھے' کام کرنے لگے۔ غرض اس بندہ خدا نے رخصت کا نام ہی لینا چھوڑ دیا۔ صاحب کمشنر نے اپنے طور پر اس کی اطلاع چیف صاحب کو دی۔ وہاں سے حکم آیا کہ باقی ماندہ کام صاحب کلکٹر کو دے دو اور تم رپورٹ کا مواد لے کر فوراً ولایت کو روانہ ہو جاؤ۔ چیف صاحب یقین کرتے ہیں کہ جہاز میں تمہاری طبیعت درست ہو جائے گی اور تم ولایت جا کر رپورٹ تیار کرنا۔ تمہارے سفر اور قیام ولایت کا زمانہ سروس میں شمار کیا جائے گا اور تم کو پوری تنخواہ دی جائے گی۔

فصل ۱۷

نوبل صاحب کا رفتہ "ولایت جانا ہوا۔ ابن الوقت کو بنگلہ چھوڑنا پڑا

اس حکم کے آتے ہی صاحب کمشنر نے کھڑے کھڑے صاحب کلکٹر کو چارج دلوا دیا۔ نوبل صاحب کو تیسرے دن ولایت چلتا کیا۔ صاحب کو روانہ ہونے سے ہفتہ عشرہ پہلے ڈاکٹر نے ملاقات کی ممانعت کر دی تھی۔ پس اس اثناء میں ابن الوقت کے ساتھ بھی صاحب کی کوئی تفصیلی ملاقات نہ ہونے پائی۔ غرض صاحب روانہ ہوئے تو ابن الوقت ہکا بکا سا رہ گیا۔ نہ اپنی کہی نہ ان کی سنی۔ اس کو صاحب کے جانے کا زیادہ ملال تھا مگر ذاتی محبت کی وجہ سے ایک لمحے کے لیے بھی اس کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ صاحب کے جانے سے اس کو تبدیل وضع کے برے نتیجے اس قدر دق کریں گے۔

نوبل صاحب کے جاتے جاتے برسات کی آمد آمد اور گرمی کے اشتداد کی وجہ سے ہوا میں روایت کے آثار پیدا ہو چلے تھے۔ شہر میں تو بیماری کا زور تھا۔ چھاؤنی میں بھی کہیں کہیں شکایت سنی جاتی تھی۔ نوبل صاحب کو روانہ ہوئے چوتھا یا پانچواں دن تھا کہ کمانڈنگ افسر نے حکم جاری کیا کہ انگریزوں کے شاگرد پیشہ کے سوائے کوئی نیٹو چھاؤنی کی حدود میں نہ رہے، شہر کا کوئی آدمی چھاؤنی میں نہ آنے پائے اور انگریزوں کے شاگرد پیشوں میں بھی بنگلے پیچھے ایک آدمی ضرورت کی چیزیں لینے کو ایک بار شہر میں جائے اور دن کے سات بجے کے اندر اندر واپس آجائے۔ اور تاریخ حکم سے ایک ہفتے بعد اس کی پوری پوری تعمیل ہو۔ سال گزشتہ میں بھی ایسا ہی اتفاق پیش آیا تھا تو نوبل صاحب نے سمجھا دیا تھا کہ مسٹر ابن الوقت نیٹو تو ہیں مگر ان کا طرز ماندو بود بالکل ہم لوگوں کا سا ہے۔ اور ان کے احاطے میں صفائی کے قواعد کی تعمیل پوری پوری ہوتی ہے۔ چنانچہ فوجی عہدیداروں نے ابن الوقت کے حالات سے کچھ تعرض نہیں کیا۔ اب کی بار دو مشکلیں جمع ہو گئیں۔ نوبل صاحب تو تشریف لے گئے اور کمانڈنگ افسر صاحب نئے آئے ہوئے تھے۔ ابن الوقت سے صاحب سلامت تو تھی مگر کھان پان کی نوبت نہیں آئی تھی۔ جنرل آرڈر دیکھ کر ابن الوقت کو بڑا تردد پیدا ہوا۔ اور حقیقت میں بڑے تردد کا مقام تھا کیونکہ وہ صدہا روپیہ خرچ کر کے احاطے کو مدتوں کی محنت سے اپنی مرضی کے مطابق درست کر پایا تھا۔ بڑی تلاش سے کمروں کی وسعت اور ان کے مواقع کے لحاظ سے فرنیچر جمع کیا تھا۔ خانہ باغ کی درستی میں بھی بہت کچھ محنت

کرنی پڑی تھی۔ ابن الوقت تمام اسٹیشن کے بنگلوں اور کوٹھیوں کے چپے چپے سے واقف تھا۔ ہر طرف نظر دوڑائی، کوئی بنگلہ ڈھب کا سمجھ میں نہ آیا۔ اور جو دو چار تھے، سو مشغول تھے۔ اور اگر مشغول نہ بھی ہوتے تاہم یہاں کا اکثر فرنیچر وہاں کے لیے بے جوڑ اور پھر خانہ باغ تو کسی طرح اٹھا لے جانے کی چیز نہیں۔ سمجھنے والے کو ابن الوقت کی یہ حالت تازیانہ عبرت تھی۔ اسی طرح انسان ساری عمر بہ کمال اطمینان دنیا کی درستی میں لگا رہتا ہے اور اس کو دنیا کے ساتھ دلی وابستگی ہو جاتی ہے کہ دفعتہ" اس کو دنیا چھوڑنی پڑتی ہے۔ اور چونکہ وہ دنیا سے مانوس تھا، اس کو دنیا کی ابدی مفارقت کا بہت صدمہ ہوتا ہے۔ وہ ساز و سامان دنیا میں سے کوئی چیز ساتھ نہیں لے جا سکتا ہے اور جو ساتھ لے جا سکتا ہے، یعنی اعمال، وہ عاقبت میں شاید اس سے زیادہ بہ کار آمد نہ ہوں جیسے ایک گھر کے فرنیچر دوسرے گھر میں۔ وہ عاقبت میں اپنے لیے آسائش کی جگہ نہیں پاتا، اور جگہ پاتا بھی ہے تو وہاں کے مناسب فرنیچر نہیں رکھتا۔ خدا اپنے فضل سے ہم کو توفیق دے کہ گرویدہ دنیائے چند روزہ نہ ہوں، اور عاقبت کے لیے جہاں ہم کو سدا رہنا ہے، سامان کرتے رہیں۔ آمین!

ابن الوقت اگر چاہتا تو منت سے خوشامد سے، شاید کار براری کر لیتا۔ مگر وہ تھا مغرور و برخود غلط۔ نہ کسی سے پوچھا نہ گچھا، ایک چٹھی کمانڈنگ افسر کے نام دھر گھسیٹی کہ ہم بالکل انگریزی طور پر رہتے ہیں اور اس وجہ سے پارسال بھی ہم کو مستثنیٰ کر دیا گیا تھا۔ امسال بھی ہمارے ساتھ اسی قاعدے کا برتاؤ ہونا چاہیے۔ کمانڈنگ افسر نے فوراً اس کے جواب میں لکھ بھیجا کہ چھاؤنی میں لوگوں کا بہت ازدحام ہو گیا ہے اور سپاہیوں کی تندرستی کے لیے بھیڑ کا کم کرنا ضروری ہے۔ یہ پہلا انتظام ہے کہ جو لوگ فوج سے علاقہ نہیں رکھتے، چھاؤنی کے اندر نہ رہیں۔ اس جواب کے بعد تدبیر کے سب راستے بند ہو گئے اور چار و ناچار بنگلہ خالی کر دینا پڑا۔ ایک ذرا سی بات میں بے چارہ ابن الوقت بیٹھے بٹھائے ہزار بارہ سو کے پھیر میں آگیا، اور کرکری ہوئی سو الگ۔ وقت پر موقع کا بنگلہ نہ ملا اور خیر ملا بھی تو اپنی غرض کو ڈیوڑھا دونا کرایہ دینا پڑا۔ نقل و حرکت میں اسباب کا اسباب خراب ہوا، اور زیر باری کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں۔

فصل ۱۸

سر رشتہ دار کے بہکانے سے صاحب کلکٹر ابن الوقت سے بد گمان ہوئے

ابن الوقت کو حقیقت میں محسوس نہیں ہوتا تھا کہ نوبل صاحب سے کس قدر تائید پہنچ رہی

ہے ان کا بیٹھ موڑنا تھا کہ ہر طرف سے مصیبتوں نے آگھیرا۔ یوں بھی نوبل صاحب تنخواہ میں عزت میں، کسی طرح کلکٹر سے کم نہ تھے اور پھر کیا انگریز، کیا ہندوستانی، سب کو اس بات کا کامل اذعان تھا کہ بغاوت کا محکمہ عارضی ہے۔ یہ کام ختم ہوا اور نوبل صاحب ضرور قسمت دہلی کے کمشنر ہوں گے۔ یا چیف کمشنر کے سیکرٹری ہو جائیں تو عجب نہیں۔ کیوں کہ چیف صاحب ان کی طرف بہت ملتفت معلوم ہوتے ہیں اسی خیال سے لوگوں کے دلوں میں نوبل صاحب کی بڑی ہیبت تھی اور ان ہی کی وجہ سے سارا عملہ ابن الوقت کے نام سے تھراتا تھا۔ اب جو میدان پایا خالی، ایک دم سے سب کے سب ابھر بیٹھے۔ بیروگی چارج کا روبکار جاری ہوتا تھا کہ عملے لگے آپس میں اشارے کنائے کرنے۔ سب سے پہلے کلکٹری کے چپڑاسی جمع ہو کر سلام کو آئے۔ ابن الوقت اپنے کام میں مصروف تھا۔ جمعدار نے چند قدم آگے بڑھ کر کہا "کلکٹری کے چپڑاسی سلام کو حاضر ہیں۔"

ابن الوقت : (سر اٹھا کر) یہ کیسا سلام ہے؟

جمعدار : حضور مال کے حاکم ہوئے خدا حضور کو لاٹ کرے۔

اتنے میں ایک محرر روبکار اطلاع یابی لکھوانے کے لیے دوڑا ہوا آیا۔ گویا بڑی خوشخبری لایا۔ عملے کے تیور تو بدلے ہوئے تھے سو تھے، چونکہ ابن الوقت میں پانی مرتا تھا، اس کا یہ حال ہو گیا تھا کہ ان کی بات بات کو چھیڑ خانی سمجھتا تھا۔ عجب مشکل آ پڑی تھی۔ اگر کوئی اس کا ادب نہ کرتا تو گستاخ، اور اگر کرتا تو وہ سمجھتا کہ بناتا ہے۔ جائزے کے کوئی شاید چوتھے یا پانچویں دن سررشتہ دار نج پر رپورٹ خوانی کو گیا تو صاحب کلکٹر نے فرمایا کہ چیف کمشنر صاحب محکمہ بغاوت کی تحقیقات کے لیے بہت مستعجل ہیں، اور نوبل صاحب بھی ہم سے چلتے چلتے کہہ گئے ہیں، دیکھو اس کام پر خاص نگرانی رکھنا۔

سررشتہ دار : جہاں تک فدوی کو معلوم ہے ڈیڑھ دو برس کا کام باقی ہے۔

صاحب کلکٹر : ڈیڑھ دو برس؟ ہم سے نوبل صاحب نے کہا اگر وہ ولایت جانے پر مجبور نہ ہوتے تو آخر سال تک بہم وجوہ طے کر دیتے۔

سررشتہ دار : نوبل صاحب نے ہم سے کہا کہ بہت تھوڑے مقدمے فیصلہ کرنے کو ہیں اور ابن الوقت صاحب ان میں کاروائی کر رہے ہیں اور ان کے تصفیے میں زیادہ دیر نہیں ہو گی۔ بڑا کام مثلوں کو مرتب کر کے داخل دفتر کرنا ہے۔ اسی خیال سے ہم نے ایک محرر کی تخفیف کا بھی حکم نہیں دیا۔ اگر عملے یہ سمجھ کر کہ نوبل صاحب نہیں ہیں، کام میں غفلت یا کاہلی کریں تو ہم ان کی سخت سزا کرنے کو موجود ہیں۔ مگر کام ضرور آخر سال تک تمام کرنا ہو

گا۔

سررشتہ دار : عملوں میں تو کس کی مجال کہ سر مو حکم کے خلاف کر سکے۔ بلکہ اگر حضور کا ارشاد ہو گا تو صبح سے شام تک ان سے محنت لی جائے گی۔

صاحب کلکٹر : بس تو مثلوں کی ترتیب عملے کا کام ہے۔

سررشتہ دار : بغاوت کا عملہ فدوی ہی کا رکھوایا ہوا ہے۔ جب یہ محکمہ قائم ہونے لگا تو عملے ڈھونڈے نہیں ملتے تھے۔ جناب نوبل صاحب بہادر نے فدوی کو حکم دیا تو فدوی نے چن چن کر اچھے ہوشیار عملے جمع کر دیے اور فدوی کو بخوبی معلوم ہے کہ عملوں میں سے کسی کا کام پسماندہ نہیں۔ مثلوں میں بڑی فروگذاشت دستخط کی ہے۔ حضور خیال فرمائیں کہ تاوقتیکہ حاکم متوجہ نہ ہو، دستخط کی تعمیل نہیں ہو سکتی۔

صاحب کلکٹر : عملوں نے وقتاً" فوقتاً" احکام پر دستخط کیوں نہیں کرائے؟ یہ ان کا قصور ہے۔ اچھا ان سے جواب لے کر پیش کرو۔ ہم تمام عملہ بغاوت کی سزا کریں گے۔

سررشتہ دار : حضور مالک اور خداوند ہیں۔ فدوی کو جب اس کا علم ہوا تو فدوی نے عملے کو دھمکایا تھا۔ حقیقت حال کا عرض نہ کرنا بھی نمک حرامی ہے۔ کہنے لگے کہ کیا جان غضب میں ہے۔ کہیں تو ماں ماری جائے، نہیں تو باپ کتا کھائے۔ سررشتہ دار صاحب کا ہمارے ڈپٹی صاحب (ابن الوقت) سے کام پڑے تو معلوم ہو۔ نہ ان کے آنے کا ٹھکانا، نہ بیٹھنے کا ٹھکانا، نہ کچہری برخاست کرنے کا ٹھکانا۔ دستخط کرنا تو بڑی بات ہے۔ سلام کے لیے سامنے جانے کے لیے بھی حوصلہ چاہیے۔

صاحب کلکٹر : کیا بات ہے؟ آخر ہندوستانی عملے صاحب لوگوں کی پیشی میں بھی کام کرتے ہیں یا نہیں؟

سررشتہ دار : صاحب لوگ اگر اس طرح قہر کی نظر رکھیں تو ایک دن کام نہ چلے۔ کام کے لیے کسی وقت ناخوش بھی ہوتے ہیں اور پھر دیا[1] بھی کرتے ہیں۔

صاحب کلکٹر : تم کبھی ابن الوقت صاحب کی ملاقات کو گئے ہو؟

سررشتہ دار : میں بے چارہ محرر۔ میری کیا اوقات۔ راہ میں آمنا سامنا ہوا، سلام کر لیا۔

صاحب کلکٹر : تم کبھی ابن الوقت صاحب کے بنگلے پر نہیں گئے؟

سررشتہ دار : دو چار بار دن میں آیا پر سنا ہے کہ اول تو اپنی وضع کے لوگوں کے سوائے کسی ہندوستانی سے نہیں ملتے، اور ملتے بھی ہیں تو گھنٹوں انتظار کراتے ہیں۔ کچہری کے دنوں میں تو کہیں آنا جانا ہو ہی نہیں سکتا۔ رہا اتوار، ایک دن اور اسی میں اپنا اور گھر کا سارا کام

[1] رحم

کاج۔

صاحب کلکٹر: اوہو! ابن الوقت نے اس قدر اپنی شان بڑھا رکھی ہے۔

سررشتہ دار: ان کے شاہانہ خرچ ہیں۔ ہندوستانی کا تو کیا مقدور ہے۔ صاحب لوگ بھی اس طرح بے دریغ خرچ نہیں کر سکتے۔ ایک ہمارے جنٹ صاحب ہیں۔ ڈپٹی صاحب سے چوگنی تنخواہ پاتے ہیں۔ دو گھوڑوں سے زیادہ نہیں رکھ سکتے۔ ایک گھوڑا میم صاحب کی سواری میں رہتا ہے۔ ان کی اپنی سواری کا گھوڑا کچھ بیمار ہو گیا تھا تو اس گرمی میں پیدل کچہری آتے تھے۔

صاحب کلکٹر: کیا ابن الوقت صاحب گھر کے بڑے امیر ہیں؟

سررشتہ دار: ان کا خاندان تو مسلمانوں کے پادریوں کا خاندان ہے۔ یہ اپنی ذات سے ایک بیگم (معشوق محل بیگم) کے مختار تھے۔ بیگم صاحب قلعے کے باہر کشمیری دروازے میں رہتی تھیں۔ غدر ہوا تو حکم دیا کہ تمام مال اسباب قلعے پہنچا دو۔ اہتمام کرنے والے ہمارے ڈپٹی صاحب۔ سنا ہے کچھ کاٹھ کباڑ تو قلعے پہنچا۔ باقی انہوں نے سب اپنے یہاں ڈھلوا منگوایا۔ اتنے میں بیگم صاحب مر گئیں۔ سارا اثاثہ جہاں تہاں رہ گیا۔

صاحب کلکٹر: اگر ایسا ہوا تو بڑی نمک حرامی کی بات ہے۔ اور میں کبھی خیال نہیں کر سکتا کہ ایسے شخص نے سچے دل سے نوبل صاحب کی جان بچائی ہو گی۔

سررشتہ دار: صاحب بہادر کی قسمت اچھی تھی کہ سرکار کی طرف سے کوئی لڑائی نہیں بگڑی ورنہ مسلمان کسی دوسرے مذہب کے آدمی کو دیکھ نہیں سکتے۔ انگریز تو خیر بھلا نئے آئے ہیں، ہم ہندوؤں کو ان کے ساتھ رہتے ہوئے سینکڑوں برس ہو گئے۔ اب ان کا بس چلے تو ایک ہندو کو جیتا نہ چھوڑیں۔

صاحب کلکٹر: اگر واقعی میں نوبل صاحب کی جان کو نیک ارادے سے بچایا تو اس کا یہ صلہ کچھ کم نہیں تھا کہ سرکار نے ان کی اور ان کے تمام خاندان کی جان بخشی کی اور ان کے گھروں کو لوٹنے نہیں دیا۔ یا زرخیز زمینداری تک بھی مضائقہ نہیں۔ لیکن ایک شخص کو حکومت کا عہدہ دینا، میرے نزدیک شاید بالکل خلاف مصلحت ہو۔ کیوں سررشتہ دار، لوگ کیا خیال کرتے ہیں"

سررشتہ دار: ڈپٹی کلکٹری تو ان سے ایک دن نہ چلتی مگر نوبل صاحب بہادر کی پرورش سے کام سدھ ہوتے گئے۔ اب ذرا مشکل پڑے گی۔ عملہ ناراض، اہل معاملہ شاکی۔

صاحب کلکٹر: لوگوں کی ناراضامندی کا اصل سبب کیا ہے؟

سررشتہ دار: عملے تو سخت گیری اور بد زبانی سے ناراض ہیں۔ اور کام بھی وقت پر نہیں نکلتا۔

اہل معاملہ دیر کی وجہ سے نالاں ہیں۔ مہینوں لوگ پڑے جھولتے ہیں۔ تب بہ مشکل چھٹکارا ملتا ہے۔

صاحب کلکٹر: معلوم ہوتا ہے کہ ابن الوقت صاحب کھیل تماشے میں بہت لگے رہتے ہیں۔

سررشتہ دار: یہ بھی ہے، اور لوگ کچھ اور بھی کہتے ہیں۔ یہاں سے جو کبھی کوئی کاغذ طلب کیا گیا تو اکثر یہی جواب آیا کہ ڈپٹی صاحب کے نج پر ہے۔ ابھی حکم اخیر شامل مثل نہیں ہوا۔

صاحب کلکٹر: اب ڈپٹی صاحب کے شاہانہ خرچ کے لیے کسی آمدنی کا تلاش کرنا ضروری نہیں۔ انہوں نے بہت کچھ کما لیا ہو گا۔

رشتہ دار: اگر کمایا ہے تو پھر اتنا کمایا ہے کہ اس سے چہار چند خرچ بھی رکھیں تو ان کو کسی طرح کی کمی نہیں۔

صاحب کلکٹر: تعجب ہے کہ کوئی نالش کیوں نہیں دائر ہوتی۔

سررشتہ دار: نوبل صاحب کے ڈر سے کسی نے دم نہیں مارا۔ اب دیکھنا چاہیے۔ ڈپٹی صاحب بھی متردد متردد تو معلوم ہوتے ہیں۔

صاحب کلکٹر: خیر، اب کام کا کیا انتظام کرنا ہو گا؟

سررشتہ دار: فدوی کے نزدیک تو مناسب یہ ہے کہ ڈپٹی صاحب کو صرف مثلوں کی تکمیل پر چھوڑ دیا جائے کیونکہ یہ بھی بڑا بھاری کام ہے، اور باقی ماندہ مقدمات کو حضور اپنے اجلاس میں منتقل فرما لیں، یا کسی حاکم ماتحت کو دے دیں۔ منشی رام سیوک صاحب کے اجلاس میں بھی کام کی کمی ہے حضور کو معلوم ہے کہ منشی صاحب کیسے زبردست کام کرنے والے ہیں۔ ان کا اہل مد کہتا تھا کہ ہمارے منشی جی مقدمے کا فیصلہ نہیں کرتے، دھوں پھانکتے ہیں۔ بغاوت کے مقدمات بہت ہوں گے تو ہزار ہوں گے۔ منشی صاحب کی تو تین چار مہینے کی چٹنی ہے۔

صاحب کلکٹر: اچھا ایک روبکار لکھ دو۔

سررشتہ دار نے وہیں کھڑے کھڑے دو سطری روبکار لکھ کر دستخط کر چپراسی کے ہاتھ سررشتے میں بھیج دیا۔ صاحب کلکٹر نے روبکار پر دستخط کرتے وقت پھر فرمایا کہ تم محکمہ بغاوت کی خوب نگرانی رکھنا۔

سررشتہ دار: فدوی بخوبی نگرانی رکھے گا اور کارگزاری کا ہفت روزہ حضور کے ملاحظہ میں گزران کر دیا کرے گا۔ لیکن حضور عند الملاقات ڈپٹی صاحب کو ذرا سا ایما فرما دیں گے تو ان کو بھی خیال ہو جائے گا۔

صاحب کلکٹر: سرکاری کام کے لیے ہم کو زبانی کہنا کیا ضروری ہے۔ تحریری حکم دینا چاہیے۔

صاحب کلکٹر تو کہیں ایک بجے ڈیڑھ بجے کچہری آتے تھے' سررشتہ دار رپورٹ خوانی کر کے کوئی گیارہ بجتے بجتے کچہری پہنچا۔ یا تو ایک دن لکھنؤ کے بیلی گارڈن میں جنرل اوٹرام کا استقبال ہوا تھا' یا آج سررشتہ دار کی بہلی دور سے آتی دیکھ کر کلکٹری فوجداری کا سارا عملہ باہر نکل پڑا۔ سررشتہ دار' جو اپنی لٹو دار پگڑی سنبھالتے ہوئے اترے' دیکھا کہ ساری ذریات موجود ہے۔ بہت بگڑے کہ آج کل کے لونڈوں کو جو ذرا بدھ چھو گئی ہو کیا باندر بندریا کا ناچ ہے۔ نام بنام کیفیت پیش کر کے ایک ایک پر جرمانہ کراؤں تو سہی۔ ابن الوقت کی ہوا تو روبکار کے جائزے ہی سے اکھڑ گئی تھی۔ آج مقدمات متدائرہ کے چھن جانے سے لوگوں کی نظر میں اس کی بات اور بھی دو کوڑی کی ہو گئی۔ روبکار میں لکھا تھا کہ مقدمات متدائرہ بلا کاروائی مزید سر اجلاس ہذا کیے جائیں۔ ابن الوقت نے اس پر اتنا تو لکھوا دیا کہ صاحب کلکٹر بہادر کے حکم کی تعمیل کی جائے' اور پھر اس سے اجلاس میں نہ بیٹھا گیا۔ اپنے پرائیویٹ روم میں جا کر چاہا کہ اخبار سے جی بہلائے مگر طبیعت کو حاضر نہ پایا۔ نوبل صاحب کے وقت میں گھر کی حکومت تھی۔ اس نے جانا ہی نہیں کہ نوکری کیا چیز ہے اور ماتحتی کس کو کہتے ہیں۔ اب جو خلاف مزاج باتیں پیش آنی شروع ہوئیں تو اس کو حیرت تھی کہ کلکٹر صاحب برسر پرخاش ہیں یا عجلت کی غرض سے یا محکمہ بغاوت میں اپنی کارگزاری ثابت کرنے کے لیے مقدمات کو اپنے اجلاس میں منتقل کرا لیا ہے۔ جہاں تک خیال کرتا تھا' صاحب کلکٹر کی خصومت کی کوئی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اور کیونکر آتی؟ اس معاملے میں اس کی سمجھ بھی اوندھی تھی۔ ہرچند اس کا عہدہ ڈپٹی کلکٹری کا تھا مگر اس نے ابتدائے تقرر سے محکمہ بغاوت میں نوبل صاحب کے نیچے کام کیا تھا۔ اس کو من حیث الخدمت حکام مال سے کسی طرح کا سروکار نہ تھا۔ ان کا کام الگ' اس کا الگ۔ غرض کچھ تو بے تعلقی اور کچھ پاس وضع (جدید) وہ ان سب سے رہتا تھا بیگانہ وار۔ یہ خبر نہ تھی کہ تقدیر یوں دفعتہ" پلٹا کھا جائے گی۔ خلاصہ یہ کہ ان سے کلکٹر یا جنٹ یا اسسٹنٹ کسی سے رسم و راہ پیدا کرنی یا بڑھانے کا مطلق اہتمام نہیں کیا اور نہ کبھی اس کے ذہن میں گزرا کہ حکام وقت سے' کسی صیغے کے کیوں نہ ہوں معرفت رکھنا داخل فرائض منصبی ہے۔ ہندوستانی کے لیے ڈپٹی کلکٹری اور صدر الصدوری دو ہی جلیل خدمتیں ہیں۔ ہم نے تو جتنے سربر آوردہ ڈپٹی کلکٹر یا صدر الصدور دیکھے سب کا یہی دیکھا کہ کلکٹر تو کلکٹر پادری اور ڈاکٹر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس اور انسپکٹر مدارس اور پوسٹ ماسٹر اور مہتمم خزانہ' غرض کوئی انگریز ہو' بڑا ہو یا چھوٹا' متعہد یا غیر متعہد' اور ملاقات ہو یا نہ ہو' بالالتزام مہینے میں دو چار بار اس کے بنگلے پر حاضری دے آنا ضرور۔

ابن الوقت کو صاحب کلکٹر کی خصومت کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ سو ایک بڑی

وجہ تو اس کی بیگانگی ہی تھی' نہ صرف صاحب کلکٹر سے بلکہ نوبل صاحب کے سوائے تمام حکام ضلع سے یہاں تک کہ اس وقت حکام مال میں کوئی متنفس اس کا اتنا بھی رفیق نہ تھا کہ صاحب کلکٹر سے ذکر آ جائے تو اس کے حق میں کلمہ الخیر کہہ گزرے جو شخص انگریزوں سے دس میں اکڑ رکھتا ہو۔ ہندوستانیوں کو وہ کیا مال موجودہ سمجھ سکتا ہے۔ ابن الوقت نے ان کی استمالت کی ذرا بھی تو پروا نہ کی۔ ساری کلکٹری' فوجداری ایک طرف تھی' اور اکیلا ابن الوقت ایک طرف۔ کسی سے کچھ چھینا نہیں۔ کسی کا کچھ بگاڑا نہیں۔ تبدیل وضع کی وجہ سے سب کے ساتھ خدا واسطے کا بیر۔ غرض ابن الوقت نے جوں توں پرائیویٹ روم میں اکیلے پڑے پڑے وہ دن تو تیر کیا۔ اس نے کئی بار عملے سے پچھوایا بھی کہ اگر ہمارے کرنے کا کچھ کام ہو تو ہم اجلاس پر آئیں۔ عملے نے یہی جواب دیا کہ سررشتہ دار صاحب مقدمات متدائرہ کے لیے بہت جلدی مچا رہے ہیں۔ ہم سب کے سب انہی مثلوں کے چھانٹنے میں مصروف ہیں۔ اور سرکار کے کرنے کا کام اب رہ بھی کیا گیا ہے۔ یہ مثلیں کلکٹر صاحب کے اجلاس میں جائیں گی۔ تب دفتر کے داخلے کے لیے مثلوں کی ترتیب شروع ہو گی۔ اس وقت اگر احکام ترتیبی پر کہیں دستخط رہ گئے ہوں گے تو ایسے کاغذ علیحدہ رکھے جائیں گے۔ بہت سے کاغذ جمع ہو گئے' دستخط کرا لیے۔

ابن الوقت کی خود داری نے اس کے حق میں ایک خرابی یہ اور کر رکھی تھی کہ وہ ہندوستانیوں کے ساتھ ملنے میں مضائقہ کرتا تھا' جس سے ہر شخص اس کے پاس جاتا ہوا جھجکتا تھا۔ اور آج کل جو کاروائیاں درپردہ اس کے خلاف ہو رہی تھیں وہ ان سے مطلقاً" بے خبر تھا۔ نوبل صاحب کے چلے جانے کا ایک اثر یہ تو ضرور اس پر بھی منکشف ہوا کہ جو لوگ اس سے ملتے جلتے رہتے تھے (وہ تھے ہی کتنے) پہلے ہی دن سے ملاقات میں کمی سی کرنے لگے اور اب جو یہ خبر منتشر ہوئی کہ تمام مقدمات متدائرہ صاحب کلکٹر نے اٹھوا منگوائے ہیں' لوگوں نے اس خیال سے کہ مبادا صاحب کلکٹر دیکھ پائیں یا ان تک خبر پہنچ جائے' اس کی کچہری کا آنا جانا تک بالکل ترک کر دیا۔ ابن الوقت کے جی میں آیا بھی کہ چلوں' صاحب کلکٹر سے زبانی کہوں یا چٹھی لکھوں۔ پھر سوچا اور ٹھیک سوچا کہ ابھی تک مجھ کو شکایت کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ مقدمات منگوا لیے' درد سر کم تر یہ کچھ میری تنخواہ تو نہیں گھٹا دی۔ جاگیر تو ضبط نہیں کر لی۔ رہا لوگوں کا خیال' سو انہوں نے تبدیل وضع پر مجھ کو کیا کچھ نہیں کہا اور اب تک کیا کچھ نہیں کہتے۔ میرا ذاتی تعزز جو ہے سو ہے۔

فصل ۱۹

صاحب کلکٹر اور ابن الوقت کا بگاڑ

ہندی کی ایک مثل ہے، دکھتے ہوئے کونڈے بھینٹ۔ رپورٹ خوانی میں سر رشتہ دار ابن الوقت کی طرف سے صاحب کلکٹر کے کان بھر ہی چکا تھا۔ سوئے اتفاق سے آج ہی شام کو ناگہانی گویا اسی مثل کے سچ کرنے کو ابن الوقت کی صاحب کلکٹر سے مڈبھیڑ بھی ہو گئی۔ ابن الوقت کی عادت تو دونوں وقت ہوا خوری کی تھی ہی کوئی ساڑھے پانچ بجتے بجتے کچہری سے سوار ہوا تو سیدھا میرٹھ کی سڑک کو ہو لیا۔ آفتاب تھا پس پشت اور ٹھنڈی ٹھنڈی پوروا ہوا سامنے سے آ رہی تھی۔ شاہدرے سے بھی کوئی کوس ڈیڑھ کوس آگے نکل گیا تھا کہ آفتاب نیچے لٹک آیا۔ چاندنی رات کے خیال سے دل تو ابھی لوٹنے کو نہیں چاہتا تھا مگر جمنا پر کشتیوں کا پل تھا۔ یہ تصور ہوا، ایسا نہ ہو تاریکی میں گھوڑے کا پاؤں کسی گڑھے میں جا رہے۔ ناچار لوٹا تو جس وقت زینت المساجد کے برابر آیا، نمازی مغرب کی نمازیں پڑھ پڑھ کر مسجد سے نکل رہے تھے۔ دریا گنج کے نکڑ پر دور سے اس کو ایسا دکھائی دیا کہ بیچ سڑک پر کوئی انگریز پیچھے سے ٹاپ کی آواز سن کر کنارے ہو گیا۔ ابن الوقت برابر سے نکلا تو پہچانا کہ صاحب کلکٹر ہیں۔ باگ روک کر ان نے خود کہا "ہلو مسٹر شارپ! گڈ ایوننگ ٹو یو۔ مجھے خیال نہیں تھا کہ اس وقت آپ سڑک پر ملیں گے۔ اگر منظور کریں تو میرا گھوڑا حاضر ہے"

صاحب کلکٹر : میں پیادہ پا چلنا زیادہ پسند کرتا ہوں۔

ابن الوقت : آپ میری اس گستاخی کو معاف فرمائیں کہ آپ پیادہ پا ہیں اور میں سوار ہوں۔ یہ جانور اس قدر تیز ہے کہ اگر میں اتر لوں تو یہ ضرور قابو سے باہر ہو جائے گا۔ آپ نے شاید اس کا نام سنا ہو۔ یہی وہ ہیرو ہے جس نے میرٹھ کی گھڑ دوڑ میں بڑا انعام پایا تھا۔ میں نے اس کو سو گنی دے کر مول لیا ہے۔

صاحب کلکٹر : ایسا قیمتی گھوڑا اسٹیشن میں شاید کسی کے پاس نہ ہو گا۔

ابن الوقت : میں بھی ایسا ہی خیال کرتا ہوں۔ میں دریا پار کچھ دور تک چلا گیا۔ شام کی ہوا خوری کے لیے میں اس سمت کو زیادہ پسند کرتا ہوں۔ قرب دریا کی وجہ سے خوب خنکی ہوتی ہے اور سبزہ بھی اس طرف بکثرت ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ آپ نے بھی دریا کے پار دور دور سیر کی ہو گی۔

صاحب کلکٹر : چلنے پھرنے کے لیے مجھ کو جس قدر وقت ملتا ہے، وہ بہت تھوڑا ہے۔ میں اس

کو اپنے ہی ضلع میں صرف کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے میری آگہی اپنے علاقے میں بڑھتی ہے۔

ابن الوقت . چلنے پھرنے کے لیے مجھ کو جس قدر وقت ملتا ہے، وہ بہت تھوڑا ہے۔ میں اس کو اپنے ہی ضلع میں صرف کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے میری آگہی اپنے علاقے میں بڑھتی ہے۔

ابن الوقت : اگر بے موقع نہ ہو تو میں آپ کو اطلاع دیتا ہوں کہ اب میرے پاس کچھ کام نہیں ہے۔

ابن الوقت جواب کا منتظر رہا۔ مگر صاحب کلکٹر نے کچھ جواب نہ دیا تو پھر اس نے کہا "تمام مقدمات متدائرہ قریب تکمیل ہیں۔ میں سب کاروائی کر چکا ہوں۔"

صاحب کلکٹر : آپ کیوں سوکھے پتوں اور کانٹوں کو یاد کرتے ہیں، جب کہ باغ کی ساری بہار آپ ہی کے حصے میں تھی؟

ابن الوقت نے اپنی طرف سے بہتیری کوشش کی مگر صاحب کلکٹر کسی طرح نہ کھلے۔ تاہم دل کی کدورت بلکہ بدگمانی بھی ان کی باتوں سے مترشح تھی۔ ابن الوقت گو اس مزاج کا آدمی نہ تھا کہ بات کو لٹکا رکھے، مگر موقع ہی بونگا آپڑا تھا کہ صاحب کلکٹر پیدل اور یہ سوار۔ اتر نہیں سکتا، معذوری ہے۔ برابر نہیں چل سکتا، بے ادبی ہے۔ آگے نہیں بڑھ سکتا، بے تمیزی ہے۔ پیچھے نہیں ہٹ سکتا، بے عزتی ہے۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ آخر وہ یہ کہہ کر الگ ہو گیا کہ میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔ قلعے میں ایک دوست اس وقت میرے منتظر ہوں گے۔

رات میں اور پھر صبح سے کچہری کے وقت ابن الوقت کو کئی دفعہ صاحب کلکٹر کی باتوں کا خیال آیا۔ آخر یہی رائے قرار پائی کہ جب تک صاحب کلکٹر کی طرف سے ضابطے کی چھیڑ چھاڑ نہ ہو، ان کی بدگمانی یا رنجش کو منہ سے کیوں نکالو۔ ناحق کہنے کی گنجائش ہو جائے گی کہ چور کی داڑھی میں تنکا۔ ادھر صاحب کلکٹر کے ہاں بھی مادہ تیار تھا۔ اگلے دن کچہری پہنچا تو میز پر صاحب کلکٹر کا روبکار رکھا ہوا تھا۔

دفعہ ا۔ کل شام کے وقت ایں جانب دریا گنج کی سڑک پر پیادہ پا چلے آتے تھے۔ ڈپٹی ابن الوقت صاحب گھوڑے پر سوار پیچھے سے ایں جانب کے برابر آ کر باتیں کرنے لگے۔ ڈپٹی صاحب سے اس گستاخی کا جواب طلب ہو۔

دفعہ ڈپٹی صاحب بلا اجازت و اطلاع ایں جانب دریا پار ضلع میرٹھ میں گئے اور ان کے بیان سے معلوم ہوا کہ اکثر جاتے رہتے ہیں۔ اس فعل کے جواز کی سند ان سے پوچھی جائے۔

دفعہ ۳۔ جتنی بار ڈپٹی صاحب کا عبور پل دریائے جمن پر سے ہوا ہے، حساب کر کے محصول بھیج دیں۔ کیونکہ ایں جانب یقین نہیں کرتے کہ ڈپٹی صاحب نے کبھی محصول دیا ہو۔

آج عملوں میں بڑی کھچڑی پک رہی تھی کہ دیکھیں ڈپٹی صاحب اس روبکار پر کیا کرتے

ہیں۔ بعض کہتے تھے کہ بس اب نہیں ٹھہر سکتے۔ استعفا تو کیا دیں گے مگر رخصت لے کر گھر بیٹھ رہیں گے۔ نوبل صاحب کے پاس ولایت چلے جائیں یا شاید دوڑ دھوپ کر کے کہیں بدلی کرا لیں۔ کوئی یہ سمجھتا تھا کہ بہت سے انگریزوں سے ملاقات ہے کسی کو بیچ میں ڈال کر صفائی کرا لیں گے کوئی یہ بھی رائے دیتا تھا کہ بھلے سے ہوں تو اب بھول کر بھی انگریزی وضع کا نام نہ لیں۔ وہ کوٹ پتلون کم بخت کس کام کا رہا ہے۔ دین بھی گیا اور دنیا بھی برباد ہوئی۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ ابن الوقت کو ایک امر کی طرف سے تو اطمینان ہوا کہ صاحب کلکٹر کا مافی الضمیر جلد منکشف ہو گیا۔ اب مقدمات کے اٹھوا منگوانے کی وجہ بھی سمجھ میں آئی اور دریا گنج کی سڑک پر جو اکھڑی اکھڑی باتیں انہوں نے کی تھیں' ان کی بھی بدھ مل گئی۔ ابن الوقت نے فوراً ایک چٹھی صاحب کلکٹر کو لکھی کہ قبل اس کے کہ میں ضابطے کے مطابق آپ کے روبکار کا جواب دوں' اور میں امید کرتا ہوں کہ آپ براہ مہربانی مجھ کو ضابطے کا جواب دینے پر مجبور نہیں کریں گے' میں بہ منت آپ سے التماس کرتا ہوں کہ مجھ کو اپنی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت دیجئے تاکہ میں بالمشافہ آپ کے تمام شبہات رفع کر دوں۔ آپ کو میرے معاملے میں کسی وجہ سے غلطی واقع ہوئی ہے اور اجنبیت کی حالت میں غلطی کا ہونا کچھ تعجب کی بات نہیں۔ اور مجھ کو کامل یقین ہے کہ جب پوست کندہ حقیقت آپ پر ظاہر کی جائے گی' آپ کا دل میری طرف سے ضرور صاف ہو جائے گا۔ میری بدقسمتی ہے کہ صرف انگریزی وضع کے سبب لوگ مجھ سے ناحق دشمنی رکھتے ہیں' اور میرے حاسد بھی کم نہیں۔ پس بہت تھوڑی توقع ہے کہ لوگ بھلائی کے ساتھ میرا تذکرہ کریں۔ میں آپ سے رعایت کی درخواست نہیں رکھتا' بلکہ انصاف چاہتا ہوں۔ اور اگر ازروئے انصاف میں آپ کی مہربانی کا مستحق نہ ثابت ہوں تو اس بے عزتی سے جو حاکم بالادست کی ناخوشی کا ضروری نتیجہ ہے' بہت بہتر ہو گا کہ میں کام سے خود علیحدگی اختیار کروں۔ آپ خود خیال فرما سکتے ہیں کہ قطع نظر روحی تکلیف کے جو مجھ پر گزر رہی ہے' اس حالت میں میرا رہنا کار سرکار کے حق میں کسی طرح مفید نہیں۔

صاحب کلکٹر کا مزاج ابن الوقت کی طرف سے اس قدر برہم تھا کہ انہوں نے بہ استکراہ تمام اس کی چٹھی کے لفافے پر پنسل سے لکھ دیا کہ میں کسی نیٹو کو اپنی کوٹھی پر انگریزی وضع سے دیکھنا نہیں چاہتا۔ اس پر بھی ابن الوقت نے دو دن تک روبکار کو بلا جواب ٹال رکھا۔ تیسرے دن تقاضی کا روبکار آ دھمکا' بہ ایں شدت کہ کچہری برخاست کرنے سے پہلے جواب نہیں دیں گے تو ضابطے کی کارروائی کی جائے گی۔ اب چار و ناچار جواب دینا ہی پڑا۔ صاحب کلکٹر کے اعتراض ان کی یا ان کے سررشتہ دار کی نظر میں کچھ وقعت رکھتے ہوں گے' ابن الوقت نے ایسے دندان شکن جواب دیے کہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ اس نے لکھا کہ!

دفعہ ۱۔ صاحب کلکٹر بہادر بہ حیثیت منصبی مستحق ادب ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ حکام ماتحت ان کے احکام جائز کی تعمیل کریں۔ اور جس ملاقات کے صاحب کلکٹر بہادر شاکی ہیں وہ حیثیت منصبی سے کچھ علاقہ نہیں رکھتی۔ مجھ کو صاحب بہادر غروب آفتاب کے بعد یکایک دریا گنج کے نکڑ پر ملے اور میں جب تک برابر نہیں آگیا' صاحب بہادر کو ہرگز نہیں پہچانا۔ پہچاننے کے بعد میں نے خلاف شیوہ اہلیت سمجھا کہ بدون صاحب سلامت کیے چلا جاؤں' اور صاحب کے بعد دفع مظنہ ء اجنبیت کے لیے ایک دو بات کرنا بھی ضروری تھا۔ میں اس قصور کا معترف' اس پر نادم اور اس کی معافی کا خواستگار ہوں۔

دفعہ ۲۔ میرٹھ کا ضلع شہر دہلی کی فصیل سے ملحق ہے۔ میں ہوا خوری کے لیے اکثر دریا پار جاتا ہوں۔ کوئی حکم ممانعت میری نظر سے نہیں گزرا' ورنہ سرکار اس میں کوئی مفاد ہے کہ عہدہ داروں کو نظر بند رکھے۔ اگر فی الواقع کسی حکم میں اس طرح کی قید ہے تو وہ ناممکن التعمیل اور بے فائدہ ہونے کی وجہ سے قابل منسوخی ہے۔

دفعہ ۳۔ شاید صاحب کلکٹر بہادر کو خیال نہیں رہا کہ فری فنڈ فوجداری سے متعلق ہے ورنہ اجلاس کلکٹری سے کارروائی نہ فرماتے۔ علاوہ بریں چونکہ گھاٹ مستاجری ہے' مطالبہ محصول حق مستاجر ہے۔

قاعدہ ہے کہ غصے میں انسان کی عقل ٹھکانے نہیں رہتی۔ اب جواب سن کر صاحب کلکٹر رپورٹ کرنے کو تیار ہوئے۔ بارے سررشتہ دار نے سمجھایا کہ حضور کیوں رپورٹ کریں۔ حضور کی اتنی نارضامندی کافی ہے۔ اب ڈپٹی صاحب کا حال یہ ہے کہ کچہری کا کوئی مذکوری تک ان کو سلام نہیں کرتا۔ ان کی کچہری کی طرف کوئی جا کر نہیں پھٹکتا۔ جس شخص نے اس زلزلے کی حکومت کی ہو' اس کے حق میں اتنی بے عزتی کچھ کم نہیں۔ صبح شام خود ڈپٹی صاحب کی طرف سے استعفے یا رخصت کی درخواست آنے والی ہے۔ حضور ذرا تامل فرمائیں۔ اور اگر رپورٹ ہی کرنی منظور ہے تو ایسی زبردست رپورٹ ہو کہ وار خالی نہ جائے۔ ڈپٹی صاحب کی جڑ بہت مضبوط ہے۔ نوبل صاحب بہادر نے تعریفیں لکھ کر ان کی لیاقت اور دیانت حکام صدر کے ذہن نشین کر دی ہے۔ مثلیں داخل دفتر ہو رہی ہیں۔ فدوی غلطوں کو اشارہ کر دے گا۔ ساتھ کے ساتھ بے ضابطگیاں چھانٹتے جائیں گے' اور اس اثناء میں عجب نہیں کہ ڈپٹی صاحب پر کچھ مقدمات بھی دائر ہو جائیں۔

بارے سررشتہ دار کے سمجھانے سے کلکٹر کا طیش فرو ہوا اور رپورٹ ملتوی رہی مگر لوگوں میں یہ مشہور تھا کہ روانگی ہو گئی۔ سررشتہ دار موذی اپنی طرف سے مقدمات کے دائر کرا دینے کی بہتیری کوشش کرتا تھا لیکن بچ کیا ہے۔

تو پاک باش برادر مدار از کس باک　　　زنند جامہ ناپاک گازراں بر سنگ

اس کچہری کا در و دیوار تک ابن الوقت کا دشمن ہو رہا تھا۔ مگر چونکہ اس کا معاملہ صاف تھا‘ کسی کو اس کے سامنے پڑنے کی جرات نہ ہوتی تھی اور یہ میرا شیر بدستور اسی شان سے کچہری آتا تھا۔ لوگ اس سے بخوف کلکٹر کنیاتے تھے اور یہ بہ حقارت کسی طرف متوجہ نہیں ہوتا تھا۔ غرض صاحب کلکٹر کی نارضامندی کا اس کو افسوس تھا نہ ہراس۔ ملال تھا نہ خوف۔ کام تو اس سے بالکل چھین لیا گیا تھا۔ یہ اپنے ساتھ اخبار کا بنڈل لاتا تھا۔ فراغت سے بیٹھا پڑھتا۔ بایں ہمہ کلکٹر صاحب کی طرف سے چھیڑ چھاڑ برابر چلی جاتی تھی۔ اپنا ہی عملہ وقت کی ہوا دیکھ کر خود سر ہو گیا تھا کہ حکم کی تعمیل اور کام کو جانفشانی کے ساتھ کرنا تو درکنار پابندی وقت کا لحاظ اٹھا دیا گیا تھا۔ شاذ و نادر ہی کوئی دن جاتا ہو گا کہ صاحب کلکٹر کے یہاں سے تاکیدی روبکار نہ آتا ہو۔ اور تاکید بھی معمولی طور کی نہیں بلکہ اس قدر سختی اور بے تہذیبی کے ساتھ کہ کوئی جابر کوتوال کسی چوکیدار کو بھی ایسے الفاظ نہیں کہتا۔

ادھر ابن الوقت اپنے عملے پر دباؤ ڈالتا تو کچھ موثر نہیں ہوتا تھا۔ اور ہو تو کیونکر؟ دو چار بار عملوں پر جرمانہ کر کے دیکھا۔ سیدھے کلکٹر کے اجلاس پر گئے اور منسوخ کرا لائے۔ چونکہ ہر طرف دق کرنا منظور تھا‘ یہاں تک نوبت پہنچی کہ اجلاس کا کمرا تک خالی کرا لیا گیا۔ وہ جگہ شاندار اور آسائش کی تھی۔ اس کے عوض میں کمرا دیا گیا۔ جس میں دھوپ کی آڑ نہ بوچھاڑ کا بچاؤ۔ اور عملہ ہے کہ سارے دن پتھر کی طرح چھاتی پر دھرا ہے۔ اسی اثناء میں گمنام عرضیاں بھی گزرنی شروع ہو گئیں۔ جن میں سخت گیری اور بے انصافی کی کنایہ شکایتیں مندرج تھیں۔ ان عرضیوں کا گزرنا صاحب کلکٹر کے لیے حجت ہو گیا۔ سارے شہر میں ڈونڈی پٹی۔ جگہ جگہ اشتہار آویزاں ہوئے کہ جس کو ڈپٹی ابن الوقت پر فریاد کرنی ہو بے تامل صاحب کلکٹر صاحب کے اجلاس میں حاضر ہو۔ ادھر عملے نے مثلوں کی خوب روئی دھنکی۔ غرض ابن الوقت پر دو سوا دو مہینے ہر چہار طرف سے ایسا نرغہ رہا کہ ہر روز اس کی موقوفی اور بدلی اور معطلی اور سپردگی فوجداری کی گرم خبر اڑتی تھی اور پھر آپ ہی آپ ٹھنڈی پڑ جاتی تھی۔ جب زیادہ دن گزر گئے تو خود بخود لوگوں کے خیالات بدلنے لگے اور سمجھ گئے کہ بس کلکٹر سے اتنا ہی ہو سکتا تھا کہ کام نکال لیا۔ کمرا چھین لیا۔ دو چار اینڈے بینڈے روبکار لکھوا دیے۔ مگر واہ رے ڈپٹی صاحب! ذرا جو جبین پر میل آیا ہو۔ کیوں نہ ہو۔ مزاج میں اتنا طنطنہ رکھ لے تو حکومت کا نام لے۔ کوٹ پتلون کی خوب شرم رکھی۔ پہلے تو اکثر ایک گھوڑے کی بگھی میں ہی آیا کرتے تھے‘ جس دن سے کلکٹر صاحب کے ساتھ مورچہ لیا وہ دن اور آج کا دن‘ جوڑی کے معمول کو ناغہ نہیں ہونے دیا۔ انگریزوں کے سارے

کام تڑ پڑ کے ہوتے ہیں۔ کلکٹر نے رپورٹ تو ضرور کی ہو گی۔ اب تک جو اس کا ظہور نہیں ہوا تو معلوم ہوتا ہے کہ صدر والوں نے مطلق لحاظ نہیں کیا۔ ہاں نوبل صاحب کا بھی بڑا زبردست کھونٹا ہے۔ اور چاہے مفصلات کے حکام قدر نہ کریں مگر غدر کی خیر خواہیاں سرکار کے دفتر میں چڑھ چکی ہیں۔ ان کو کون میٹ سکتا ہے؟ صاحب کلکٹر بہت بیجا الجھے یہ بھی انہیں لالہ بھائی ڈپٹی کلکٹر سمجھے ہوں گے کہ ذرا گھورا اور مارے ڈر کے لگے گڑگڑانے بلکہ الٹا صاحب کلکٹر سے جواب طلب ہو تو تعجب نہیں۔ اور ہوا ہو تو کس کو خبر۔

فصل ۲۰

ابن الوقت کی مالی مشکلات

شروع سے سارا وبال ابن الوقت کے مال پر تھا۔ کلکٹر صاحب کے بگاڑ میں بھی وہ کئی ہزار کے پھیر میں آ گیا۔ ان کی نارضامندی کی ہوا کا پھوٹنا تھا کہ اگلے دن بلکہ شاید اسی دن خزانچی نے کہلا بھیجا کہ ایسا نہ ہو کہیں صاحب کلکٹر کے کان تک جا پہنچے۔ ڈپٹی صاحب تو ٹھہرے برابر کی ٹکر کے حاکم میری شامت آ جائے گی۔ حساب چکا دیں تو بڑی مہربانی کریں گے۔ اگر صرف خزانچی کا دینا ہوتا تو کچھ تردد کی بات نہ تھی۔ ابن الوقت نے معمول یہ رکھا تھا کہ عین تقسیم تنخواہ کے وقت کچھ زیادہ درکار ہوا تو خزانچی سے منگوا لیا۔ پس ابن الوقت خیال کرتا تھا کہ خزانچی کے بہت اڑ کر نکلیں گے تو ہزار بارہ سو۔ اس سے زیادہ نہیں۔ مگر خزانچی کے تقاضے کے ساتھ اس کے دل میں یہ خدشہ پیدا ہوا کہ اگر گڑ والے اپنا لینا مانگ بیٹھے تو بڑی مشکل ہو گی۔ ان کا حساب کچھ نہ ہو گا تو بھی دس کے پیٹے میں دو چار سو ادھر ادھر۔ اتنے کی سبیل سردست کہاں سے کی جائے گی؟ نوکری کا تو اب اتنا بھی بھروسا نہیں کہ دیکھیے مہینا بھی پورا ہو یا نہ ہو۔ اور مانا کہ رہی بھی تو ایسی متزلزل حالت کہ تنخواہ پر مجھے کون قرض پکڑائے دیتا ہے۔ اب رہا ساز و سامان اس میں شک نہیں کہ عمدہ ہے‘ نفیس ہے‘ قیمتی ہے‘ مگر خریدنے اور بیچنے میں بڑا بل پڑ جاتا ہے۔ اور بیچنا بھی میرا بیچنا۔ خوش خرید کا تو کیا مذکور ہے‘ نیلام کرنا چاہوں تو کلکٹر کے ڈر کے مارے کوئی پاس آ کر کھڑا نہ ہو گا۔ زمینداری کی گنجائش میں کچھ کلام نہیں۔ جنگلی باغات‘ درختان متفرق‘ سائر‘ سوائے بہت سی قسمیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ دس ہزار تو جنگل اور سرور ختی سے جھاڑ لوں گا۔ مگر بابا انعام

خیر خواہی عطائے سرکار، جس کی سند گورنمنٹ کی مہر سے مجھ کو ملی ہے۔ اس کے تو تمغے کا ضائع کرنا بھی بیجا اور بدنما اور نامناسب اور موجب بدنامی ہو گا۔

سب سے بہتر تدبیر یہ ہے کہ بن پڑے تو شہر کے مکانات کو الگ کروں۔ کیوں کہ یہ مکانات اگرچہ فی نفسہا بہت اچھے ہیں، شاہجہانی وقتوں کے بنے ہوئے، لداؤ کی چھتیں، چوڑے چوڑے آثار، اونچی کرسی، وسیع، شاندار، مستحکم پائیدار کوئی غرض مند لینے والا ہو تو ایک خاص بازو والی بارہ دری سے گڑ والوں کا سارا قرضہ اتر جائے۔ جب یہ مکان بنا ہو گا تو دس ہزار کا چونا اور پانی لگ گیا ہو گا۔ تہ خانوں کے روشندانوں کی جالیاں ٹوٹ گئی تھیں تو پانچ سنگ تراشوں نے مرمر کے تین مہینے میں بنائیں اور تیس روپیہ فی جالی لاگت آئی۔ مگر مشکل یہ ہے کہ وہ مکان ہے مسلمانوں کے ڈھب کا، اور مسلمانوں میں کوئی ایسا صاحب مقدور نظر نہیں آتا۔ بھائی حجتہ الاسلام عنقریب پنشن لے کر خانہ نشین ہونے والے ہیں۔ اور حج کے جانے سے پہلے ذکر آیا تھا تو کہتے تھے کہ موروثی مکان میں میرا گزر ہونا دشوار ہے۔ کوئی موقع کا مکان معرض بیع میں ہو تو خیال رکھنا۔ وہ اس کو لے لیں تو بہتر بات ہے۔ مگر ان کے پلے بھی دس ہزار کہاں سے آیا۔ اور ہو بھی تو دس ہزار ایک مکان پر لگا دینا کیا آسان ہے۔ اور پھر ان کے ساتھ بات چیت کروں تو خدا جانے کتنے دن میں جا کر بات طے ہو۔ قیمت یکمشت دیں یا قسطیں ٹھہرائیں؟

آخر سوچ سمجھ کر ابن الوقت نے مولوی حجتہ الاسلام کو لکھا۔ مگر اس طور پر کہ مجھ کو شاید فورا روپیہ درکار ہوا تو میں انتظار نہیں کر سکوں گا۔ ادھر اس نے کہا آؤ گڑ والوں کو ٹٹولو تو سہی۔ ایک آدمی کے ہاتھ کہلا بھیجا کہ ڈپٹی صاحب نے اپنے حساب کی فرو مانگی ہے۔ آدمی کا پیغام پہنچانا تھا کہ گڑ والے تاڑ گئے۔ آدمی سے اتنا کہا، بہت خوب۔ کل ہمارا مختار فرو لے کر حاضر ہو گا۔ اگلے دن خود لالہ تکوڑی مل جا موجود ہوئے اور صاحب سلامت کے بعد پہلی بات انہوں نے یہی کہی کہ کیوں صاحب، ہم سے ایسا کون سا قصور سرزد ہوا کہ آپ نے ہم کو غیر بھی نہیں بلکہ دشمن سمجھا۔ ہم بھی آپ کی دیا سے بھگوان کی دی ہوئی عزت اور ساکھ رکھتے ہیں۔ دنیا میں اونچ نیچ سبھی کے ساتھ لگی ہے۔ ایسا بوجھ رکھیں تو ہماری عزت دو کوڑی کی ہو جائے۔ ڈپٹی صاحب، بوجھ سے دولت نہیں جمع ہوتی۔ ہم کو جو کچھ بھگوان نے دے رکھا ہے، بزرگوں کی نیت کا پھل ہے۔ فرو کے عوض فارغ خطی حاضر ہے۔ جب بھگوان آپ کو اطمینان دے گا، آہستہ آہستہ ادا کر دینا۔ لیکن اس وقت تو ہم آپ سے نہیں لے سکتے۔ بیاج بٹے کی آپ زرا چنتا نہ کریں۔ ہم نے آپ کی بدولت قلعے سے بہت کچھ کمایا ہے ہم سے آنکھوں پر ٹھیکری نہیں دھری جاتی۔

ابن الوقت : خزانچی.....

تکوڑی مل : مجھ کو معلوم ہے کہ آپ کو خزانچی کا بھی کچھ دینا ہے اور مجھ کو یہ خبر بھی پہنچی ہے

کہ انہوں نے اپنا لینا طلب کیا ہے یا طلب کرنے والے ہیں۔ سو آپ کو تو بھگوان نے حاکم بنایا ہے۔ اپنا اپنا کرنا، اپنا اپنا بھرنا۔ اول تو وہ ٹھہرے نوکر۔ دوسرے ان کا جتنا درج ہے، سب سرکاری روپیہ سے ہے۔ ان سے اتنی سہار نہ ہو سکی۔ آپ حکم دیں تو خزانچی کا حساب بھی چکتا کر دیا جائے۔

ابن الوقت : نہیں ان کا حساب کچھ ایسا بہت نہیں ہے۔ اس کی سبیل یہیں سے کر دی جائے گی۔ اور آپ سے فرد منگوانے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ سرکاری ملازم کو اپنے علاقے میں قرض لینے کی ممانعت ہے۔ شروع شروع میں تو مجھ کو اس ممانعت کا علم نہ تھا۔ علم ہوا تو میں نے پروا نہ کی۔

تکوڑی مل : آپ نے بھی بھلا اس کا خیال کیا۔ ممانعت اگر ہے تو کوئی اس پر عمل تو کرتا کراتا نہیں۔ صاحب کلکٹر جو چاہیں سو کریں۔ اس بارے میں کان ہلائیں تو میرا ذمہ۔ وہ خود کب قرض سے بچے ہیں۔ فوجی انگریزوں کی تو میں کہتا نہیں، ملکی انگریز تو ایسا کوئی برلاہی نکلے گا کہ دلی میں اس کو کام ملا ہو اور اس کا نام آپ کی کوٹھی کے بہی کھاتے میں نہ ہو۔ اور نوکری تو آپ نے غدر کے پیچھے کی ہے۔ ہمارا آپ کا لین دین بزرگوں کے وقت کا چلا آتا ہے۔ پھر آپ کی نوکری دوسروں کے سری کی نہیں ہے۔ آپ ہی فرمائیں، آپ کے سوائے اور بھی اپنے وطن میں حاکم ہے۔ آپ کے ساتھ سرکار کی خاص رعایت ہے۔ صاحب کلکٹر اس کی چھیڑ نکالیں گے بھی تو کچھ ہوتا ہواتا نہیں۔ اس بات کا تو میں بیمہ لیتا ہوں۔

فصل ۲۱

ابن الوقت کی پھوپھی زاد بہن کے شوہر حجتہ الاسلام کی آمد آمد

۱۸۵۷ء کے غدر سے پہلے حجتہ الاسلام حج کو گئے ہوئے تھے۔ غدر کی اڑتی ہوئی خبریں انہوں نے عرب میں سنیں۔ دلی کو فتح ہوئے ایسے کوئی بیس بائیس دن ہو گئے ہوں گے کہ بمبئی واپس پہنچے، جہاں غدر کے تفصیلی حالات معلوم ہوئے۔ رخصت میں اتنی گنجائش تھی کہ چاہتے تو دلی ہو کر فراغت سے مہینے سوا مہینے رہ کر اپنے کام پر جاتے۔ مگر معلوم ہوا کہ ابھی جا بجا شورش ہے اور

خاص کر دلی کے مسلمانوں پر ایک طرح کا تشدد ہو رہا ہے۔ یہ صلاح ٹھہری کہ سمندر سمندر مدراس ہوتے ہوئے کلکتے جائیں اور وہاں سے اپنے ضلع میں جا داخل ہوں۔ غرض ابن الوقت کے حالات میں جو تبدیلی واقع ہوا۔ حجتہ الاسلام کی غیبت میں ہوا۔ دونوں میں رسم مراسلت بھی ایسی ہی تھی کہ کبھی اوپر تلے کئی کئی خط آتے جاتے اور کبھی مہینوں ندارد۔ یوں تو ابن الوقت نے بڑے تپاک کے ساتھ حج سے مع الخیر واپس آنے کی مبارک باد کا خط لکھا' ادھر سے انعام خیر خواہی اور نوکری کی لمبی چوڑی تہنیت آئی مگر تبدیل وضع کے بارے میں ابن الوقت کی طرف سے تو کیا ابتدا ہوتی' حجتہ الاسلام نے بھی ایسی خاموشی اختیار کی کہ گویا خبری نہیں۔

ابن الوقت کی پھوپھی نے کئی بار داماد کو لکھوا بھیجا کہ لوگوں کے طعنوں مہنوں نے زندگی دشوار کر دی ہے۔ اب محلے میں رہنے کا ذرا بھر رنگ نہیں۔ تم جس طرح ہو سکے تھوڑے ہی دنوں کے لیے آؤ اور ہم لوگوں کا ٹھکانا کرو۔ مگر حجتہ الاسلام لطائف حیل سے ٹالتا رہا۔ اپنوں میں اور غیروں میں اتنا ہی فرق ہوتا ہے کہ ابن الوقت کی تبدیل وضع سے' جس کو لوگ اپنے پندار میں تبدیل مذہب سمجھتے تھے' خویش و بیگانہ سب ہی ناراض تھے۔ لیکن اب جو مشہور ہوا کہ صاحب کلکٹر پیچھے پڑے ہیں تو غیر اکثر لگے شماتت کرنے' اور اپنوں نے سنا تو سب کے سب گھبرا کر ابن الوقت کی پھوپھی کے پاس دوڑے آئے۔ کیونکہ گھر میں سب سے بڑی بوڑھی وہی تھیں۔ رشتے ناتے کے علاوہ ابن الوقت کی خیر خواہی سے تھوڑے بہت فائدے ان سب کو پہنچے تھے۔

غدر کے بعد کا وقت مسلمانوں پر ایسی سختی کا گزر گیا کہ کرتوڑ اور نہ کرتو خدا کے غضب سے ڈر۔ ہزار ہا ناکردہ گناہ بغاوت کی لپیٹ میں آگئے۔ الا ابن الوقت کے رشتے دار۔ اگر کسی نے جھوٹوں بھی ابن الوقت کا نام لے دیا تو کم سے کم اتنا تو ہوتا تھا کہ کوئی مخبر اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکتا تھا۔ ابن الوقت اپنی ذات سے روکھا تھا' کھرا تھا پھر بھی لوگوں کو اس سے بڑی تقویت تھی۔ وہ کسی کا مقولہ بہت درست ہے۔ **عند المصائب تذهل الاحقاد** اب کسی کو اس کا مطلق خیال نہ تھا کہ ابن الوقت نے ترک اسلام کیا ہے یا وہ انگریزوں کے ساتھ کھاتا پیتا ہے یا قوم اور برادری اور گھر کو چھوڑ کر انگریزوں کے ساتھ جا ملا ہے یا اس نے بزرگوں کے نام کو بٹا لگایا ہے یا اس نے خاندان کی آبرو کو ملیامیٹ کر دیا ہے۔ سارے رنج و شکوئے سے بھول بسر کر سب کو اسی کی پڑی تھی کہ ابن الوقت کو کسی طرح اس بلا سے نجات ہو۔ اس کی پھوپھی تو اس طرح بین کر کر کے روتی تھیں جیسے کوئی مردے کو روتا ہے مگر ملا کی دوڑ مسجد تک۔ سب نے مل کر منتوں اور نیازوں اور چلوں اور عملوں اور دعاؤں کی بھرمار کر دی اور ختم خواجگان **لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین** ○ اور **امن یجیب المضطر اذا دعاه ویکشف السوء** اور **فلم تقتلوهم ولکن الله قتلهم وما رمیت اذ رمیت ولکن الله رمی** اور **اللهم انا نجعلک فی نحورهم ونعوذ بک من شرورهم** حزب البحر اور دلائل الخیرات اور یٰسین شریف اور صلوۃ الحاجہ اور اعمال حصر اللسان کے حربے صاحب کلکٹر پر چلنے شروع ہوئے۔

دنیاوی تدبیروں میں سے تو اور کوئی تدبیر نہ بن پڑی مگر اس مرتبہ ابن الوقت کی پھوپھی نے داماد کو نہیں بلکہ بیٹی کو لکھوا دیا کہ دو مہینے پورے ہو کر تیسرا لگا کہ دلی کا سب سے بڑا انگریز ناحق ناروا تمہارے بھائی ابن الوقت کے پیچھے پڑا ہے۔ تم کو معلوم ہے کنبے میں کوئی اس جوگا نہیں کہ اس مصیبت میں ان کا ساتھ دے۔ میں تمہارے میاں کو لکھتے لکھتے تھک گئی۔ آنے کی ہامی نہیں بھرتے خدا کے لیے تم ان کو سمجھا کر ساتھ لاؤ۔ کھانا وہاں کھاؤ تو پانی یہاں پیو۔ وقت نکل جائے گا اور بات رہ جائے گی۔ بھلا رشتے ناتے کا پاس نہ کرو تو اتنا ہی سمجھو کہ اگر خدانا خواستہ اس کے دشمنوں پر ایسی ویسی بن گئی تو ہم کو دلی میں کون چین سے بیٹھنے دے گا۔ ہم کو تو اسی کے دم کا سہارا ہے۔ خدا اس کو جیتا رکھے اور نیک ہدایت دے اور الٰہی سدا اس کا بول بالا رہے۔ سارے کنبے کے لوگ عذر خواہی کو آئے اور تمہارے میاں کے نہ آنے پر سبھی نے اچنبھا کیا۔ میں نے ہر ایک سے یہی کہہ دیا کہ نوکری کا معاملہ ہے صبح شام میں آنے ہی والے ہیں۔ غرض جس طرح سے بن پڑے اپنے سو کام حرج کرو اور بہت جلد آؤ۔ تھوڑے لکھے پر بہت سا عمل کرو۔

خط پر خط تو پہلے ہی چلے جا رہے تھے' اب ایک تو ادھر سے یہ تقاضا تھا اور ادھر سے ابن الوقت نے بارہ دری کے بیچنے کی فوری ضرورت ظاہر کی۔ حجتہ الاسلام نے سمجھا کہ ابن الوقت کے سنبھالے کچھ سنبھلتی ہوئی نظر نہیں آتی۔ اب دیر کرنی ٹھیک سی بات نہیں۔ ابن الوقت کو لکھا کہ اپنی کوٹھی کو میرے ٹھہرنے کا ٹھکانا کرو اور مجھ کو پہنچا سمجھو۔ اس اثناء میں جاں نثار بھی نوبل صاحب کو بمبئی پہنچا کر آگیا۔ بلکہ وہ صاحب سے پوچھ کر دس دن اپنے گھر بھی رہ آیا۔ اس نے یہاں آکر سنا کہ اتنے ہی دن میں کیا سے کیا ہو گیا۔ چھوٹتے ہی ابن الوقت سے جا شکایت کی کہ آپ نے یہ کیا غضب کیا! اگر صاحب کو ذرا بھی معلوم ہو تو جہاز پر سوار ہونے کا نام نہ لیں۔

ابن الوقت : یہ کیا مناسب تھا کہ میں اس طرح کی علالت میں اور اس پر سفر کی پریشانی میں صاحب کو تکلیف دیتا۔ اور ہر چند سراسر کلکٹر کی زیادتی ہے مگر جو لوگ حقیقت حال سے واقف نہیں مجھ ہی کو قصوروار ٹھہرائیں گے۔ اس کے بارے میں کسی کو اس کا مذکور بھی نہیں کرنا۔

جاں نثار : جناب وہ تو کچھ صاحب کا دانا پانی ہے زور کر رہا تھا کہ بمبئی پہنچتے پہنچتے صاحب اچھے خاصے تندرست تھے (پھر بنگلے کے چھوٹنے اور صاحب کلکٹر کے بگاڑ پڑنے اور نام بنام صاحب لوگوں کی مفصل کیفیت سن کر کہنے لگا کہ) جناب میں تو شروع سے لوگوں کے تیور بدلتے ہوئے دیکھتا تھا۔ وہ خدا جانے صاحب کی ایسی کیا مروت تھی اور نری مروت بھی

نہیں بلکہ دباؤ کہ کسی نے کان تک نہیں ہلایا۔ میری ساری عمر انگریزوں ہی میں گزری ہے۔ ایک ہمارے صاحب تو اپنی ذات سے فرشتہ آدمی ہیں۔ ایسا بشر بھی ہونا مشکل ہے۔ اور دل کا اتنا بڑا کمپو ہے۔ بس دو چار ہی اس طرح کے نیک مزاج لوگ اور ہوں گے۔ زیادہ نہیں ورنہ جناب بھلا کہیں یہ لوگ ہندوستانی کو پتیاتے ہیں۔ میں نے خود صاحب کے منہ سے سنا ہے کہ اب اشراف انگریز ولایت سے بہت کم اترتے ہیں۔ کوئی ذات کا بھٹیارا ہوتا ہے' کوئی موچی' کوئی درزی' کوئی بوچڑ' کوئی نائی۔ تو وہ ذاتی اصالت کہاں جائے؟ بڑے رنج کا مقام ہے کہ آپ نے ہزار ہا روپیہ ہمارے ہی ہاتھوں ان لوگوں کو چٹا دیا اور وقت پر یہ لوگ طوطے کی طرح آنکھیں پھیر بیٹھے۔ گرجے کا کھایا پاپ نہ پن۔ صاحب کلکٹر کو تو ساری خلقت پکارے کہتی ہے کہ کانوں کے کچے ہیں۔ وہ آپ کو بری نظروں سے پہلے ہی دیکھتے تھے۔ ایسا ہوا کہ ہمارے بھائی بندوں میں کسی نے موقع پا کر کچھ پھونک دیا ہے اور میں اب آیا ہوں تو اس کی ٹوہ لگاتا ہوں۔ مگر یہ تو فرمایئے کہ آپ نے اس کے توڑ کی کوئی تدبیر کی؟

ابن الوقت : میں نے تو کچھ بھی تدبیر نہیں کی۔ اور کر بھی کیا سکتا تھا؟ شروع میں تو صاحب کلکٹر سے ملنا چاہا۔ انہوں نے انکار کیا۔ چپ ہو رہا۔

جاں نثار : آپ نے کسی کو بیچ میں ڈالا ہوتا۔

ابن الوقت : (ذرا تیز ہو کر) کیا تمہارا مطلب یہ ہے کہ میں جا کر کسی کی خوشامد کروں کہ صاحب کلکٹر سے میری خطا معاف کرا دو؟ یہ تو مجھ سے ہونی نہیں۔ زیادتی صاحب کلکٹر کی ہے اور ان کو معذرت کرنی چاہیے نہ کہ الٹی مجھ کو۔

جاں نثار : پھر اس سے تو یہ بہتر تھا کہ آپ رخصت لے کر گھر بیٹھ رہے ہوتے۔

ابن الوقت : تم کیسی نادانوں کی سی باتیں کرتے ہو؟ ایسے وقت میں اگر رخصت کی درخواست کرتا تو لوگ یہ سمجھتے کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ دشمنوں کو موقع ملتا۔ صاحب کلکٹر کو حجت ہاتھ آتی اور یقیناً بھانجی مارتے اور رخصت کو منظور نہ ہونے دیتے۔ خیر' اب یہ بتائیو کہ بھائی حجتہ الاسلام صاحب تشریف لا رہے ہیں اور ہمارے ہی پاس ٹھہریں گے۔ ان کے لیے کیا انتظام کیا جائے؟ بنگلے میں بالکل گنجائش نہیں۔

جاں نثار : یہ آپ نے بڑی خوشخبری سنائی۔ اب خدا نے چاہا تو سب کام سدھ ہو جائیں گے۔ اور گنجائش کی نسبت جو آپ نے فرمایا تو وہ مولوی آدمی ہیں۔ ان کو ایک کمرا بھی ہو تو بس بہت ہے۔ ایک کمرا خالی کر دینا ایسا کیا مشکل ہے۔ میں اسباب کو ٹھکانے لگا دوں گا۔

ابن الوقت : میں نہیں سمجھتا کہ میں ایک کمرا بھی ان کو دے سکوں گا۔ اس وقت اس بنگلے میں

آٹھ کمرے ہیں مگر اصل میں چھ تھے۔ دو کمروں میں پارٹیشن کھڑی کر کے دو اور پیدا کیے گئے تو دونوں تنگ۔ نہیں معلوم اس کمرے کو کیسا ڈیزائن کیا گیا تھا کہ ایک متنفس کی بھی تو اس میں بافراغت گزر نہیں ہو سکتی۔ لکھنے پڑھنے کے لیے کوئی جگہ ہی سمجھ میں نہیں آئی۔ ناچار اتر والے لمبے کمرے کو لائبریری بنا کر اسی کے ایک حصے کو ریڈنگ روم کر لیا۔ غرض اب تک ایک باتھ روم ہے۔ اس کی بغل میں ڈریسنگ روم اس کے پہلو میں بیڈ روم سرے پر ریڈنگ روم اس کے برابر لائبریری۔ لائبریری سے ملا ہوا بلیرڈ روم دکن کے سرے والے کمرے میں پیانو اگرچہ بے موقع ہے مگر کیا کیا جائے؟ اسی پر بھی سموکنگ روم کا کہیں ٹھکانا نہیں۔ اسباب ہے کہ برآمدے میں اور کچھ شاگرد پیشہ کے مکانات میں بھرا پڑا ہے۔ سجانے کا تو کلیا مذکور ہے' رکھنے تک کی جگہ نہیں۔ ہندوستان میں کیا برا دستور ہے۔ نہ مجھ سے پوچھا نہ گچھا' ایک دم سے پتھر سا کھینچ مارا کہ ہم تمہارے پاس ٹھہریں گے۔ جب سے خط آیا ہے' میں حیران ہوں کہ کیا کروں کیا نہ کروں!

فصل ۲۲

حجتہ الاسلام آئے اور ابن الوقت کی کوٹھی میں انہوں نے اپنا گزر نہ دیکھا

مہینہ اور تاریخ تو یاد نہیں' پر اتنی بات کا خیال بے شک ہے کہ پانی کے برسنے میں دیر ہوئی۔ مسلمانوں نے صلاح کی کہ جمعے کے دن عید گاہ میں پہلے نماز استسقا پڑھیں اور وہیں جمعے کی نماز ہو۔ جمعرات کو عید گاہ میں صفائی ہوئی۔ شامیانے تنے۔ جا نمازیں بچھیں یکایک رات کو اچھا زور کا پانی برسا وہ سارا منصوبہ ملتوی رہا اور بدستور جمعے کی نماز جامع مسجد میں ہوئی۔ نماز کے بعد لوگ حجتہ الاسلام سے ملے اور پوچھا آپ کب تشریف لائے؟

حجتہ الاسلام : کل بین العصر والمغرب۔ یہ سن کر سب نے کہا آہا! آپ ہی کے قدموں کی برکت ہے کہ خدا نے اپنے بندوں پر رحم فرمایا۔

ڈاک گاڑی ابن الوقت کے احاطے میں داخل ہوئی تو یہ ہوا خوری کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔ مگر نوکروں کو معلوم تھا۔ گاڑی آتی ہوئی دیکھ کر سب نے نکل کر سلام کیا۔ خانساماں نے

قریب جا کر اطلاع کی کہ سرکار سوار ہو گئے ہیں۔ کئی دن سے دریا کی طرف تشریف لے جاتے تھے۔ آج کسی اور طرف نکل گئے ہوں گے۔

حجتہ الاسلام نے آکر پہلے بالتفصیل اندر باہر کوٹھی کو دیکھا۔ خدمت گار وضو کا آفتابہ لیے ساتھ ساتھ تھا۔ آخر حجتہ الاسلام نے خدمت گار سے کہا کہ بھائی' یہاں تو کہیں وضو کا ٹھکانا نظر نہیں آتا۔ برآمدے میں لوٹا رکھ دو' اور خانساماں سے پوچھ' یہاں کہیں آس پاس مسجد بھی ہے؟

خانساماں : (چاروں طرف دیکھ کر) کہیں نظر تو نہیں آتی۔

حجتہ الاسلام : تم کتنے مسلمان ڈپٹی صاحب کے ساتھ ہو؟

خانساماں : (آہستہ آہستہ انگلیوں پر گن کر) درزی' سقہ' دو چوکیدار تین' باورچی کے ہاتھ کے تلے کے دو میٹ' کتنے ہوئے' پانچ دو سائیس دو چپراسی نو۔ ایک میں دس (پکار کر) دس۔

حجتہ الاسلام : ماشاء اللہ! پھر تم اور تمہارے سرکار نماز کہاں پڑھتے ہو؟

داروغہ نے شرما کر گردن نیچے کر لی۔ وضو کے بعد حجتہ الاسلام اپنے خدمت گار سے پوچھا کہ تم کو وضو ہے؟

خدمت گار : جی ہاں مجھ کو تو وضو ہے۔

حجتہ الاسلام : اچھا تو نیک مرد (دوسرے خدمت گار کا نام ہے) کو اسی طرف کو بلا لو۔ کہ دنیا' دونوں جا نمازیں گاڑی میں سے لیتے آئیں۔ یہاں نماز وغیرہ کا کچھ اہتمام معلوم نہیں ہوتا۔ تمام کمروں میں جدھر دیکھو تصویریں ہی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ بس یہی برآمدہ ٹھیک ہے۔

یہ کہہ کر حجتہ الاسلام نے خود اذان کہی۔ اذان کی آواز سے کسی کے کان آشنا نہ تھے۔ اصطبل میں گھوڑوں نے کنوتیاں کھڑی کیں اور کتے لگے رونے اور بھونکنے۔ بارے حجتہ الاسلام نے اپنے دونوں نوکروں کے ساتھ جماعت کی نماز پڑھی مگر بہ دقت۔ نماز کے بعد خانساماں سے پوچھا کہ تمہارے سرکار کس وقت واپس آیا کرتے ہیں؟

خانساماں : ان دنوں تو اکثر دن چھپنے سے ذرا پہلے چلے آتے ہیں۔

حجتہ الاسلام : پھر کیا کرتے ہیں؟ ان کے سارے معمول بیان کرو۔

خانساماں : پہلے تو کوئی نہ کوئی صاحب لوگ ضرور ان کے ساتھ آیا کرتا تھا اور کوٹھی پر بھی ایک دو صاحب آموجود ہوتے تھے۔ آج کل صاحب لوگوں کا آنا جانا بہت کم ہو گیا ہے' اور سرکار بھی کہیں نہیں جاتے۔ دس بجے کھانا کھاتے ہیں۔ اس وقت تک کتاب یا اخبار پڑھتے رہتے ہیں۔ کھانے کے بعد آدھ گھنٹے تک انٹا کھیلتے ہیں۔ پھر چائے پی کر سونے کے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ صبح کے آٹھ بجے بیدار ہوتے ہیں۔ غسل کیا' کپڑے بدلے'

کھانا کھایا' کچہری کو چلے گئے۔

حجتہ الاسلام : اوہو صبح کے آٹھ بجے اٹھتے ہیں۔ پھر جناب رات کے بارہ بجے سے ادھر تو سوتے بھی نہ ہوں گے۔

خانساماں : ان دونوں کا ٹھیک حال معلوم نہیں۔ صاحب لوگوں کی آمد و رفت کثرت سے تھی۔ تو رات کے دو دو بجے تک جمگٹھا رہتا تھا۔

حجتہ الاسلام : کھانا کس قسم کا پکتا ہے اور کون پکاتا ہے؟

خانساماں : انگریزی کھانا ہوتا ہے اور مدراس کی طرف کا ایک کشلیا نامی باورچی ہے' وہی پکاتا ہے۔

حجتہ الاسلام : کون ذات ہے؟

خانساماں : ہندو' مسلمان' انگریز سب کا جھوٹا کھالیتا ہے۔ اس سے پوچھو تو اپنے تئیں اروا بتاتا ہے۔ نہیں معلوم اروے کون ہوتے ہیں۔ مگر اس کے کھانے کی بڑی تعریف ہے۔ صاحب کمشنر کے یہاں جب بڑا کھانا ہوتا ہے' اسی کو بلوا بھیجتے ہیں۔

غرض اچھے سوا ڈیڑھ گھنٹے حجتہ الاسلام نے خانساماں سے باتیں کیں۔ اس اثناء میں کے خدمت گار نے گاڑی سے اسباب اتارنے کے لیے پوچھا بھی مگر اس نے کہا' ابھی ٹھہرو۔ تھوڑی دیر بعد کہوں گا۔ اب نماز مغرب کا وقت قریب آیا تو خدمت گار نے کہا "حضور' کوچوان بہت جلدی مچا رہا ہے۔

حجتہ الاسلام : اس کو سمجھا دو کہ صبر کرو۔ مغرب کی نماز پڑھ لیں۔ ڈپٹی صاحب بھی آنے والے ہیں۔ ان سے ملنے کے بعد چلیں گے۔ گھوڑے کھول دو' گھاس ڈال دو' اور تقاضا مت کرو۔

عصر کے وقت تو کتے صرف اذان پر کھو رولائے تھے' اب اذان کے علاوہ نماز بھی جہری تھی۔ دوسرے کتے مغرب سے ذرا پہلے دستور کے مطابق کھول بھی دیے گئے تھے۔ بہتیرا ہی خانساماں' اور کتوں پر جو بھنگی تھا وہ' اور دوسرے لوگ بھی ڈانٹتے اور دھمکاتے' مگر کتے سرکار کے منہ لگے ہوئے' ایک نہ مانی اور سب کے سب نرغہ کر کے چڑھ آئے۔ ہرچند حجتہ الاسلام کو ہر حالت کے مناسب نماز کا قاعدہ معلوم تھا مگر یہ حالت ہی انوکھی تھی۔ اللہ اکبر تو وہ کہ گزرا اگر کہیں کہیں ایک لفظ بھی اس کے منہ اور نکلے تو کتے ضرور اس کا ٹینٹوا لے لیں۔ بارے اتنے میں ابن الوقت آپہنچا۔ گھوڑے کی آہٹ پا کر کتے اس کی طرف لپکے اور ادھر حجتہ الاسلام نے کڑک کر اپنی اذان اور نماز تمام کی۔ نماز کے بعد دونوں بھائی ملے تو ابن الوقت نے کہا "بنگلے کو تو آپ دیکھ چکے ہیں۔ اب اپنی آسائش کے موافق اسباب کے جہاں تہاں رکھنے کا حکم دیجیے اور تمام بنگلے پر تصرف کیجیے۔

افسوس ہے کہ کمرے کم اور چھوٹے ہیں۔ لیکن میں نوبل صاحب کی کوٹھی میں بھی جا سکتا ہوں۔

فصل ۲۴

حجتہ الاسلام اور ابن الوقت کی ملاقات اور مذہبی گفتگو کی ابتدا بحث اسباب

حجتہ الاسلام : میں نے جس وقت دہلی آنے کا ارادہ کیا' اسی وقت یہ بات بھی دل میں ٹھہرالی کہ تمہارے ہی پاس ٹھہروں گا۔ چنانچہ تم کو لکھ بھی بھیجا تھا۔ اب اگر تم دوسری کوٹھی میں چلے گئے تو میرا یہاں ٹھکانا بھی بے لطف ہے۔

ابن الوقت : لیکن تنگی کے ساتھ رہنے میں اس سے زیادہ بے لطفی ہو گی۔ میں بھی بہ مجبوری اس بنگلے میں پڑا ہوں۔ اس کی ساخت سے معلوم ہے کہ یہ بنگلہ رہنے کے لیے نہیں بنایا گیا بلکہ شاید کسی خاص طرح کا آفس یا گودام رہا ہو گا۔ میں شروع سے چھاؤنی میں رہتا تھا۔ وہ بنگلہ اس قدر وسیع تھا کہ کبھی کبھی چار چار صاحب لوگ بھی میرے یہاں مہمان رہے ہیں۔ اتنا بھی تو نہیں معلوم ہوا کہ کدھر پڑے ہیں' کہاں اٹھتے ہیں' کہاں بیٹھتے ہیں۔ مدت کے قیام میں اس کو میں نے اپنی مرضی کے مطابق درست کرا لیا تھا۔ کمروں کی وسعت کے مناسب فرنیچر بہم پہنچایا تھا۔ بڑی محنت سے خانہ باغ آراستہ کیا گیا۔ گرمی کی وجہ سے کچھ یونہی روایت ہوا میں ہوئی۔ کمانڈنگ افسر نے ڈر کے مارے فوجی عہدہ داروں کے علاوہ جتنے لوگ چھاؤنی میں تھے' دفعتاً سب کو اٹھا دیا۔ ہر چند تلاش کیا' کوئی بنگلہ ڈھب کا نہ ملا۔ ہار کر یہ بنگلہ ملا تو اس میں بھی دو کمرے میں نے اپنی تجویز سے زیادہ کیے ہیں۔ اس پر بھی مطلق گنجائش نہیں۔ اسباب برآمدے میں پڑا پڑا خراب ہو رہا ہے۔ لو کیلٹی چنداں بری نہیں مگر خوف ہے کہ کہیں تنگی کی وجہ سے تندرستی میں خلل نہ آ جائے۔

حجتہ الاسلام : سچ ہے انسان بھی عجیب قسم کی مخلوق ہے۔ پھیلنا چاہے تو یہاں تک کہ دو بادشاہ در اقلیمے نہ گنجند۔ اور سکڑنے پر آئے تو اتنا کہ وہ درویش در گلیمے یہ خسپند مجھے تو بس ایک کمرا کافی ہے۔ اور میں اپنے گھر پر بھی ایسے ہی مختصر طور پر رہتا ہوں۔ یوں تو

مکان بہتیرا وسیع ہے مگر میرے ذاتی استعمال میں صرف ایک دالان اور ایک حجرہ ہے جن کا مجموعہ تمہارے اس کمرے کے شاید برابر ہو۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ کچھ چھوٹا ہی ہو گا۔ سو دالان اور حجرہ بھی میرے استعمال میں اس طرح پر ہے کہ جاڑے کے دنوں میں تو میں دالان میں کبھی پاؤں بھی نہیں رکھتا۔ حجرے میں میری چارپائی بچھی رہتی ہے۔ چارپائی کے آگے اتنی جگہ ہے کہ فراغت سے پانچ چھ اور ذرا تنگی سے سات آٹھ آدمی بیٹھ سکتے ہیں۔ لوگوں نے ملنا جلنا' لکھنا پڑھنا' کھانا پینا' نماز پڑھنا' غرض میری اکثر ضرورتوں کے لیے وہی حجرہ کفایت کرتا ہے۔ اور میں یہ خیال کرتا ہوں کہ اتنی بڑی زمین سے آخر کار مجھے چند روز کے بعد ایک قبر کی جگہ ہی ملے گی اور نہیں معلوم وہ بھی کہاں۔ اور اس کا بھی پورا یقین نہیں۔ تو بے اختیار حضرت لقمان کا مقولہ یاد آتا ہے ان هذا لمن یموت کثیرا۔

ابن الوقت : مجھ کو تو حیرت ہے کہ اس طرح کی زندگی میں آپ کی تندرستی کیونکر باقی رہتی ہے۔

حجتہ الاسلام : اس طرح باقی رہتی ہے جس طرح اور لاکھوں کروڑوں بندگان خدا کی باقی رہتی ہے۔ اور جس طرح اب سے ڈھائی تین برس پہلے خود تمہاری باقی رہتی تھی۔

ابن الوقت : کیا خاک باقی رہتی ہے۔ ابھی پورے دو مہینے بھی نہیں ہوئے کہ صدہا آدمی شہر میں ہیضے سے مر چکے ہیں۔ لگا تو ہمارے یہاں بھی لگ چکا تھا۔ شروع شروع میں کچھ آدمی بازار میں مرے۔ بعض صاحب لوگوں کے شاگرد پیشوں میں ہیضہ تو کئی کو ہوا مگر شاید دو آدمی ہلاک ہوئے خیر' ان لوگوں میں اگر ہیضہ پھیلا تو کچھ تعجب کی بات نہیں۔ کیونکہ کتنی ہی تاکید کی جائے' یہ لوگ صفائی کا اہتمام جیسا چاہیے' نہیں رکھتے مگر بارک ماسٹر کے کمرے میں تین صاحب لوگ اور ٹھہرے ہوئے تھے۔ چار گھنٹے آگے پیچھے سب نے ہیضہ کیا۔ ایک انجنیئر تو مرا' باقی بچ گئے۔ چھاؤنی میں اس کا بڑا غل ہوا اور کمانڈنگ افسر نے ڈاکٹر سے کیفیت طلب کی۔ ڈاکٹر صاحب نے بہتیری ہی تحقیقات کی مگر کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ بارک ماسٹر کے بنگلے میں ہیضہ کہاں سے آکودا۔ بنگلہ بڑے اونچے ٹیلے پر واقع ہے۔ اطراف و جوانب میں بنگلے کے شاگرد پیشوں میں کہیں بیماری کا نام نہیں۔ بنگلے کے آس پاس کیا بلکہ سو سو ڈیڑھ ڈیڑھ سو قدم کے فاصلے تک تالاب نہیں' نالی نہیں' خندق نہیں' کھیتی نہیں' جھاڑ جھنکاڑ نہیں' قبرستان نہیں۔ چاروں طرف کف دست میدان پڑا ہے' صاف ستھرا۔ آخر سراغ لگاتے لگاتے کیا معلوم ہوا کہ چائے کے لیے جس گھوسی کے یہاں سے دودھ آتا ہے وہ بھینسوں کو موضع دکھیاری کے تالاب میں لے جا کر پانی پلاتا ہے اور دکھیاری میں اس بیماری کا بڑا زور تھا۔

حجتہ الاسلام یہ سن کر بے اختیار ہنس پڑا اور کہنے لگا کہ واقع میں ڈاکٹر صاحب نے سبب تو خوب گھڑا۔ ہیضہ گاؤں سے تالاب میں آیا تالاب سے بھینس میں۔ بھینس سے دودھ میں۔ دودھ سے چائے میں چائے سے صاحب لوگوں میں۔ مگر انہی ڈاکٹر صاحب سے یہ بھی پوچھنا چاہیے تھا کہ دکھیاری میں کہاں سے آیا۔

ابن الوقت : عموماً ہندوستانیوں کا اور خصوصاً دیہاتیوں کا اور غربا کا طرز تمدن اس طرح کا واقع ہوا ہے کہ ہندوستان کی سرزمین میں ہر جگہ ہیضہ کا بیج موجود ہے۔ گرمی پڑی اور بیج پھوٹا۔ دکھیاری میرا دیکھا ہوا ہے۔ ہوا خوری کی تقریب سے میں کئی بار اس گاؤں سے ہو کر نکلا ہوں۔ کوئی دو پونے دو سو گھر کی بستی ہے اور ابھی حال ہی میں دس برس کے اندر اندر آباد ہوئی ہے۔ معلوم ہوا کہ جس کو گھر بنانا منظور ہوتا ہے' ایک جگہ مقرر کر کے وہیں سے مٹی کھود کر دیواریں کھڑی کر لیتا ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ کوئی گھر نہیں جس کے پاس گڑھا نہیں۔ گھر کا کوڑا کرکٹ' گوبر' اپلا' انہی گڑھوں میں ڈالتے رہتے ہیں۔ ہر گڑھا کھاد کا کھتا ہے۔ برسات کے دنوں میں پانی بھر کر سارے برس پڑا سڑتا ہے۔ یہ تو بستی کی کیفیت ہے۔ گاؤں کے قریب ایک تالاب ہے۔ اس میں عورت مرد نہاتے اور مویشی پانی پیتے ہیں۔ بیچ میں سنگھاڑے بوئے ہیں۔ ایک طرف تو بہت دور تک سن کے انبار پڑے ہیں اور وہیں دھوبی کپڑے دھوتا ہے۔

حجتہ الاسلام : کیا اسی تالاب نے انجینیر صاحب کو مارا ہے؟

ابن الوقت : نہیں صاحب وہ تو سوانے پر کا دوسرا تالاب ہے اور گاؤں کے تالاب سے کسی قدر صاف بھی ہے۔

حجتہ الاسلام : جو کیفیت تم نے دکھیاری کی بیان کی' حقیقت نفس الامری ہے۔ اور دکھاری پر کیا موقوف ہے' تمام دیہات کا یہی بلکہ صفائی کے اعتبار سے' اس سے بدتر حال ہے۔ مگر یہ تو کہو' اسی حالت میں بعض جو مبتلائے ہیضہ ہوئے' ان میں سے بھی بعض مرے اور بعض جیتے رہے۔ بلکہ یوں کہو کہ کم مبتلائے ہیضہ ہوئے' اور ان میں سے بھی کم مرے۔ تو جو لوگ بالکل ہیضے سے محفوظ رہے' ان کے محفوظ رہنے کا اور جو مبتلائے ہیضہ ہو کر جانبر ہوئے' ان کے جانبر ہونے کا کچھ نہ کچھ سبب تو ضرور ہو گا یعنی اگر مرض اور موت کے لیے سبب درکار ہے تو تندرستی اور زندگی کے لیے بدرجہ اولیٰ کیونکہ مرض اور موت کے واقعات کم ہیں اور تندرستی اور زندگی کے کہیں زیادہ۔

ابن الوقت : میں ایسا سمجھتا ہوں کہ لوگوں کے مزاج ہیں متفاوت۔ بعض طبائع میں متاثر اور مغلوب مرض ہونے کی استعدادی قوی ہوتی ہو گی' بعض میں ضعیف۔

حجتہ الاسلام : تفاوت امزجہ سے تمہاری مراد صفراوی' بلغمی' دموی' سوداوی کا اختلاف ہے؟

ابن الوقت : نہیں۔ ان تمام مزاجوں کے آدمیوں کو یکساں طور پر مبتلا ہوتے دیکھا اور مرتے بھی دیکھا۔ بلکہ وہ کسی خاص قسم کی تکلیف ہوتی ہو گی۔ جو طبیعت کو قبول مرض کے لیے پہلے سے آمادہ کر رکھتی ہو گی۔

حجتہ الاسلام : تو جس کو تم سبب سمجھتے تھے' سبب نہ رہا۔ کیونکہ بدون استعداد طبیعت کے اس کے عمل معطل ہے۔ اس کے علاوہ بعض اوقات یورپ کے ایسے مقامات بھی مبتلائے ہیضہ ہوئے ہیں جن میں صفائی کے بڑے اہتمام ہیں۔ پس تمہارے اصول کے مطابق ان مقامات میں ہیضہ کے پیدا ہونے کا کوئی محل ہو ہی نہیں سکتا۔ مدتوں تک ڈاکٹر اس مرض کو متعدی مانتے رہے بہ ایں شدت کہ جو شخص بدقسمتی سے اس مرض کی جھپیٹ میں آ جاتا تو کوئی اس کی تیمارداری تک کو کھڑا نہ ہوتا۔ مرے پیچھے اس کے کپڑے لتے سب جلا ڈالتے' مکان میں دھونیاں سلگاتے' قلعی پھرواتے' مٹی تک کھود کر پھینکوا دیتے اور ابھی تک اکثر بندرگاہوں میں کورانٹائین (قرنطینہ) کے قواعد بڑی سختی کے ساتھ مروج ہیں۔ بہر کیف' مرض کے متعدی ہونے کی صورت میں ممکن ہے کہ ہیضے کا وطن اصلی اور اس کی پیدائش کی جگہ ہمارا ہی ملک ہو اور لوگوں کی اختلاط کی وجہ سے یورپ میں جا نکلتا ہو۔ مگر اب تو بڑے بڑے ڈاکٹروں کا اجماع اس پر ہے کہ تعدیہ کی کچھ اصل نہیں۔ بات یہ ہے کہ ہر چند فی مانا جہاں بہت سے جدید علوم ایجاد ہوئے ہیں' فن طبابت میں بھی بڑی نمایاں ترقی ہوئی ہے۔ مگر تاہم ظنی رہے اور انتظام الٰہی مقتضی ہے کہ ظنی رہے۔ جب لوگ ہیضے کے متعدی ہونے کے معتقد تھے' وہ بھی ایک امر مظنون تھا۔ اب اگر عدم تعدیہ کے قائل ہیں تو یہ بھی امر مظنون ہے۔ ڈاکٹر اپنی طرف سے بتیرے ٹامک ٹوئیے مارتے پھرتے ہیں مگر اس وقت تک کہیں سے کچھ پتا نہیں چلا کہ ہیضہ ہے کیا چیز' کیوں کر پیدا ہوتا اور ترقی کرتا اور کیوں معدوم ہو جاتا ہے؟ اور جس طرح سانپ کے کاٹے کا کوئی تریاق محقق نہیں' اسی طرح ہیضہ کا کوئی حکمی علاج معلوم نہیں۔ بس بھائی' ہم تو اپنے ایمان کو ڈانوا ڈول نہیں ہونے دیتے۔ دل میں یہ بات ٹھن گئی ہے کہ اپنی خوشی سے دنیا میں آ نہیں گئے۔ خدا نے پیدا کیا ہے۔ اسی نے ہر فرد بشر کی حیات کی ایک مدت مقرر کر دی ہے اور اس مدت کی خبر بھی اپنے ہی تک رکھی ہے۔ کسی کو اس سے آگاہی نہیں۔ وقت سے پہلے کوئی مر نہیں سکتا۔ پھر کیوں گھبرائیں' اور وعدہ پورا ہوئے پیچھے کوئی رک نہیں سکتا تو کس برتے پر اترائیں اذجاء اجلھم لایستاء خرون ساعتہ ولا یستقدمون ○

ابن الوقت : آہا! معلوم ہوتا ہے کہ آپ دنیا کو عالم اسباب نہیں جانتے بلکہ شاید عقل و تدبیر کو

بھی نہیں مانتے۔

حجتہ الاسلام : بس ایسا ہی عالم اسباب مانتا ہوں کہ متصرف فی الامور وہ خود ہے اور کسی مصلحت سے اس نے اسباب کا جال پھیلا رکھا ہے۔ اور اسباب و نتائج میں جو تعلق ہے اس کو میں اسرار الٰہی میں سے سمجھتا ہوں‘ فہم بشر سے خارج۔ اسباب کو ایجاد اور تکوین میں اتنا بھی تو دخل نہیں جتنا ایک کاریگر کے اوزار کو اس کے عمل میں ہوتا ہے۔ کاریگر اوزار کا محتاج ہے اور خدا جل و علی شانہ‘ کو کوئی سبب درکار نہیں۔ مگر ہاں عادت الٰہی یونہی جاری ہے‘ الا ماشاء اللہ کہ ہر واقعے کے لیے کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے۔ اسباب نامتناہی ہیں اور ان پر بتمامہا احاطہ کرنا مقدور بشر نہیں۔ مگر خدا نے جب جتنا مناسب سمجھا انسان پر منکشف کیا۔ وما اوتیتم من العلم الا قلیلا اگرچہ عقل انسانی کسی حالت میں خطا سے محفوظ نہیں مگر اسباب کے بارے میں تو لوگ ایسی ایسی مکروہ غلطیاں کرتے ہیں کہ معاذ اللہ! عالم اسباب میں پیدا ہوئے‘ عالم اسباب میں رہے۔ کوئی واقعہ نہیں جس کے لیے ان کو تفتیش نہ ہو۔ اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ اصل سبب کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا تو ادعائی اسباب ٹھہرا لیتے ہیں۔ نجوم اور جفر اور رمل اور قیافہ وغیرہ بہت سے لغویات ہیں جن کا ماخذ سوائے اسباب ادعائی کے اور کچھ نہیں۔ اور کبھی سبب تو ہوتا ہے ٹھیک‘ اس کے شرائط کا خیال نہیں رہتا۔ مثلاً فرض کرو کہ سیسے کی ایک گولی ہو اور اسی قدو قامت کی دوسری گولی روئی کی ہو‘ ہلکی پھلکی‘ اور قطب صاحب کی لاٹ پر جا کر دونوں گولیوں کو ایک ساتھ چھوڑ دیں تو ضرور سیسے کی گولی پہلے گرے گی۔ اب یہ ایک واقعہ ہے اور اس کا سبب ہے‘ ثقل۔ مگر اس کے ساتھ ایک شرط بھی ہے کہ لاٹ کی چوٹی سے زمین تک گولیوں کے رستے میں خلا نہ ہوگی تو گرنے میں ہلکی بھاری دونوں برابر۔

پھر انسان سبب بھی اپنی مرضی کو ڈھونڈتا ہے۔ یعنی جس قسم کے اسباب کا خوگر ہے۔ مثلاً اگر کوئی مریض کیسی ہی ردی حالت اس کی کیوں نہ ہو‘ دوا سے اچھا ہو جائے تو کسی کو استعجاب نہ ہو کیونکہ دوا درمن سے اچھا ہونا ایک معمولی بات ہے۔ لیکن فرض کرو کہ بجائے دوا کے کوئی شخص دم کر دینے یا نظر بھر کر دیکھ لینے سے سلب مرض کر دے تو سننے والوں میں تو شاید سو میں سے ایک کو بھی یقین نہ آئے اور دیکھنے والے بھی اکثر جادو اور نظربندی اور مغالطے ہی پر محمول کریں اور اسی بناء پر فلاسفر اور دہری معجزات پر بڑے شدومد کے ساتھ اعتراض کرتے چلے آئے ہیں۔ میں نے کسی دہری کی تحریر دیکھی ہے جس میں اس نے لکھا تھا کہ قانون فطرت یا عادت اللہ شہادت کے لیے کسوٹی ہے۔ شہادت وہیں تک معتبر ہو سکتی ہے کہ قانون فطرت کے مطابق ہو۔ یعنی اس کا مقولہ یہ تھا کہ قانون فطرت کے خلاف ہم کسی شہادت کو نہیں مان سکتے۔ یا بہ عبارت

دیگر مخالفت قانون فطرت شہادت کے متہم با لکذب بلکہ مردود کرنے کو کافی ہے۔ یہ صاف مصادرہ علی المطلوب ہے۔ جب ایک شخص کہتا ہے کہ فلاں واقعہ خلاف معمول مستمر واقع ہوا مثلاً یہ کہ ایک شخص نے ایک ڈول پانی سے ایک لشکر کو سیراب کر دیا تو اب صرف اس وجہ سے کہ یہ واقعہ عجیب و غریب ہے‘ وقوع واقعہ سے انکار کرنا ہیکڑی اور ہٹ دھرمی اور کج فہمی نہیں تو کیا ہے؟ **بل کذبوا بمالم یحیطوا بعلمہ ولما یاتیھم تاویلہ کذالک کذب الذین من قبلھم فانظر کیف کان عاقبۃ الظلمین** اسباب کے بارے میں ایک کثیر الوقوع اور خطرناک غلطی یہ ہے کہ نتائج کو اسباب کی طرف اس طرح منسوب کیا جاتا ہے گویا اسباب ہی فاعل اور مکون اور متصرف ہیں۔ پانی غلہ اگاتا ہے۔ کونین دافع تپ ہے۔ سنکھیا سم قاتل ہے اور یہی منفذ شرف خفی **اعاذ ناللہ منہ** اور میرے پندار میں **وما یومن اکثرھم باللہ الا وھم مشرکون** میں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے۔ غرض اسباب کا مسئلہ بڑا نازک اور مشکل اور مزلہ الاقدام ہے۔

ابن الوقت : یہ تو کوئی بھی نہیں کہتا کہ طب کے احکام مسائل ہندسی کی طرح یقینی ہیں مگر اس فن میں اس قدر ترقی ضرور ہوئی ہے کہ یورپ میں عمروں کا اوسط بڑھا ہے۔ مردم شماری کی افزاء کا پتہ زیادہ ہے۔ خاص خاص امراض کے حکمی علاج دریافت ہوئے کہ سارے ملک میں کہیں ان بیماریوں کا نام نہیں۔ بہت سے روگ جو درماں پذیر نہ تھے‘ اب ڈاکٹر دعوے کے ساتھ ان کا علاج کرتے ہیں۔ حفظان صحت کے قواعد اگرچہ ظنی ہیں مگر تعینات کے لگ بھگ۔ غرض واقعات سے‘ نتائج سے‘ یہ بات بخوبی ثابت ہو چکی ہے کہ انسان کی تدبیر کو اس کی تندرستی اور زندگی میں بڑا دخل ہے اور اس سے انکار کرنا گویا بداہت سے انکار کرنا ہے۔

حجتہ الاسلام : کیوں؟ کیا ہمارے ملک میں لوگوں کی بڑی عمریں نہیں ہوتیں؟ ہمارے یہاں بھی لوگ کثیر الاولاد ہوتے ہیں۔ اور ایسے بھی لوگ نکلیں گے جو ہمیشہ یا اکثر تندرست رہتے ہیں اور ان کو علاج کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ بلکہ میرا تو یہ خیال ہے کہ جو زیادہ احتیاط کرتے ہیں‘ وہ ہی زیادہ بیمار ہوتے ہیں۔

ابن الوقت : میں خلاف قاعدہ کو اتفاق سمجھتا ہوں۔

حجتہ الاسلام : تم نے اچھی طرح غور نہیں کیا۔ اول تو سرے سے علم طب ہی فی حد ذاتہ مکمل نہیں۔ پھر ناقص و ناتمام و مظنون جیسا کہ ہے‘ اگر ساری دنیا کی مردم شماری پر نظر کی جائے تو سو میں ایک آدمی بھی ایسا نہیں ٹھہرے گا جو احکام طب کی پوری پوری پابندی رکھتا ہو۔ بات یہ ہے کہ خداوند کریم نے ہر انسان کا طبیب اسی کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ وہ کیا ہے؟ اس کی طبیعت۔ انسان کی تندرستی کو داخلی اور خارجی تمام خطرات ہیں اور ان میں سے خدا

جانے کتنے ہیں جو اس وقت تک مخفی ہیں اور کتنے ہیں جو معلوم ہیں‘ مگر انسان کے بس کے نہیں۔ تو ان کو جاننا نہ جاننا برابر ہے۔ الغرض کسی کو خبر نہیں کہ کل بلکہ اب سے چند لمحے بعد کونسی آفت اس کی تندرستی پر آنے والی ہے کہ اس کی روک تھام کرے۔ نزول آفت پر فوراً اس کی طبیعت مقاومت مرض پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ صرف مدبر و معالج نہیں بلکہ اسی طبیعت میں سب طرح کے امراض کی دوا بھی ہے۔ اگر حیات باقی ہوتی ہے‘ طبیعت مرض پر غالب آجاتی ہے ورنہ مغلوب مرض ہو کر آدمی ہلاک ہو جاتا ہے۔ رہ گئی دوا تو وہ طبیعت کی تقویت ہے۔ بلکہ مجھ سے پوچھو تو صرف طبیعت ہی کی نہیں بلکہ بیشتر اوپر والوں کی۔ بڑے بڑے حاذق طبیبوں کو دیکھا کہ ان کے ہاتھوں سے مریض مرتے ہیں اور شفا بھی پاتے ہیں۔ مرے تو کہتے ہیں‘ خدا نے اتنی ہی حیات لکھی تھی۔ حکیم جی نے اپنی سی بتیری کوشش کی۔ زندگی ہی نہ ہو تو کیا کریں۔ اور اچھے ہوئے تو نہ خدا ہے نہ تقدیر ہے۔ حکیم صاحب ہیں اور ان کی تشخیص و تدبیر۔

ابن الوقت : آپ تو کچھ جبریوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔ آپ کی تقریر کا ماحصل یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ تدبیر لاحاصل ہے۔ انسان کی تندرستی اور زندگی محض ایک امر تقدیری ہے‘ من جانب اللہ۔ انسان کو اس میں کسی طرح کا مدخل نہیں۔ مگر یہ آپ کی تقریر کا ماحصل ہے۔ ایک عالم طب کا معتقد ہے۔ طب سے میری مراد ہومیو پیتھی‘ ایلو پیتھی‘ یونانی یا وید کی کسی خاص طرح کی طبابت نہیں‘ بلکہ میری غرض اسی قدر ہے کہ ساری دنیا سدا سے اس امر کی معتقد چلی آتی ہے کہ حفظ صحت دفع مرض یا ابقائے حیات (جن لفظوں سے چاہیے تعبیر کر لیجئے) تدبیر پذیر ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ وہ تدبیر فی نفسہ صحیح ہو یا غلط۔ جادو اور منتر اور ٹونے اور ٹوٹکے اور تعویذ اور گنڈے اور ہر طرح کی دوا درمن سب داخل تدبیر ہیں۔ الغرض ہر زمانے میں اس بات پر تمام عالم کا اجماع رہا ہے۔ کہ زندگی اور تندرستی میں انسان کی تدبیر کو دخل ہے۔ اور یہ میرا پہلا دعویٰ ہے اور ہر زمانے کے عقلا اور جہلا اور حضری اور بدوی سب کا اجماع اس دعوئی کا ایسا قوی ثبوت ہے کہ اس سے زیادہ قوی کوئی ثبوت ہو نہیں سکتا۔ آپ پیچدار باتیں کر کے اصل باتیں کہاں گم کیے دیتے ہیں میرا دوسرا دعوئی جو پہلے دعوے پر متفرع ہے‘ یہ ہے کہ جتنی تدبیریں حفظ صحت کی لوگ عمل میں لاتے ہیں‘ سب میں ردبہ ثواب طب انگریزی اور اس کے متعلقات ہیں۔ اس دعوے کے ثبوت کے لیے میں واقعات پیش کرتا ہوں جن کو مردم شماری کے کاغذات سے استنباط کیا گیا ہے۔

حجتہ الاسلام : ہاں جی ہاں۔ میں تمہارے مطلب کو خوب سمجھتا ہوں۔ تم کو اگر میرے سمجھنے میں

کچھ تزلزل واقع ہوا ہے تو لو اب پھر سنو۔ صرف اتنی سی بات سے کہ ہر زمانے میں لوگ حفظان صحت کی تدبیریں عمل میں لاتے رہے ہیں‘ لازم نہیں آتا کہ انسان کو اپنی تندرستی میں مدخل ہے۔ تم نے اتنی سی بات ثابت کی کہ لوگوں کو حفظ صحت کی حاجت ہے اور ہر شخص فی زعمہ اس کی کچھ تدبیر کرتا ہے۔ صحیح یا غلط۔ درست یا نادرست۔ اسی طرح ہر شخص کو علم مستقبلات کی حاجت ہے اور ہر زمانے کے لوگ اس کے بھی درپے رہے ہیں۔ نجوم اور رمل اور جفر اور فال اور شگون اور خواب اور قیافہ اور سعد و نحس اور ہاتھ کی لکیریں اور سانس اور کیا کیا‘ سارے پاکھنڈ اسی غرض سے ہیں اور یہ نہ سمجھنا کہ صرف ایشیا کی وحشی قومیں اس خبط میں گرفتار ہیں۔ جہاں تک مجھ کو معلوم ہے‘ اہل یورپ بھی اس الزام سے بری نہیں۔ غرض فکر مستقبل سے کوئی فرد بشر فارغ نہیں۔ تو کیا اس سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ انسان کو علم غیب میں دخل ہے؟ پھر دخل ایک مشتبہ لفظ ہے اگر اس سے ملابست مراد ہے اگرچہ ادنیٰ درجہ ہی کیوں نہ ہو‘ یعنی تعلق دنیا کا سارا کارخانہ انسان کے لیے ہے اور اس کو کل موجدات عالم سے کسی نہ کسی طرح کا تعلق ہے یا ہو سکتا ہے۔ موجودات عالم سے بعض چیزیں ایسی ہیں جن میں اس کو تصرف کا اختیار ہے۔ اگر اس کا اختیار محدود ہے‘ مگر اسی اختیار کی وجہ سے اس کو خلیفہ اللہ فی الارض کہا جاتا ہے۔ جسمانی توانائی کے اعتبار سے وہ چنداں زبردست مخلوق نہیں مگر عقل کے بل پر وہ آسمان تک جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ کسی شاعر نے کیا عمدہ طور پر انسان کا حال بیان کیا ہے ؎

خاک کے پتلے نے دیکھ کیا ہی مچایا ہے شور — فرش سے لے عرش تک کر رہا ہے اپنا زور

سینے میں قلزم کو لے قطرے کا قطرہ ہی رہا — بل بے سمائی تری‘ اف رے سمندر کے چور

وہ زمین پر بیٹھا بیٹھا اجرام فلکی پر اور زیادہ دسترس نہیں تو ان کی رفتار سے ہی اپنے اوقات کو مضبوط کرتا ہے۔ **ھو الذی جعل الشمس ضیاء والقمر نورا وقدرہ منازل لتعلموا عدد السنین والحساب** روئے زمین پر اس نے اپنا تسلط بٹھا رکھا ہے کہ نہ صرف جمادات اور نباتات میں تصرفات اور عناصر پر حکمرانی کرتا ہے۔ بلکہ بڑے سے بڑے قوی اور خونخوار جانور اس سے ڈرتے اور اس کی خدمت کرتے ہیں۔ باایں ہمہ انسان کسی کام کا فاعل مستقل اور کسی چیز میں حقیقی موثر نہیں۔ اس مطلب کو سورہ واقعہ میں بڑی ہی عمدگی سے بیان کیا ہے۔

افرءیتم ما تمنون ○ ءانتم تخلقونہ ام نحن الخالقون ○ نحن قدرنا بینکم الموت وما نحن بمسبوقین ○ علی ان نبدل امثالکم وننشئکم فی ما لا تعلمون ○ ولقد علمتم النشاۃ الاولی فلولا تذکرون ○ افرءیتم ما تحرثون ○ ءانتم تزرعونہ ام نحن الزارعون ○

لونشاء لجعلنہ حطا مافظلتم تفکھون ○ انا لمغرمون ○ بل نحن محرومون ○ افرئیتم الماء الذی تشربون ○ انتم انزلتموہ من المزن ام نحن المزلون ○ لونشاء جعلنہ اجاجا فلولا تشکرون ○ افرئیتم النار التی تورون ○ انتم انشاتم شجرتھا ام نحن المنشون ○ نحن جعلنھا تذکرہ ومتاعا للمقوین ○ فسبح باسم ربک العظیم۔○

ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے چار چیزوں کو بیان فرمایا ہے۔ اولاد' کھیتی' پانی' اور آگ۔ اور ان چاروں میں سے ہر ایک میں جہاں تک انسان کو دخل ہے' اس کی بھی صراحت کی اور پھر تبکیت کے لیے پوچھا کہ بھلا پھر اولاد کو تم نے پیدا کیا یا ہم نے؟ اور آگ کا ایندھن تم نے بنایا یا ہم نے؟ ہم نے تمہارے لیے موت کا ٹھہراؤ کر دیا ہے اور کسی کی مجال نہیں کہ ہماری پکڑ سے نکل بھاگے۔ ہم چاہیں تو کھیتی کو ڈانٹ بنا دیں کہ اس میں پھل کا کہیں نام نہ ہو۔ ہم چاہیں تو پانی کو کھاری کر دیں۔ غرض انسان کا اختیار اور اس کی بے اختیاری دونوں حالتیں دکھا دی گئی ہیں۔

ابن الوقت : ہمارے اور آپ کے درمیان لفظی اختلاف ہے۔ انسان کا اختیار آپ بھی مانتے ہیں مگر محدود۔ اور ہم بھی کہتے ہیں کہ انسان کا اختیار ابھی تک محدود رہا ہے۔ اب جونہی نئی چیزیں ایجاد ہوتی چلی جاتی ہیں تو انسان سمجھتا جاتا ہے کہ اس کو بڑی قدرت ہے۔ کتنی مدت کے بعد اب اس نے جانا کہ مثلاً سٹیم اور الیکٹرسٹی کیا چیز ہے۔ اور میں اس پر کیا اختیار رکھتا ہوں۔ اسی طرح اس نے اپنی تندرستی اور زندگی پر بھی اپنا اختیار معلوم کرنا شروع کیا ہے۔ بہت سے امراض کو اس نے بس میں بھی کر لیا ہے اور کوشش کر رہا ہے کہ ان کو پیدا ہی نہ ہونے دے۔ یا اگر پیدا ہوں بھی تو ان کو جس وقت چاہے معدوم کر دے۔ اگر علوم طب اور کیمیا اور طبیعات وغیرہ اسی نسبت سے ترقی کرتے رہے' جیسے کہ پچھلے سو برسوں میں' تو وہ دن کچھ دور نہیں کہ انسان اپنی تندرستی پر آپ حاکم ہو گا۔ اور کیا عجب ہے کہ رفتہ رفتہ اپنی زندگی پر بھی۔

حجتہ الاسلام : نعوذ باللہ من ذالک کیا تمہارے برے عقاید ہیں! تم تو حقیقت میں اس بات کے منتظر ہو کہ انسان کچھ دنوں میں معاذ اللہ خدا ہونے والا ہے۔

ابن الوقت : دہریے تو کہتے ہیں خدا کو کس نے دیکھا ہے یہ بھی لوگوں کا ایک خیال ہے۔

حجتہ الاسلام : لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ خدا کو دیکھا نہیں تو اس سے لازم آئے گا کہ خدا ہے نہیں؟ ہم نے روح کو بھی نہیں دیکھا اور نہیں دیکھ سکتے تو روح کے ہونے سے بھی انکار کر دیں۔

ابن الوقت : واہ وا! تعریف المجہول بالمجہول وہ روح ہی کو کب مانتے ہیں۔

حجتہ الاسلام : تمام فلسفہ کا اجماع ہے کہ آدمی کو اپنی ذات کا علم حضوری بدیہات اولیٰ میں سے ہے۔ ہر شخص اپنے تئیں لفظ "میں" سے تعبیر کرتا ہے اور کہتا ہے میرا دل' میرا دماغ' میرا جسم یعنی ہر شخص کو جسم کے علاوہ اپنی میں کا اذعان ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ کسی اور ثبوت کی بھی ضرورت ہے اور اگر تمہارے نزدیک ہے تو تم کو خبط ہے اور تم قابل خطاب نہیں مگر مسلمان ہونے کا دعویٰ کر کے اسلام کو کیوں بدنام کرتے ہو اور لوگوں کو کیوں دھوکے میں ڈالتے ہو؟ یہ سچ ہے کہ مجامع میں تحریرات میں تم اسلام کے نام سے فخر اور اس کی حمایت کرتے ہو مگر وہ اسلام ادعائی السام ہے جس کو صرف امتیاز قومی کہنا چاہیے۔ تم جیسے ڈھلمل یقین مسلمان میں نے اور بھی دیکھے ہیں۔ ان کو بھی اسی طرح کے شکوک عارض ہوئے۔ لامذہبوں اور دہریوں اور عیسائیوں' غرض اسلام کے مخالفوں سے کچھ اعتراض سن پائے' جواب سوجھے نہیں یا سوجھے اور تسکین نہ ہوئی۔ آخر یہ شیوہ اختیار کر لیا کہ لگے اسلام کے ہی اصول میں تاویلات کرنے وہ اپنے پندار میں اسلام کی تائید کرتے ہیں مگر حقیقت میں اسلام کو کسی مخالف سے اتنا نقصان نہیں پہنچا جتنا ان کی تاویلات سے۔ انہوں نے حدیث کو تو یہ کہہ کر الگ کیا کہ پیغمبر کے ڈیڑھ سو برس بعد اس کی تدوین شروع ہوئی۔ رہ گیا قرآن تو اس کو مارے تاویلات کے مسخ کر دیا۔

اتنے میں اطلاع ہوئی کہ حاضری میز پر ہے۔

فصل ۲۴

حجتہ الاسلام شہر میں جا رہے ہیں

حجتہ الاسلام : لو صاحب مجھ کو اجازت دو مجھے شہر جانا ہے۔

ابن الوقت : کیا آپ میرے ساتھ کھانا کھانا یا میرے بنگلے میں رہنا خلاف اسلام سمجھتے ہیں؟

حجتہ الاسلام : بس مذہبی چھیڑ رہنے دو۔ مذہب ایسی چیز نہیں ہے کہ مباحثے اور مناظرے سے کسی کے دل میں اتار دیا جائے۔ **ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء**۔ خداوند تعالیٰ خاص طبیعتیں پیدا کرتا ہے جو مذہبی باتوں سے متاثر اور اس کو قبول کر لیتی ہیں۔

ابن الوقت : پھر آپ جبریوں کی سی باتیں لائے۔ اگر خدا خاص طبائع مناسب مذہب پیدا کرتا

ہے تو پھر وہ مواخذہ کیوں ہے؟

حجتہ الاسلام : مواخذہ بقدر مناسب لایکلف اللہ نفسا الا وسعھا

یہ کہہ کر حجتہ الاسلام اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ ابن الوقت بھی اٹھا اور کہنے لگا "کیا واقع میں آپ میرے پاس نہیں رہنا چاہتے؟"

حجتہ الاسلام : نہیں بھائی نہیں۔

ابن الوقت : آخر کچھ سبب تو بتایئے؟

حجتہ الاسلام : بات تو یہ ہے کہ میرے یہاں ٹھہرنے سے تم کو بھی تکلیف ہوگی اور مجھ کو آسائش نہیں ملے گی۔

ابن الوقت : میری تکلیف کا تو خیال کیجئے نہیں۔ اور آپ اپنی آسائش کے لیے بے تکلف جس طرح کہئے، انتظام کر دیا جائے۔

حجتہ الاسلام : تم کس کس بات کا انتظام کرو گے؟ اول تو میری نماز ہی کا ٹھکانا نہیں۔ جس کمرے میں جاؤ تصویر۔ بنگلہ کیا ہے خاصا بت خانہ ہے۔ اور پھر تم نے کتے اس کثرت سے پال رکھے ہیں کہ اذان تک کے دینے کا حکم نہیں اور جب تک مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز نہ پڑھوں، میراجی نہیں خوش ہوتا۔ میں نے اترتے کے ساتھ ہی پہلے تمام بنگلے کو اندر سے بالتفصیل دیکھ لیا ہے۔ تم سمجھو تو میں ایک دن بھی ایسے مکان میں گزر نہیں کر سکتا۔ مجھے کسی طرح کا سبیتا دکھائی نہیں دیتا۔

ابن الوقت : اچھا تو پھر کھانا کھا کر جائیے۔

حجتہ الاسلام : بس کھانے سے بھی معاف رکھو۔ آپ کے باورچی اور کھانے کا سب حال سن چکا ہوں۔

ابن الوقت : کیا ہمارا باورچی میلے کچیلے بھٹیاروں سے بھی گیا گزرا ہوا؟ کھانے کی میز کو ایک نظر دیکھیے تو سہی۔

حجتہ الاسلام : بھائی ظاہری صفائی تو بلاشبہ تمہارے کھانے میں بہت ہوگی۔ میں نے تم کو نہیں دیکھا تو بارہا انگریزوں کو کھاتے ہوئے دیکھا ہے۔ مگر مجھ کو تمہارے باورچی کی نسبت شبہ ہے۔

ابن الوقت : بے شک مجھ کو معلوم ہے کہ وہ سب کچھ کھاتا پیتا ہے۔ مگر ہمارے کھانے میں کوئی چیز ایسی نہیں ہوتی کہ آپ اس سے احتراز کریں۔

حجتہ الاسلام : ارے میاں، کیا کہتے ہو۔ میں نے خود تمہارے یہاں ایک الماری میں شراب رکھی ہوئی دیکھی ہے۔

ابن الوقت : وہ صاحب لوگوں کے واسطے ہے۔ میں کبھی شراب نہیں پیتا۔ اگر پیوں تو ہلاک ہو جاؤں۔ میرا پھیپھڑا اس قابل نہیں۔

حجتہ الاسلام : جب خود تمہارے پاس شراب کا ذخیرہ ہے اور صاحب لوگوں کو پلاتے ہو اور تمہارا باورچی بھی کسی چیز سے احتراز نہیں رکھتا تو مجھ کو تمہارے کھانے کی طرف سے اطمینان نہیں۔

ابن الوقت : بوائے!

ملازم : یس سر!

ابن الوقت : کک کو بلاؤ۔

کک حاضر ہوا تو ابن الوقت نے پوچھا "آج کھانے میں کیا کیا ہے؟"

باورچی : سوپ، مٹن چاپ، کٹلس، آمٹین، (آکس ٹنگ)، بیل ریس (بوائلڈ رائس پڈنگ۔

ابن الوقت : ان چیزوں میں سے کسی میں شراب پڑتی ہے؟

باورچی : کسی میں نہیں۔ مگر پڈنگ میں خمیر کے لیے شراب کا بھپارہ دینا ہوتا ہے۔

ابن الوقت : پڈنگ نشہ لاتا ہے؟

باورچی : ذرا نہیں۔

ابن الوقت : اچھا رخصت

حجتہ الاسلام : آپ نے دیکھا؟

ابن الوقت : کیا دیکھا؟ آپ کے سامنے باورچی کہہ نہیں گیا کہ پڈنگ نشہ نہیں لاتا۔ اسلام میں شراب کے حرام ہو جانے کی اصل وجہ نشہ ہے۔ جب نشہ نہیں تو پھر کیا حرج ہے؟ اور اگر آپ کے نزدیک حرج ہے تو پڈنگ نہ کھائیے۔

حجتہ الاسلام : مجھ پر خدانخواستہ ایسی کیا مصیبت پڑی ہے کہ اپنے گھر کا رزق طیب چھوڑ کر تمہارا مشتبہ پھیکا سا ہندو کھانا کھاؤں؟

ابن الوقت : یہ بلا کی تو گری پڑ رہی ہے۔ آپ شہر میں جا کر بے فائدہ اپنی تندرستی کو خطرے میں ڈالتے ہیں۔

حجتہ الاسلام : میری زندگی ایسی کونسی زندگی ہے۔ آخر اتنا بڑا شہر بستا ہے۔ جو اور سب کا حال وہ میرا حال۔

ابن الوقت : آخر پھر ملاقات کی کیا صورت ہوگی؟

حجتہ الاسلام : تم تو میرے پاس آنے کا قصد کرنا مت۔ کیونکہ تمہارے دل میں آب و ہوائے شہر کا پہلے ہی سے ڈر بیٹھا ہوا ہے۔ کل ہے جمعہ۔ مجھ کو فرصت ہونی نہیں۔ پرسوں لوگوں

سے ملنا ملانا ہو گا۔ انشاء اللہ اتوار کو دس بجے ساڑھے دس بجے میں خود آؤں گا۔ اگر کوئی وجہ مانع نہ ہو تو ذرا اپنے داروغہ کو کل بعد مغرب میرے پاس بھیجنا۔ میں اس سے یہاں کے انگریزوں کے حالات دریافت کروں گا اور تمہارے بھی۔

فصل ۲۵

حجتہ الاسلام ساس سے ابن الوقت کے پاس نہ ٹھہرنے کا عذر کرتے ہیں

حجتہ الاسلام کے بے وقت گھر پہنچنے سے سب کو حیرت ہوئی۔ لوگ اس خیال سے کہ ابن الوقت کے پاس ٹھہریں گے کھا پی کر سو سلا رہے تھے۔ جونہی اس نے گھر میں قدم رکھا، ساس کو کہتے سنا کہ "اے ہے! اگر کھانا بھی کھا کر نہیں آئے تو اتنی رات گئے اب کیا ہو گا۔ خاگینہ بن سکتا ہے۔ لیکن اس بلا کی گرمی پڑ رہی ہے اور رات سے حرارت الگ۔ انڈے گرم آگ۔ نوج! کوئی کھائے سویاں بھنی ہوئی تیار ہیں اور بھننے میں بھی کسر نہیں رہی۔ مگر آخر ہے تو میدہ۔ ماشاء اللہ میں تو نہیں دوں گی۔ کھچڑی پیاس بہت لگائے گی۔"

اتنے میں تو داماد نے سامنے آکر سلام کے بعد چھوٹتے کے ساتھ یہی کہا کہ اماں جان، بڑی زور کی بھوک لگ رہی ہے۔ بارے کچھ شامی کباب، فرنی کے خوانچے، بچوں کے لیے لگا رکھے تھے۔ ٹوکری میں کچھ نان خطائیاں بچ گئی تھیں۔ سیب کا مربا، اچار، گھر میں تھا۔ جلدی سے ماما نے توا رکھ چٹلے پٹلے دو تین پراٹھے پکا دیے۔ غرض ایسے ناوقت بھی بات کی بات میں جو کھانا مہیا ہو گیا، ابن الوقت کے یہاں اہتمام سے بھی میسر نہ ہوتا۔ جتنی دیر داماد کھانا کھاتا رہا۔ ساس پاس بیٹھی باتیں کیا کیں۔

"کیوں بیٹا راستے میں ایسی کہاں دیر لگی کہ تم کو یہ وقت ہو گیا؟ میں تو سمجھی تھی کہ تم کو کچھ دن رہے سے بھائی کے پاس پہنچ گئے ہو گے۔"

داماد: واقع میں میں نے عصر کی نماز بھائی کی کوٹھی پر پڑھی اور ارادہ ان ہی کے پاس ٹھہرنے کا تھا۔

ساس: پھر ایسی کیا بات ہوئی کہ تم اتنی رات گئے چل کھڑے ہوئے؟

داماد: اگر مجھ کو بھائی کے پاس ذرا بھی آسائش کی توقع ہوتی تو میں ہرگز نہ آتا اور یوں سمجھتا کہ سرائے میں نہ ٹھہرا، ان ہی کے یہاں ٹھہرا سہی۔ مگر وہاں تو مسلمان کے کھڑے ہونے تک کا ٹھکانا نہیں۔ ٹھہرنا اور رہنا تو درکنار۔ عصر اور مغرب دو وقت کی نماز میں نے وہاں پڑھی۔ میرے دل کو تسلی نہیں کہ نماز ہوئی ہو۔ اب عشاء کے ساتھ دونوں کا اعادہ کروں گا۔ آدھ کوس کے گردے میں تو وہاں کہیں مسجد کا پتا نہیں۔ جماعت یوں گئی گزری ہوئی۔ بنگلے میں مارے تصویروں کے کہیں اتنی جگہ نہیں کہ کوئی شخص ایک کونے میں کھڑا ہو کر دو رکعت نماز پڑھ لے۔ ناچار برآمدے میں نماز پڑھی تو کس مصیبت سے کہ کتے اوپر آتے ہیں۔ دو تین کتے تو ایسے خونخوار اور ہیبت ناک تھے کہ اگر بھائی عین وقت پر نہ آپہنچتے تو لپک کر میرا ٹینٹوا لیں۔

ساس: دور پار تمہارے دشمنوں کا پھر یہ لوگ مجھ سے کیا آ کر کہتے تھے کہ دشمنوں نے مارے جلن کے بدنام کر رکھا ہے۔ جو ان کو بے دین کہے وہ خود بے دین۔

داماد: شرع میں نام لے کر تو کسی کے بھی کافر کہنے کا حکم نہیں، اور بھائی ابن الوقت تو اپنے تئیں چوری چھپے بھی نہیں کھلے۔ خزانے پکار پکار کر مسلمان کہتے ہیں۔ اور مسلمان ہیں بھی مگر ان کا رہنا سہنا کھانا پینا سب کچھ انگریزوں کا سا ہے۔ سر مو فرق نہیں۔

ساس: اے ہے! غدر کے دنوں میں کچھ ایسی گھڑی کا پیرا اس موئے فرنگی کا آیا تھا کہ بچے کی مت پھیر دی۔ ہم سے تو ایسا چھپایا کہ دن کے گورے شہر میں گھسے اور رات کو ہم نے جانا کہ سارے غدر ہمارے گھر میں فرنگی چھپا رہا۔ جس وقت فرنگی کو لائے تھے اگر ذرا بھی مجھ کو معلوم ہو تو میں اس کو کھڑا پانی نہ پینے دوں۔ خدا جانے کہاں سے ہمارے گھر میں آمرا تھا۔ نہ آتا بچہ ہاتھ سے جاتا۔ آخر میرا صبر پڑا پر پڑا۔ کسی کی آہ کا لینا اچھا نہیں ہوتا۔ خدا نے اس کے پیچھے ایسا روگ لگایا کہ سارے سارے دن اٹوائی کھٹوائی لیے پڑا رہتا تھا۔ آخر کو جاتے ہی بن پڑی۔ کالا منہ خدا کرے پھر آنا نصیب نہ ہو۔

داماد: آپ اس انگریز کو ناحق کوستی ہیں۔ اس نے تو اتنا بڑا بھاری سلوک اس خاندان کے ساتھ کیا ہے کہ جس کی انتہا نہیں۔ وہ اگر اس گھر میں آکر نہ رہا ہوتا۔ آج ساری عورتیں رانڈ ہوتیں، تمام بچے یتیم، محلے میں گدھوں کا ہل پھر گیا ہوتا۔ مال و اسباب کے نام کسی کو ایک پھوٹی کوڑی نہ ملتی۔ بھائی ابن الوقت کیا دودھ پیتے بچے تھے۔ کہ بہکائے میں آگئے۔ پڑھے لکھے، لائق، ہوشیار۔ ایک دم سے ڈپٹی کلکٹر کر دیے گئے اور ڈپٹی کلکٹری کو ایسا سنبھالا کہ آج ڈپٹی کلکٹروں میں کوئی ان کا مدمقابل نہیں۔ ایسے شخص کو کون بہکا سکتا ہے اور وہ کیوں کسی کے بہکائے میں آکر کرستان ہو گئے۔ انگریزوں کے مذہب کو تو ایسا لتاڑتے تھے

اور سناڑتے ہیں کہ ان ہی کا جی جانتا ہو گا۔ انگریز ان کو کیا بہکاتے' وہ تو الٹے ان کی وضع سے جلتے اور غار کھاتے ہیں' اور سارا جھگڑا تو اسی بات کا ہے۔ آج وہ ہندوستانی بن کر رہیں تو صاحب کلکٹر سے صفائی کرا دینے کا میرا ذمہ۔

ساس : پھر بیٹا' تم ہی بھائی کو کچھ سمجھاؤ۔

داماد : میں تو ہزار دفعہ سمجھاؤں مگر سمجھنے والا بھی ہے۔ یہ صورت حال پیش آئے گی' اس کا کسی کو خیال بھی نہ تھا۔ مگر ہاں' بھائی ابن الوقت کی غیر معمولی ذہانت اور بلند نظری کو دیکھ کر مجھے اچھی طرح یاد پڑتا ہے' حضرت فرمایا کرتے تھے کہ اس کی حالت خطرناک ہے۔ بڑا ہو کر معلوم نہیں کیا کرے گا۔

ساس : ابن صاحب مجھ سے کہہ گئے ہیں کہ وہ فرنگی ان کی ہوشیاری دیکھ کر لٹو ہو گیا تھا اور وہی ان کو اکسا کر لے گیا۔ اگر یہ ساتھ نہ دیں تو فرنگیوں کے لیے دلی بھی نہ لی جائے۔ پھر بھی یہی کہوں گا اس فرنگی نے میرے بچے کو کچھ کر دیا ہے۔ خدا اس کو کھو دے۔

داماد : کر کیا دیا؟ ایکدم سے ڈپٹی کلکٹر کر دیا۔ جاگیردار کر دیا۔

ساس : نہیں بیٹا۔ کچھ جادو کر دیا۔

یہ سن کر حجتہ الاسلام ہنسنے لگا "آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ انگریز بالکل جادو کے قائل نہیں؟

ساس : کیا جانیں بھائی۔ سنتے ہیں فرنگی بڑے جادوگر ہوتے ہیں۔ جادو کے زور سے سارے ملک لیتے چلے جاتے ہیں۔ اور ان کو ایسا جادو آتا ہے کہ ہر پل میں ہزاروں کو اس کی خبر منگوا لیں۔

داماد : وہ عقل کا جادو ہے۔

ساس : اچھا تو تم ان کی بادشاہزادی کو لکھو۔

داماد : کیا؟

ساس : یہی کہ تمہارے فرنگیوں نے ایسا ظلم کر رکھا ہے کہ ہمارے آدمی کو بہکا کر فرنگی بنا لیا ہے۔

اگر وہ سچ مچ کی بادشاہی زادی ہے تو ضرور ہماری فریاد سنے گی۔ لیکن بعضے آدمی کہتے ہیں کہ بادشاہ زادی کو مت لکھواؤ۔ کمپنی اس کی بیٹی ہے' اور بادشاہ زادی نے یہ ملک بیٹی کے جہیز میں دے ڈالا ہے۔ اب کمپنی کا حکم چلتا ہے۔ سو تم کو اصل حال معلوم ہو گیا۔ کسی ایسے کو لکھو کہ بس دیکھتے کہ ساتھ ہی حکم کر دے۔ بھلا کہیں خدا کی خدائی میں ایسا بھی اندھیرا ہوا ہے کہ آپ ہی تو فرنگیوں نے بلایا' اپنے میں ملایا اور دوسرا فرنگی ایسا ظالم آیا کہ آتے کے ساتھ لگا دشمنی کرنے۔

دیکھنا' تم بادشاہ زادی کو یہ ساری باتیں لکھوانا۔ بھولنا مت۔ ذرا یہاں کے فرنگیوں کی بھی تو حقیقت کھلے کہ کسی بھلے آدمی کو دھوکا دینا ایسا ہوتا ہے۔ بادشاہی کیا گئی' ساوے فرنگی بے سرے ہو گئے۔

داماد : جو تدبیر کرنے کی ہو گی' بھائی ابن الوقت کب اس سے غافل ہوں گے اور ان سے بہتر سوجھے گی کس کو؟ آپ تو صرف خدا کی درگاہ میں دعا کرتی رہیے۔ ہزاروں تدبیروں کی ایک تدبیر تو یہ ہے۔ بھائی کے ذمے کوئی الزام نہیں۔ رشوت وہ نہیں لیتے۔ کام چور وہ نہیں۔ نالائق نہیں کلکٹر نہیں' کلکٹر کا باوا بھی ہو تو ان کا کچھ نہیں کر سکتا۔ سارا فساد صرف انگریزی وضع کا ہے۔ خدا مقلب القلوب ہے۔ وہی ان کے دل کو پھیرے تو پھیرے۔

حجتہ الاسلام نے صاحب کلکٹر مسٹر شارپ سے ابن الوقت کی صفائی کرا دی۔

حجتہ الاسلام جب اپنے ضلع سے چلنے لگا تو اس کو اس بات کا خیال آیا تھا کہ ایسے وقت میرے جانے سے خواہی نہ خواہی لوگ سمجھیں گے کہ بھائی کی مدد کو آئے ہیں۔ مگر میں کس قابل ہوں اور ان کی کیا مدد کر سکوں گا۔ بارہ دری کے لیے انہوں نے لکھا ہے۔ سو نہ اس کے خریدنے کا مجھ کو مقدور ہے اور نہ میں اتنے بڑے مکان میں رہ سکتا ہوں۔ اس مکان میں رہنے کو چاہیں امیری ٹھاٹ' ساری عمر رہا پردیس۔ ادھر کے حکام میں کسی سے معرفت نہیں' ملاقات نہیں' میں جاتا ہوں تو میرے جانے سے ان کا کچھ مطلب نہیں نکلتا اور نہیں جاتا تو مروت تقاضا نہیں کرتی۔ خیر' خدا ہی آبرو رکھنے والا ہے۔ وہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔ عجب نہیں کہ غیب سے کچھ سامان ہو اور خدا مجھ کو بھائی ابن الوقت کی کار برآری کا ذریعہ ٹھہرائے۔ اپنے صاحب کلکٹر سے رخصت ہونے گیا تو انہوں نے پوچھا "آپ ساری رخصت دلی میں صرف کریں گے یا کہیں اور بھی جانے کا ارادہ ہے؟"

حجتہ الاسلام : آپ کو معلوم ہے کہ میں حج کے بعد بمبئی سے کلکتے ہو کر یہیں چلا آیا تھا۔ اس وقت دلی جانا نہیں ہوا۔ اب تو سیدھا دلی جاؤں گا اور غالب ہے کہ رخصت بھر وہیں رہنا ہو گا۔ انشاء اللہ دسویں پندرھویں عریضہ خدمت میں بھیجتا رہوں گا۔

صاحب کلکٹر : نہیں معلوم ان دنوں دلی میں حاکم ضلع کون ہے؟

حجتہ الاسلام : شارپ صاحب نامی کون صاحب ہیں۔

صاحب کلکٹر : ولیم تھیوڈور شارپ؟

حجتہ الاسلام : ڈبلیو ٹی تو ان کے نام کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ وہی ہوں گے۔

صاحب کلکٹر : وہ تو ڈیرہ اسمٰعیل خاں کی طرف تھے۔

حجتہ الاسلام : کہیں اسی طرف سے بدل کر آئے بھی ہیں۔

صاحب کلکٹر : اگر ولیم تھیوڈور شارپ صاحب ہیں تو میرے رشتے دار ہیں۔ میری خالہ زاد بہن ان کو بیاہی ہے۔ مگر ولیم صاحب ان دنوں ولایت میں ہیں۔ اگر آپ صاحب سے ملنا چاہیں تو میں ان کے نام چٹھی لکھ دوں۔

حجتہ الاسلام : میں صاحب کی خدمت میں حاضر ضرور ہوں گا۔ اول تو ہمارے شہر کے حاکم، دوسرے آپ کے رشتے دار۔

صاحب کلکٹر نے شارپ صاحب کے نام کی چٹھی اور اپنی ایک تصویر حجتہ الاسلام کو دی کہ چٹھی کے ساتھ یہ تصویر بھی صاحب کو دیجئے گا۔ چٹھی میں حجتہ الاسلام کے متعلق یہ مضمون تھا کہ میں اس علاقے کے تمام ڈپٹی کلکٹروں میں ان کو دل سے پسند کرتا ہوں۔ اس طرف سرکاری محکموں میں جھنڈا بنگالی بابو ہیں۔ گویا سرکاری خدمتوں کے ٹھیکے دار ہیں۔ مجھ کو اس قوم سے دلی نفرت ہے۔ انگریزی پڑھ کر یہ لوگ ایسے زبان دراز اور گستاخ اور بے ادب اور شوخ ہو گئے ہیں کہ سرکاری انتظام پر سختی کی ساتھ نکتہ چینی کرتے ہیں۔ اگر کہیں ان لوگوں میں ہندوستان کے بلند حصے کے باشندوں کی طرح دلی جرات اور دلیری بھی ہوتی تو انہوں نے انگریزی حکومت کا جوا اپنی گردنوں سے کبھی کا اتار کر پھینک دیا ہوتا۔ مگر شکر ہے کہ ان کی ساری بہادری زبانی ہے۔ تاہم ان کا بڑبڑانا سخت ناگوار ہوتا ہے۔ اور میں ہمیشہ افسوس کیا کرتا ہوں کہ میں نے ایسے خود سر نا احسان مند اور بد دل علاقے کو کیوں اختیار کیا تھا۔

حجتہ الاسلام کی وضع کے آدمی یہاں بہت کم دکھائی دیتے ہیں۔ یہ اپنی وضع کو بہت مضبوطی کے ساتھ پکڑے ہوئے ہیں اور اس کو دل سے پسند کیے ہوئے ہیں۔ اور بندر کی طرح نقل کرنے کو ذلیل کام جانتے ہیں اور میں ان کو اس رائے کی وجہ سے بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ غدر کے دنوں میں یہ عرب میں تھے لیکن نہایت بے باکی کے ساتھ جو ہر ایک مسلمان میں ہوتی ہے، غدر کی نسبت اپنی رائے ظاہر کیا کرتے ہیں کہ گورنمنٹ انگریزی نے مسلمانوں کی بڑی دل شکنی کی۔ اس نے ہندو مسلمانوں کو ایک نگاہ سے دیکھا اور دونوں قوموں کی حالتوں کے اختلاف پر نظر نہ کی۔ وہ کیا عمدہ ایک مثال دیتے ہیں کہ حکومت یعنی سلطنت بمنزلہ ماں کے دودھ کے ہے۔ مسلمان بجائے اس کے بچے کے ہیں جس کا دودھ حال ہی میں چھڑایا گیا۔ اس کو دودھ کا مزہ بخوبی

یاد ہے اور وہ اس کے لیے پھڑکتا ہے۔ مسلمانوں کے مقابلے میں ہندو ایسے ہیں جیسے دو اڑھائی برس کے بچے کے آگے سو برس کا بڈھا۔ اس نے بھی کئی قرن گزرے ماں کا دودھ پیا تھا، مگر اب کیا مدت، ہائے دراز سے اس کو یہ خبر نہیں کہ پھیکا تھا یا میٹھا۔ کیا اگر ایک دودھ چھٹا ہوا بچہ کھچڑی کھانے میں منہ بناتا ہے تو اس پر سختی کی جائے گی کہ تو بڑے آدمیوں کی طرح چاؤ سے کیوں نہیں کھاتا؟ سینکڑوں برس سے ہندوؤں کے پاس نہ لٹریچر ہے اور نہ علم۔ ان کو انگریزی اختیار کر لینا کیا مشکل تھا۔ جیسے ایک برہنہ آدمی ایک لنگوٹی کی بھی قدر کرتا ہے لیکن مسلمان اپنی کلاسیکل لینگوج (ام الالسنہ) عربی پر واجب فخر کرتے ہیں، جس کے بدون اردو، فارسی زبانیں بالکل پھیکی معلوم ہوتی ہیں۔ لاکھوں مسلمان قرآن کی بلاغت پر سر دھنتے اور اس کو زبانی یاد رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کا لٹریچر زندہ لٹریچر ہے، نہ سنسکرت اور لیٹن کی طرح کتابوں میں مدفون۔ ان کے علوم زمانے کے انقلاب کی وجہ سے مرجھا گئے ہیں مگر مرے نہیں۔ پس اگر مسلمان انگریزی سے کنارہ کشی کرتے رہے تو ان کے پاس کنارہ کشی کرنے کی وجہ تھی۔

حجتہ الاسلام، اس بات پر بڑا زور دیتے ہیں کہ ظاہر میں انصاف اسی کا متقاضی ہے کہ ہندو مسلمانوں کے جملہ حقوق برابر سمجھے جائیں۔ لیکن نظر غور سے دیکھا جاتا ہے تو یہ انصاف اس راجا کے انصاف سے زیادہ تعریف کا مستحق نہیں جس نے اپنے علاقے میں تمام دھان پانچ پنیری کے حساب سے بکوائے تھے۔ مسلمان اس ملک کے اصلی باشندے نہیں۔ وہ ملک کو فتح کرنے آئے اور رہ پڑے۔ انہوں نے زمینداریوں پر قبضہ کرنے کا ایک لمحے کے لیے بھی خیال نہیں کیا اور نہ ان کو خیال کرنے کی ضرورت تھی۔ ذرائع معاش میں سے نوکری ان دنوں زیادہ معزز سمجھی جاتی تھی اور وہ ان کی مٹھی میں تھی۔ زوال سلطنت سے معاش کا وہ ایک ذریعہ بھی ان کے ہاتھ سے جاتا رہا۔ جب کہ ہندو دوسرے تمام ذرائع پر بدستور قابض ہیں اور پھر نوکری میں آدھے کے دعوے دار۔ وہ بھی کہنے کو کیونکہ نفس الامری میں ہندو تین چوتھائی سے زیادہ نوکریوں پر مسلط ہیں۔ جو کچھ میں نے لکھا (اگر میں نے سمجھنے میں غلطی نہ کی ہو) حجتہ الاسلام صاحب کی شخصی رائے ہے۔ مجھ کو ان کی کسی کسی بات میں اختلاف بھی ہے۔ لیکن اگر آپ ان کو بات کرنے کا موقع دیں گے تو آپ کوئی مضمون ایسا نہ پائیں گے کہ اس میں وہ کوئی معقول رائے نہ دے سکیں۔ وہ بڑے خوش تقریر آدمی ہیں اور سننے والے کو بہت جلد اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔ ایک بات حجتہ الاسلام صاحب نے اسی قسم کی مجھ سے اور بھی کہی تھی اور وہ بھی دل کو لگتی ہوئی سی ہے۔ وہ ہندوؤں پر اپنی قوم کو اس وجہ سے بھی ترجیح دیتے ہیں کہ مذہب اسلام سلف ریسپکٹ سکھاتا ہے۔ یعنی انسان کو اس کی نظر میں معزز کرتا ہے۔ مسلمان اس میں انسانیت کی توہین سمجھتا ہے کہ اگر کوئی شخص اس کے ایک گلے پر طمانچہ مارے تو عیسائی کی طرح وہ دوسرا گلا بھی اس کے

سامنے کر دے کہ لے مار۔ اسلام نے خدا کی توحید کو بالکل نتھار دیا ہے اور کسی طرح کا شائبہ اس میں باقی نہیں رکھا۔

مسلمان سوائے ایک خدا کے جس کو انسان دیکھ نہیں سکتا' موجودات عالم میں سے ارضی ہوں یا سماوی کسی چیز کی عبادت یعنی اعلیٰ درجے کی تعظیم نہیں کرتا۔ حجتہ الاسلام صاحب کے بیان کے مطابق اسلام خودداری اور بے تکلفی اور سادگی اور توکل اور صبر کا مجموعہ ہے۔ لیکن ہندو بندر اور سانپ اور گائے اور پیپل اور تلسی اور آگ اور پانی اور پتھر اور چاند اور سورج ہر چیز کے آگے ماتھا ٹیکنے کو موجود ہے۔ جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہیں کہ آدمی سب میں ادنیٰ درجے کی مخلوق ہے۔ اور اس کو دنیا میں ادنیٰ بن کر رہنا چاہیے۔ حجتہ الاسلام اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ مسلمان کارفرمائی اور حکومت کے لیے بنایا گیا ہے' جس طرح ہندو کارکنی اور اطاعت کے لیے۔ وہ کہتے ہیں کہ خوشامد' ابتذال اور دفایت کی باتیں مسلمان سے ہو نہیں سکتیں اور کوئی مسلمان کرتا ہو تو جان لینا کہ مذہب میں پکا نہیں۔ اور سرکاری خدمتوں میں مسلمانوں کی کمی کا ان کے نزدیک سبب یہ بھی ہے میں تو ان کو ایسی باتوں میں اکثر چھیڑا کرتا ہوں۔ اس غرض سے کہ کچھ کہیں تو۔ ایک دن گرم ہو کے کہا کہ مسلمان چاہے مٹ ہی کیوں نہ جائیں مگر ان کے دل پر سے یہ بات نہیں مٹے گی کہ انہوں نے چھ سو برس اس ملک میں حکمرانی کی ہے۔ بایں ہمہ حجتہ الاسلام صاحب کے خیالات گورنمنٹ انگریزی کے ساتھ نہایت درجے کے خیر خواہانہ ہیں۔ اور مجھ کو کامل یقین ہے کہ اگر وہ ۱۸۵۷ء کے غدر میں ان اضلاع کی طرف ہوتے تو اپنے بھائی ابن الوقت کے برابر یا ان سے بھی بڑھ کر سرکاری خیر خواہی کا کوئی کارنمایاں کرتے۔ انہوں نے مجھ سے بیان کیا کہ میں نے عرب میں اسلامی سلطنت کا نمونہ دیکھا ہے۔ ملک نہایت تباہی کی حالت میں ہے اور افسوس ہے کہ جس جگہ مسلمانوں کی قوم پیدا ہوئی اور جہاں ان کی سلطنت کی بنیاد پڑی' اس کا یہ حال ہوا کہ باوجودیکہ ہر سال بلا ناغہ لاکھوں مسلمان جاتے ہیں' نہ امن ہے اور نہ آسائش۔ صرف دوسرے ملکوں کے صدقات پر وہاں کے لوگوں کی گزران ہے۔ وہ لوگ تنزل کے ایسے درجے میں پہنچ گئے ہیں کہ نہ صرف بدترین نمونے مسلمانوں کے ہیں بلکہ بدترین نمونے انسانوں کے۔

یہ چٹھی مسٹر شارپ کے پاس جمعے کی شام کو پہنچی۔ انہوں نے سمجھا کہ خود حجتہ الاسلام لے کر آئے ہیں اور اسی خیال سے پڑھتے کے ساتھ باہر نکل آئے' مگر معلوم ہوا کہ ملاقات کے لیے وقت فرصت دریافت کیا ہے جواب میں کہلا بھیجا کہ اوقات کچہری کے علاوہ جس وقت بھی جی چاہے۔ اگلے دن ایسے کوئی پونے سات بجے ہوں گے' حجتہ الاسلام پالکی میں سے اترے ہی تھے کہ شارپ صاحب ہوا خوری سے واپس آئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو انکل سے جان لیا۔ یوں

تو شارپ صاحب کا معمول تھا کہ ہوا خوری سے آئے پیچھے اچھے کامل ایک گھنٹے بعد ملاقاتیوں کی نوبت پہنچتی تھی یا گھوڑے سے اترتے کے ساتھ ہی اردلی کا حکم دیا کہ جو صاحب پالکی میں آئے ہیں ان کو اندر بھیج دو۔ صاحب سلامت ہوئی' غور سے دیکھا' مہربانی سے بٹھایا اور کہا کہ ڈکنز صاحب نے چٹھی میں آپ کے ایسے تفصیلی حالت لکھے ہیں کہ میں آپ سے اجنبی محض ہو کر نہیں ملتا۔ صاحب کی رائے آپ کی نسبت بڑی عمدہ ہے اور آپ اس کے مستحق ہیں۔

حجتہ : ان کی قدردانی اور آپ کی بندہ نوازی ہے۔ ڈکنز صاحب جتنی میری قدر کرتے ہیں' میں ان کی خوشنودی کی اس سے بہت زیادہ قدر کرتا ہوں۔

شارپ : ڈپٹی ابن الوقت آپ کے کیسے بھائی ہیں؟

حجتہ : میرے تو وہ کسی طرح کے بھی بھائی نہیں۔ مگر ہاں' میری بی بی ان کی پھوپھی زاد بہن ہے اس رشتے سے چاہے مجھ کو ان کا بھائی سمجھ لیجئے۔

شارپ : وہی تو کہوں' نہ تو آپ کی ان سے صورت ملتی ہے اور ان کی وضع تو بالکل صاحب لوگوں کی سی ہے۔ آپ ٹھہرے تو ابن الوقت صاحب ہی کے پاس ہوں گے؟

حجتہ : نہیں۔ میں تو شہر میں ٹھہرا ہوں۔

شارپ : کیوں صاحب' آپ کو تو سب خبر ہو گی' ابن الوقت نے اس وضع کے اختیار کرنے میں کیا مفاد سمجھا؟

حجتہ : بات یہ ہے کہ جن دنوں ابن الوقت کالج میں پڑھتے تھے' تب ہی سے ان کو انگریزیت کی طرف میلان سا تھا۔ بلکہ ہم لوگ ان کو چھیڑا بھی کرتے تھے۔ مگر ان کی یہ کیفیت تھی کہ ہر بات میں اوپرا کر انگریزی کی جانبداری کیا کرتے تھے۔ ان دنوں مجھ کو خوب یاد ہے نیچرل فلاسفی' اسٹرانمی کی کتابیں انگریزی سے ترجمہ ہو کر اورنیٹل کلاسوں میں نئی نئی جاری ہوئی تھیں تو زمین کی کرویت' اس کی گردش' کشش ثقل' نظام شمسی وغیرہ مسائل سے ہم سب کو شروع میں اچنبھا سا ہوتا تھا اور اکثر ابن الوقت کو ہم لڑکے باتوں میں بند کر دیتے۔ مگر یہ شخص قائل نہ ہوتا اور ہار کر کہتا تو یہ کہتا کہ اگرچہ میں ان کو سمجھا نہیں سکتا لیکن انگریزی اصول غلط ہو ہی نہیں سکتے۔ الغرض طفولیت سے اس شخص کے مزاج کی افتاد اسی طرح کی واقع ہوئی ہے۔ اب غدر میں اور اس کے بعد نوبل صاحب سے اختلاط میرے نزدیک تو اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ہو گیا۔ مفاد و مطلب پر نہ پہلے نظر تھی نہ اب ہے۔

شارپ : آپ کی رائے بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے اور بدھ بھی ملتی ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ بڑائی کے مارے اس وضع کو اختیار کیا ہے۔

حجتہ : بڑائی تو خدا کی ہے۔ مگر خدا نے آپ لوگوں کو دنیاوی بڑائی دی ہے۔ تو آپ کو سبھی چیزوں میں بڑائی کی شان ہے' یہاں تک کہ لباس میں تو بلا شبہ جو اس لباس کو پہنے گا' لوگوں کی نظروں میں بڑا دکھائی دے گا۔ مگر میں نہایت وثوق کے ساتھ آپ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ شیخی' غرور' تکبر' خود پسندی' یہ باتیں تو ابن الوقت کو چھو کر نہیں گئیں۔ جس نے کہا' جھک مارا۔ میں ان کے ساتھ بچپن سے کھیلا ہوں اور پڑھا ہوں' رہا ہوں۔ مجھ سے بہتر کوئی ان کی خصلت اور عادت کو جان نہیں سکتا۔ غدر سے ان کے مزاج میں کچھ شیخی سما گئی ہو تو خبر نہیں ورنہ غدر سے پہلے تک ان میں شیخی کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔ اگر یہ خیال کیا جائے کہ نوکری اور زمینداری کے برتے پر شیخی میں آگئے تو غدر سے پہلے بھی وہ گرے پڑے نہ تھے۔ نواب معشوق محل بیگم کی سرکار میں تمام سیاہ سفید کے مختار کل تھے اور خاندانی تعزز اور مقدرت دونوں کے لحاظ سے اس وقت بھی عمائد شہر میں سمجھے جاتے تھے۔ کیا ان کے پاس متعدد نوکر نہ تھے؟ متعدد سواریاں نہ تھیں؟ متعدد حویلیاں نہ تھیں؟ چار پانچ بنگلوں کا مول تو ان کی ایک بارہ دری ہی کھڑی ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ تنخواہ بھاری نہ تھی۔ سو بادشاہی سرکاروں میں ان کی کیا تخصیص ہے۔ سبھی کی تنخواہیں تھوڑی تھیں۔ مگر انعام و اکرام ملا کر دس روپے کا نوکر ایسی اچھی شان سے رہتا تھا کہ ہمارے یہاں سو کے تنخواہ دار کو بھی وہ بات نصیب نہیں۔ غرض شیخی کا الزام تو نراڈھکوسلا ہے۔ خود داری کہیے تو ایک بات ہے۔ لیکن خودداری میرے نزدیک لازمہ شرافت ہے۔ آدمی آدمی سب برابر۔ تاہم انتظام الٰہی اس کا مقتضی ہے کہ ان میں مراتب کا تفرقہ ہو۔ کوئی باپ ہے' کوئی بیٹا ہے' کوئی حاکم ہے' کوئی محکوم ہے' کوئی آقا ہے' کوئی نوکر' کوئی امیر ہے' کوئی غریب۔ اگر خودداری نہ ہو تو دنیا کا نظام درہم برہم ہو جائے۔ خودداری کے معنی یہ ہیں کہ آدمی جس درجے کا ہو اپنے تئیں اسی درجے کے مناسب رکھے۔ کسی کو خدا نے سواری کا مقدور دیا ہے تو ضرور ہے کہ وہ ضرورت کے وقت سواری سے کام لے پھر ایک بات اور ہے کہ انگریز اور ہندوستانی دونوں قسم کے حاکم ہیں۔ مگر آپ لوگوں کی اور ہماری حکومت میں بڑا فرق ہے۔ آپ لوگ ساری عمر ہندوستان میں رہے پھر اجنبی کے اجنبی۔ برخلاف ہم لوگوں کے کہ ہم ٹھہرے اس ملک کے باشندے' رشتے داری' قرابت داری' دوستی' قوم' مذہب اور راہ و رسم طرح طرح کے تعلقات ہماری رعایا کے ساتھ ہیں۔ پس کام کرنے میں جو آزادی آپ لوگوں کو حاصل ہے' ہم کو خواب میں بھی میسر نہیں۔ ہم لوگوں کی حالت بڑی نازک ہے۔ اور بھائی ابن الوقت پر ایک سختی اور ہے کہ اپنے ہی شہر میں ان کو کام کرنا پڑا' اور کام بھی تحقیقات بغاوت کا کہ یہ

حسابے کوئی متنفس اس سے بری نہیں۔ انہوں نے اپنی صفائی کی حفاظت کے لیے یا خودداری کے طور پر ملنے جلنے میں کمی کی ہو گی۔ اس کو لوگوں نے شیخی سے تعبیر کر لیا۔ مگر یہ تو فرمائیے' آپ نے بھی ان کی کوئی شیخی کی بات دیکھی؟

شارپ صاحب نے وہ دریا گنج کا قصہ بیان کیا۔

حجتہ : ہر چند ڈکٹر صاحب میرے حال پر حد سے زیادہ مہربانی فرماتے ہیں اور میں ان کا ادب بھی کرتا ہوں اور نہ صرف حکام انگریزی کا کیوں کہ میں نے سمجھ لیا ہے کہ یہ برتری ان کو خدا نے دی ہے اور خدا کے کلام پاک میں حاکم وقت کی اطاعت کا حکم صریح موجود ہے' لیکن گستاخی معاف' اگر دریا گنج کے نکڑ پر بھائی ابن الوقت کی جگہ آپ یا ڈکٹر صاحب مجھ کو اچانک مل گئے ہوتے تو میں بھی وہی کرتا جو بھائی ابن الوقت نے کیا۔ اور میں یقین کرتا ہوں کہ ڈکٹر صاحب کے ذہن میں ایک لمحے کے لیے بھی یہ شبہ نہ گزرتا کہ میں نے گستاخی کی۔

شارپ : ہم بھی آپ کی نسبت ایسا شبہ نہ کرتے کیونکہ آپ ہندوستانی ہیں اور ہندوستانی وضع رکھتے ہیں۔ لیکن آپ کے بھائی ہندوستانی ہو کر صاحب لوگ بننا چاہتے ہیں۔ اور چاہے گستاخی کے ارادے سے نہ ہو مگر ہم لوگوں کو ان کی تمام باتوں پر گستاخی کا احتمال ہوتا ہے۔ ان کی وجہ سے ہم کو دوسرے ہندوستانیوں سے ملنے میں بڑی مشکل پیش آتی ہے۔ یہ لباس ہمارا قومی شعار ہے اور اگر ہندوستانی ہمارے جیسے کپڑے پہنے تو ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری نقل کرتا ہے یا ہم کو چھیڑتا ہے اور چڑاتا ہے۔ کوئی ہندوستانی ہمارے لباس کو جس میں اس کی کسی طرح کی آسائش نہیں' بے وجہ اختیار کرے گا اور سوائے اس کے کہ اس کے دل میں ہمارے ساتھ برابری کا داعیہ ہو اور کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ یہ ساری تدبیر انگریزوں کو ذلیل اور ان کی حکومت کو ضعیف اور ان کے رعب کو بے قدر کرنے کی ہے۔ آپ لوگ بھی اپنے سے کم درجے والے کو برابر کی حالت میں نہیں دیکھنا چاہتے تو ہم اپنی رعیت کو' جسے ہم نے بزور شمشیر زیر کیا ہے' کیوں برابری کرنے دیں گے؟ آج کو تو ابن الوقت صاحب ہیں کل کو ایک محرر اور پھر ایک چپڑاسی پھر ایک قلی سب ہماری نقل کریں گے۔ اس کے یہ معنی کہ ہم سلطنت سے دستبردار ہو کر ولایت کا راستہ لیں۔ نہیں' نہیں۔ ایسا نہ ہوا ہے نہ ہو گا۔ اور چونکہ میں حاکم ضلع ہوں لہٰذا میرا فرض ہے کہ حکومت انگریزی کے مقابلے میں کسی کو سر نہ اٹھانے دوں۔ صدر والے اندھے ہیں۔ ان کو لوگوں سے واسطہ نہیں پڑتا۔ لیکن ان کو سمجھایا جائے گا۔ صرف نوبل صاحب کے خیال سے میں نے اب تک درگزر کی۔ لیکن اب میں دیکھتا ہوں تو سخت رپورٹ کرنے کی ضرورت ہے۔

آپ اگر اپنے بھائی کو سمجھا سکیں تو شاید ان کے حق میں بہتر ہو گا۔

حجتہ : میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ اس گھڑی تک مجھ سے اور بھائی ابن الوقت سے تبدیل وضع کے بارے میں "تحریراً" "تقریراً" کوئی بات نہیں ہوئی۔ جب اول اول انہوں نے اپنی وضع بدلی، میرے پاس دلی سے خط پر خط جانے شروع ہوئے مگر مجھ کو ابن الوقت کی طبیعت کا ابتدا سے حال معلوم تھا۔ اور میں خوب جانتا تھا کہ یہ شخص کسی کے سمجھائے سے سمجھنے والا نہیں۔ میں نے ایک کان تو کیا بہرا اور دوسرا کیا گونگا اور خبر نہ لی کس کو بلاتے ہیں۔ تبدیل وضع کے پیچھے ساری دنیا نے تو اس شخص کو ملامت کی، کرشان کہا، بے دین کہا، اور اب تک کہے جاتے ہیں۔ برادری سے نکال دیا۔ کوئی اس کے ہاتھ کا چھوا پانی تھوڑا ہی پیتا ہے۔ کنبہ چھوٹا، رشتے دار چھوٹے، دوست آشنا چھوٹے۔ غرض رسوائی اور فضیحت کا کوئی درجہ باقی نہ رہا۔ یہ عزیز نہ سمجھا پر نہ سمجھا۔ اب فرمائیے کہ کہنے کا کیا محل اور سمجھانے کا کونسا موقع ہے؟ وہ تو وہ، لوگ تو ہم لوگوں کے ساتھ ملنے میں بھی مضائقہ کرتے ہیں۔ میرے لڑکے کی نسبت کا ایک جگہ پیام تھا۔ بہت دنوں بات لگی رہی طرف ثانی کو بھی دل سے منظور تھا مگر آخر جواب دیا کہ ہمارے ہاں چار لڑکیاں بیاہنے کو بیٹھی ہیں۔ چاروں کی تمہارے یہاں کھپت ہو سکتی تو مضائقہ نہ تھا۔ ایک کی تمہارے یہاں کر کے ہم کو سارے شہر میں نکو بننا پڑے گا۔ اسی سے آپ قیاس کر سکتے ہیں کہ ہندوستان کی سوسائٹی میں ہم لوگوں کی کس قدر بے عزتی ہو رہی ہے۔ مگر کیا کریں۔ کچھ اپنے اختیار کی بات نہیں۔ میں تو اسی غصے کے مارے دلی آتا نہ تھا لیکن بھائی ابن الوقت کی طرح وطن اور رشتے داروں کو چھوڑا نہیں جاتا۔ ابن الوقت کی والدہ تو ان کو چھوٹا سا چھوڑ کر مر گئی تھیں۔ ان کی پھوپھی نے یعنی میری ساس نے پالا۔ ان کی تبدیل وضع سے پھوپھی کے دل پر جو صدمہ ہوا ہے بس عرض کرنے کے قابل نہیں۔ اور دو برس سے وہ مجھ کو بلا رہی تھیں، پر میں نے ہی آنے کی ہامی نہ بھری۔ اب جو سنا کہ بھائی، ابن الوقت پر قرض خواہوں کا نرغہ ہے اور بارہ دری بیچنے کو ہیں تو میں نے زیادہ بے رخی کرنا خلاف شیوہ انسانیت سمجھا۔ چلا آیا۔

شارپ : ابن الوقت صاحب اور قرض دار؟

حجتہ : قرض دار بھی ہزار دو ہزار کے نہیں، دس ہزار سے کچھ زیادہ ہی زیادہ تو گڑ والوں کا ہے۔

شارپ : ہم تو سنتے تھے کہ ابن الوقت صاحب کے پاس بڑا سرمایہ ہے۔ ساری دولت تو بیگم صاحب کی انہوں نے سمیٹی، اور تحقیقات بغاوت میں بھی بہت کچھ پیدا کیا۔

حجتہ : بھلا آپ کی عقل قبول کرتی ہے کہ انسان کے پاس سرمایہ ہو اور وہ مہاجنوں کو بیاج بھرے اور ایسے مکان کو بیچنا چاہے جو اس کے بزرگوں کی حشمت اور ثروت کی یادگار ہے؟ اور نوکری میں کچھ پیدا کیا ہوتا تو آپ کی ناخوشی اعلیٰ ادنیٰ سب کو معلوم ہے۔ دینے والے کبھی کے الڈ پڑے ہوتے۔ غرض بھائی ابن الوقت کے بارے میں آپ کی جتنی خبریں پہنچیں، ان میں رتی برابر بھی تو سچ نہیں شیخی باز کہہ دیا، بالکل بے جوڑ مال دار بنا دیا، سر تا سر غلط مرتشی بنا دیا، تمام تر بہتان۔ بھلا اور زیادہ نہیں تو گڑ والوں ہی کا بہی کھاتہ منگوا کر ایک نظر دیکھیے جھوٹ سچ سب آپ پر منکشف ہو جائے گا۔

شارپ : بھلا پھر ابن الوقت صاحب اس قدر بدنام کیوں ہیں؟ ہم نے تو کسی کے منہ سے ان کی بھلائی نہ سنی۔

حجتہ : آپ کو ہندوستانیوں کے خصائص مزاجی سے بخوبی آگاہی نہیں۔ ہم لوگوں میں اس طرح کا حسد ہے کہ ایک کو ایک کھائے جاتا ہے۔ اور قاعدہ ہے کہ جب کسی قوم میں ادبار آتا ہے تو حالت بگڑنے سے پہلے قوم کی طبائع بگڑ جاتی ہیں۔ بھائی ابن الوقت کی حالت محسود ہونے کی ہے۔ غدر لوگوں کے حق میں عذاب تھا، ان کے لیے موجب فلاح و برکت۔ ہندوستانیوں کے نزدیک اس سے بڑھ کر اور کیا قصور ہو گا کہ ان میں کا ایک شخص غدر کی ان تمام آفتوں سے محفوظ رہا۔ سرکار نے اس کی خیر خواہی کی قدر کی، بڑی سے بڑی خدمت دی، جاگیر دی اور حکام لگے اس کی خاطر مدارات کرنے۔

شارپ : خیر کچھ ہی ہو، میں تو اس کا متحمل نہیں ہو سکتا کہ کوئی ہندوستانی انگریزوں کی نقل کرے۔

حجتہ : مجھ کو بھی بہت ہی زبوں معلوم ہوتا ہے۔ بھلا ہوا کہ آپ ادھر بنگالے کی طرف نہ ہوئے۔ وہاں کے لوگ تو نقل کے علاوہ چھیڑتے بلکہ چڑاتے ہیں۔

شارپ : ڈکٹر صاحب بھی وہاں سے بہت ناراض ہیں، اور وہاں کے لوگوں کی بہت شکایت لکھتے ہیں۔

حجتہ : انگریزی پڑھ پڑھ کر وہ لوگ ایسے بے باک ہو گئے ہیں کہ کسی حاکم کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتے۔ کتنا ہی پھونک پھونک کر پاؤں رکھیے مگر وہ بدون گرفت کیے نہیں رہتے۔ قانون کی تو پوری پوری اطاعت کرتے ہیں لیکن کوئی حاکم چاہے کہ بے ضابطہ کوئی کاروائی کرے، کیا مجال۔ ولایت تک اس کے دھوئیں بکھیر کر بس نہ کریں۔ ان اضلاع میں دیسی اخبار ایسے پھیل پڑے ہیں جن کا شمار نہیں جس اخبار کو کھول کر دیکھیے، شروع سے آخر تک گورنمنٹ کی مذمت، حکام کی ہجو اور اس پر بھی بند نہیں۔ ناولوں کے ذریعے سے فضیحت کریں۔ تھیٹروں میں نقلیں نکالیں۔ سوانگ بنا بنا کر سربازار پھریں۔ میں کل جامع مسجد

سے نماز پڑھ کر آرہا تھا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک انگریز گھوڑے پر سوار چلا آرہا ہے اور لوگ ہیں کہ دو طرفہ اس کو کھڑے ہو ہو کر سلام کرتے جاتے ہیں۔ میرے ساتھ اسی طرف کا ایک خدمت گار ہے۔ وہ میرے پیچھے پیچھے تھا۔ یہ کیفیت دیکھ کر مجھ کو سخت حیرت ہوئی اور کسی سے پوچھا کیوں جی یہ کون صاحب ہیں جن کو لوگ اس طرح پر سلام کر رہے ہیں۔ اور جب اس نے سنا کہ کوئی سڑک کا ٹھیکے دار، تو اس کو اور بھی تعجب ہوا۔ مگر پھر لوگوں نے اس کو سمجھا دیا کہ اس طرف انگریزوں کی حکومت کا یہی رنگ ہے کوئی انگریز ہو' اس کو سلام کرنا چاہیئے۔ اور نہ کرو تو بعضے تو ٹوک دیتے ہیں اور بعضے ٹھوک بھی دیتے ہیں۔

شارپ : پھر ان اضلاع میں حکومت کس چیز کا نام ہے؟

حجتہ : ہمارے ہاں صرف قانونی اختیارات کے عمل میں لانے کا نام حکومت ہے اس میں بھی اس قدر بچے کو مارنا پڑتا ہے کہ بس جو کرتا ہے' اس کا جی جانتا ہے۔ آپ گھبرائیے نہیں۔ اب انگریزی کا چرچا ان اطراف میں بھی بہت ہو چکا ہے۔ کوئی دن کو یہ بھی بنگالہ ہوا جاتا ہے۔

شارپ : کچھ پروا کی بات نہیں۔ اس وقت تک ہماری سروس کی معیاد تو ہو چکے گی۔ مگر یہ تو کہیئے کہ آپ کو انجام کیا معلوم ہوتا ہے؟

حجتہ : انجام کی خبر تو خدا ہی کو ہے۔ یہ باتیں بڑے لوگوں کے سوچنے کی ہیں۔ کیا میں اور کیا میری رائے۔

شارپ : بھلا پھر بھی کیا ہوا؟ ہر ایک انسان رائے تو رکھتا ہے صحیح ہو یا غلط۔

حجتہ : خیر' آپ پوچھتے ہیں تو عرض کیے دیتا ہوں کہ میرے نزدیک انگریزی تعلیم کا یہ نتیجہ تو ایک نہ ایک دن ضرور ہونا ہے کہ گورنمنٹ کا گنگا جمنی رنگ کہ کسی قدر انگریزی ہے اور کسی قدر ایشیائی اور جس کے لیے یوریشین کا لفظ نہایت مناسب ہے اور ہم اپنی زبان میں ایسا لفظ بنانا چاہیں تو مغلئی اور انگریزی کو ملا کر مغریزی کہہ سکتے ہیں۔ غرض گورنمنٹ کا یہ دوغلا پن تو باقی رہتا نظر نہیں آتا۔ ہندوستان اور ولایت میں جو پرلے درجے کی مغایرت اور اجنبیت تھی' یوما" فیوما" کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور اس کے چند در چند اسباب ہیں۔ انگریزی تعلیم' انگریزی اور دیسی اخباروں کی کثرت' ڈاک' ریل' تار' سفر ولایت کی سہولت' ہندوستانیوں اور انگریزوں کے دلوں میں ایک دوسرے کو جاننے اور پہچاننے کا شوق۔ غرض جس قدر ہندوستانیوں کی آنکھیں کھلتی جاتی ہیں' اسی قدر ان کے حوصلے بڑھتے جاتے ہیں۔ انجام کار ہندوستانی ضرور خواہش کریں گے کہ ہوم گورنمنٹ اور انڈین گورنمنٹ دونوں کا ایک رنگ ہو اور ولایت میں جو حقوق رعایائے سلطانی ہونے کی

حیثیت سے آپ لوگوں کو دیے گئے ہیں' وہی حقوق اس ملک میں ہندوستانیوں کلے تسلیم کیے جائیں اور وہی اختیار ان کو ملیں۔

شارپ : درخواست تو معقول ہے کویں کہ ۱۸۵۷ء کے غدر سے ہندوستانیوں نے اپنی وفاداری کا بڑا عمدہ ثبوت دیا ہے۔

حجتہ : غدر میں رعیت کو آپ ناحق سانتے ہیں۔ غدر سے اور رعیت سے کیا تعلق؟ غدر کیا آپ کی فوج نے۔ رعیت کیوں فوج کی ذمے دار ہونے لگی؟ رعیت عبارت ہے رئیسان با اقتدار سے بہ حیثیت مجموعی۔ زمینداروں سے بہ حیثیت مجموعی۔ تجارت پیشوں سے بہ حیثیت مجموعی۔ اہل حرفہ سے بہ حیثیت مجموعی۔ آپ کہتے ہیں تمام ملک نے بغاوت کی ہے۔ جناب بہ حیثیت مجموعی تو آپ کی فوج نے بھی بغاوت نہیں۔ بغاوت ایک جاہلانہ شورش تھی' خاص خاص لوگوں کی' خاص خاص وجوہ سے' خاص خاص مقامات میں 'اور ایسی شورشیں ولایت میں بھی اکثر ہوتی ہیں۔ اور خدا ناخواستہ رعایا نے ۔ حیثیت مجموعی بغاوت کی ہوتی تو معاذ اللہ وہ طوفان کسی کے روکے رکتا بھی؟

شارپ : خیر جی' وہ غدر تو گیا گزرا ہوا اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کا ہونا انگریزی گورنمنٹ کے حق میں مفید ہوا۔ کیونکہ ہندوستانیوں کے دل میں یہ بھی ایک ارمان تھا سو نکل گیا۔ ہم لوگ ہمیشہ بلوے اور ہنگامے کے نام سے ڈرتے تھے۔ اب معلوم ہوا کہ اس ملک میں بلوا اور ہنگامہ بچوں کا کھیل ہے۔ سارے ملک سے ہتھیار رکھوا لیے گئے ہیں اور گورنمنٹ پہلے سے زیادہ قوی اور مطمئن ہے۔ مگر آپ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بغاوت کا مادہ دلوں میں موجود ہے اور یہ ضرور پھر ایک نہ ایک دن اپنا رنگ لائے گا۔ کسی طرح کے لوگ ہیں کہ غدر کی وجہ سے اتنی آفتیں نازل ہوئیں اور پھر باز نہ آئے۔ ان کے لیے تو حقیقت میں خاص ایشیائی حکومت چاہیئے۔ اسی کے یہ ہمیشہ خوگر ہیں اور اسی سے یہ ٹھیک بھی رہتے ہیں۔

حجتہ : محال عقل ہے کہ برٹش گورنمنٹ ایسی اجلی اور مہذب اور شائستہ گورنمنٹ ہو کر وحشی اور بے ہودہ اور نالائق گورنمنٹوں کا طریقہ اختیار کرے۔

شارپ : پھر آپ لوگ برٹش گورنمنٹ کی جیسی چاہیے قدر کیوں نہیں کرتے؟

حجتہ : تمام ہندوستان میں کسی مذہب کسی قوم کا ایک متنفس بھی ایسا نہیں جو برٹش گورنمنٹ کو تہہ دل سے عزیز نہ رکھتا ہو۔ ہم لوگ نیم وحشی' جاہل' نامہذب' جو جو چاہو ہیں سو ہیں مگر باؤلے نہیں کہ اپنے نفع و نقصان میں امتیاز نہ کر سکیں۔ امن اور آسائش اور آزادی اور انصاف اور جان اور مال اور مذہب یعنی تمام حقوق کی حفاظت اور فلاح و بہبود جو انگریزی

عمل داری میں ہے، کہیں نہیں۔ اس کے لیے ہم پہلے خدا کے اور خدا کے بعد گورنمنٹ کے بہت بہت شکرگزار ہیں۔ ہم نے ایشیائی گورنمنٹ کی مصیبت نہیں جھیلی تو بھی ہم اس کی حقیقت سے ناواقف نہیں۔ ہم نے بزرگوں سے بہت سے دردناک افسانے سنے ہیں۔ ایشیائی گورنمنٹ کے نمونے برٹش گورنمنٹ کے طفیل پورے پورے نہیں مگر ناقص اور ادھورے جا بجا دیسی ریاستوں میں اب بھی موجود ہیں۔ اور ہم میں سے بہت سے لوگوں کو دوسرے ملکوں میں جانے اور رہنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ غرض پردے میں بیٹھنے والی عورتیں تک جانتی ہیں کہ انگریزی عملداری کے برابر روئے زمین پر کہیں آرام نہیں۔

شارپ : میری زبان سے ایسے الفاظ شاید نکلے ہوں، مگر خیر مطلب ایک ہی ہے بات یہ ہے کہ ہمارے ملک میں گنتی کے چند آدمی پولیٹیکل باتوں کی سوچنے سمجھنے کی لیاقت رکھتے ہیں اور وہ چند آدمی بھی اکثر بلکہ سب سرکار کے بنائے تیار کیے ہوئے ہیں۔ جنھوں نے سرکاری کالجوں میں تعلیم پائی اور ان کے دو سے چار آنکھیں ہوئیں۔ غرض پولیٹیکل خیالات اس زمانے کی جدید تعلیم کے نتیجے ہیں۔ جوں جوں تعلیم کا رواج ہوتا جاتا ہے، پولیٹیکل خیالات کی کثرت ہو جاتی ہے۔ قومی اتفاق جس کو آپ نیشنلٹی کہتے ہیں، نہ ہندوستان میں اب ہے نہ آئندہ اس کے قائم ہونے کی امید۔ نہ سارے ہندوستان کا کبھی ایک مذہب ہو گا اور نہ یہاں کے باشندے کبھی ایک نیشن بنیں گے۔ پس ناراض و ناخوش جو کچھ سمجھے یہی نئے تعلیم یافتہ لوگ ہیں۔ یہی لوگ اخباروں میں، لیکچروں میں اکثر جلی کٹی کہتے رہتے ہیں۔ سو ان کی نارضامندی اور ناخوشی بھی ہرگز مخالفانہ اور باغیانہ نہیں ہے۔ بلکہ اسی قسم کی جیسے آپ کے عملوں میں سے کوئی شخص اپنے تئیں ترقی کا مستحق سمجھتا ہے اور اس کو اس کی خواہش کے مطابق نہیں ملتی۔ آپ فرماتے ہیں کہ غدر کے بعد بھی لوگ باز نہ آئے۔ سو جناب من، غدر کے بعد سے تو ہندوستانی اور بھی شیخی میں آگئے۔ ان کی توقعات کی کچھ حد نہ رہی کہتے ہیں غدر میں لٹے گھسٹے، برباد ہوئے، مگر خدا نے کمپنی سے پیچھا چھڑایا۔ سوداگر لکھ پتی کروڑ پتی سہی مگر آخر ہے تو سوداگر جس نے پیسے میں سے کچھ کوڑیاں بچا بچا کر دولت جمع کی ہے۔ اس میں بادشاہ کی سی سیرچشمی اور فیاضی کہاں؟ اور پھر سوداگر کے علاوہ ملک کے ٹھیکے دار اور ٹھیکہ بھی معیادی، ان کو بادشاہ کی رعیت کر پرداخت کا خیال کیوں ہونے لگا؟ غرض کچھ ملے نہ ملے (اور کیوں نہ ملے، ملے ہی گا) لوگ تو بڑی بڑی امیدیں لگا رہے ہیں۔ ملکہ کو دیکھا نہیں، بھالا نہیں، اور دیکھنے کی امید بھی نہیں۔ مگر خدا جانے کیا بات ہے، کوئی دل نہیں جس میں ملکہ کے نام کے ساتھ جوش نہ پیدا ہوتا ہے۔

شارپ : اگر یہ صرف بنگالی بابوؤں کا غل ہے تو کچھ ہونا ہوانا نہیں۔ ان کے دماغ میں یہ خبط سمایا ہے کہ صرف ٹوٹی پھوٹی انگریزی پڑھ لینے سے ہم بھی یورپینز کی طرح کے آدمی ہیں اور ہمارے ساتھ بھی یورپینز کی سی مدارات ہونی چاہیے۔ سو سرے سے یہ یورپینز کی طرح کے آدمی ہی نہیں۔ یورپینز کی طرح ان میں نیشنلٹی نہیں، پبلک اوپنین نہیں، آزادی، روشن ضمیری نہیں، جفاکشی نہیں، استقلال نہیں، جرات نہیں، سچائی نہیں کہ تلاش نہیں، یک دلی، اتفاق نہیں۔

حجتہ : یہ آپ کا فرمانا بالکل درست ہے۔ مگر لوگوں میں انگریزیت چلی آتی ہے اور گورنمنٹ بھی آہستہ آہستہ ہندوستانیوں کو اختیارات دیتی جاتی ہے۔ ابھی غدر کو کتنے دن ہوئے۔ گورنمنٹ کی شان ہی دوسری ہو گئی ہے۔

اس کے بعد شارپ صاحب نے میز پر ٹائم پیس کو دیکھا تو حجتہ الاسلام نے کہا کہ میں آپ سے معافی چاہتا ہوں کہ آج میں نے آپ کا بہت سا قیمتی وقت صرف کرا دیا۔

شارپ : مجھ کو آپ کی ملاقات سے بڑی خوشی ہوئی اور جیسا کہ وکٹر صاحب نے لکھا ہے، آپ بڑی معلومات اور بڑی عمدہ رائے کے آدمی ہیں اور مجھ کو ہمیشہ آپ کی ملاقات سے خوشی ہو گی۔ میں نوبل صاحب کو بڑی شکرگزاری لکھوں گا۔ اور میں آپ کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اپنے بھائی ابن الوقت صاحب کے بارے میں بالکل تچی تچی خبر دی ورنہ مجھ کو لوگوں نے ان سے بہت ہی بدظن کر دیا تھا۔

حجتہ : آپ کی اس قدر عنایت دیکھ کر اب تو مجھ سے بھی صبر نہیں ہو سکتا اور میں بہ منت آپ سے التماس کرتا ہوں کہ آپ بھائی ابن الوقت کی طرف سے صاف ہو جائیے۔

شارپ : میں نے تمام غلط خیالات کو دل سے نکال ڈالا۔ اور میں افسوس کرتا ہوں کہ مجھ سے ان کے بارے میں غلطی ہوئی۔ جو باتیں لوگوں نے مجھ سے کہیں، ان کے ظاہر حال سے ان کی تصدیق ہوتی تھی۔ میں نے ان سے سب کام نکال لیا تھا اور ہرچند صاحب کمشنر نے لکھا کہ بغاوت کا محکمہ رازداری کا محکمہ ہے اور اس کے فیصلے عام قوانین کے تابع نہیں، محکمہ بغاوت کی مثلیں دوسرے عملوں کو مت دیکھنے دو اور جن مقدمات میں ابن الوقت کارروائی کر چکے ہیں، ان ہی سے فیصلہ کراؤ مگر میرا ارادہ ابن الوقت کو کام دینے کا نہ تھا اور امروز و فردا میں میں رپورٹ کرتا۔ مگر آپ نے جو حالات بیان کیے، ان سے میری رائے بالکل بدل گئی۔ آج ہی ڈپٹی صاحب کو ان کے کام پر مسلط کر دوں گا۔

حجتہ : کام نکال لیے جانے کی تو ان کو مطلق شکایت نہیں۔ ان کو اگر شکایت ہے تو اس بات کی ہے کہ آپ نے ان کو اپنی صفائی کے ثابت کرنے کا موقع نہیں دیا۔ ورنہ یہاں تک نوبت

ہی نہ پہنچتی۔

شارپ : شکر ہے کہ میرے ہاتھ سے ان کو کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچا۔

حجتہ : یہ تو نہ فرمایئے۔ سوسائٹی میں ان کی بڑی بے وقعتی ہوئی۔

شارپ : (ذرا تامل کر کے) میں سوچ کر اس کی تلافی کر دوں گا۔ مگر انہوں نے وضع ایسی اختیار کی ہے کہ کوئی انگریز ان کے ساتھ دوستانہ برتاؤ کر ہی نہیں سکتا۔

حجتہ : آپ کو ان سے خانگی طور پر ملنے نہ ملنے کا اختیار ہے مگر میں ان کے تعزز منصبی کی حفاظت کے لیے عرض کرتا ہوں۔

شارپ : میں ضرور اس کا خیال رکھوں گا۔

چنانچہ اسی دن شارپ صاحب نے تحقیقات بغاوت کے تمام مقدمات کامل و نامکمل سب ابن الوقت کے محکمے میں واپس کر دیے۔ روبکار میں استمالت کے الفاظ جن سے ایک طرح کی معذرت بھی مترشح ہوتی تھی، لکھوا دیے، اور ابن الوقت کے نام ایک چٹھی الگ لکھی کہ آپ کے بھائی حجتہ الاسلام سے جو میں نے آپ کے حالات سنے، میرے سارے شکوک رفع ہو گئے اور میں آپ سے غلطی کی معافی چاہتا ہوں۔ اور اگر آپ اپنے بھائی حجتہ الاسلام کی سی وضع اختیار کریں، جو آپ کی قومی وضع ہے اور جس میں آپ نے بھی اپنی عمر کا بڑا حصہ بسر کیا ہے اور جو ہر ہندوستانی شریف کے لیے زیبا اور راحت بخش ہے، تو مجھ میں اور آپ میں ایسی دوستی قائم ہو گی جس کو میں ساری عمر نباہوں گا۔

فصل ۲۷

حجتہ الاسلام اور ابن الوقت کی دوسری ملاقات اور پھر مذہبی بحث

اگلے دن صبح ہی سے حجتہ الاسلام کا انتظار تھا، مگر یہ گھر سے کھانا وانا کھا پی کر چلے تو کوٹھی پہنچتے پہنچتے ساڑھے دس بج چکے تھے۔ دور سے دیکھتے ہی ابن الوقت نے کہا "آپ حقیقت میں بڑے خوش تقدیر ہیں کہ شہر میں جاتے ہی اسی رات پانی برسا اور خوب برسا۔ لو تو اب بالکل گئی۔ گنتیاں دو چار دن کی مہمان اور ہیں"

حجتہ : الحمد للہ ثم الحمد للہ۔

ابن الوقت : ثم الحمد للہ؟

حجتہ : تم ایک ہی ثم لیے پھرتے ہو، خداوند کریم کے تمام بندوں پر ہمہ وقت اتنے وافر احسانات ہیں کہ ایسے ایسے لاکھوں کروڑوں ثم بھی ان کی تلافی نہیں کر سکتے۔ مگر میں نے الحمد للہ اپنی خوش تقدیری پر کہا اور دوسرا اس بات پر کہ بھلا تم نے تقدیر کو تو مانا۔

ابن الوقت : یہ لفظ تو بے خیالی میں عادت کے مطابق میرے منہ سے نکل گیا ورنہ میں تقدیر کا بالکل قائل نہیں۔ میرے نزدیک اسی طرح کے لغو معتقدات نے مسلمانوں کو کاہل اور نالائق بنا کر اس درجے کو پہنچایا ہے کہ روئے زمین پر ان سے زیادہ مفلس اور تباہ حال کوئی قوم نہیں۔

حجتہ : تم کیوں! اس قدر مسلمانوں کے پیچھے پڑے ہو؟ کیا ریفارمر بننے کے لیے اس کی بھی ضرورت ہے کہ زبردستی کوئی نہ کوئی الزام کسی کے پلے باندھ کر اپنے تئیں سرخ رو اور دوسرے کو انگشت نما کیجیے؟

مسلمانوں کی کیا تخصیص ہے جو شخص خدا کو مانتا ہے، کسی مذہب کا ہو، وہ ضرور تقدیر کا بھی قائل ہو گا۔ پہلے سمجھو تو سہی کہ تقدیر کیا چیز ہے۔ تقدیر کے لغوی معنی ہیں اندازہ ٹھہرانا۔ دنیا میں کوئی چیز نہیں جس کا اندازہ نہ ہو۔ **انا کل شئ خلقناہ بقدر** پس اگر دنیا ہے تو اس کے ساتھ تقدیر بھی ہے۔ یا دوسرے طور پر سمجھو۔ مثلاً تم جانور یا درخت نہیں بنائے گئے بلکہ آدمی۔ یہ تقدیر ہے۔ مرد بنائے گئے عورت نہیں۔ یہ تقدیر ہے، ہندوستان اور ہندوستان میں سے خاص دلی میں پیدا ہوئے۔ یورپ، افریقہ، یا امریکہ کسی دوسری جگہ نہیں۔ یہ تقدیر ہے۔ تیرھویں صدی کے خاص حصے میں تمہاری ہستی ہوئی۔ اس سے پہلے یا پیچھے نہیں۔ یہ تقدیر ہے۔ ایک خاص مسلمان کے گھر پیدا ہوئے۔ ہندو یا عیسائی یا کسی دوسری قوم یا کسی دوسرے شخص کے یہاں نہیں۔ یہ تقدیر ہے۔ ایک خاص حالت میں پرورش پائی، بڑے ہوئے، پڑھے، لیاقت پیدا کی، نواب معشوق محل بیگم کی سرکار کے مختار ہوئے۔ یہ تقدیر ہے۔ غدر کے وقت اسی شہر میں موجود تھے۔ عین اسی زمانے میں نوبل صاحب ولایت جاتے ہوئے دلی میں ٹھہرے۔ باغیوں نے ان کو پکڑا اور اپنے پندار میں مار ڈالا۔ تم جا پہنچے اور نیم جان کو اٹھا کر گھر لے گئے۔ مرہم پٹی کی، اچھے ہوئے۔ تمہارے گھر ان کا رہنا کسی پر ظاہر نہ ہوا۔ آخر کار صحیح سلامت انگریزوں میں جا ملے۔ یہ سب تقدیر ہے۔ تم کو دفعتاً" بھرا بھتولا گھر چھوڑ کر شہر سے نکل جانا پڑا۔ بے سر و سامان باہر پڑے پھرتے تھے اور قریب تھا کہ فوج فتح مند کے سوار بیگار میں پکڑ کر تم سے مزدوری کا کام لے لیں کہ اتنے میں نوبل صاحب رجال الغیب کی طرح آموجود ہوئے اور تم کو عزت اور آبرو کے ساتھ لے جا کر گھر میں بسایا، جاگیر اور نوکری دلوائی۔ یہ سب تقدیر ہے۔ اس اثناء میں تم کو انگریز بننے کے

خبط نے آگھیرا۔ خوب خوب ڈنر دیے اور بڑی بڑی پارٹیاں بلائیں۔ ہندوستانیوں کے روٹھنے چھوٹنے کی تو تمہیں کیوں پروا ہونے لگی تھی' انگریز بھی بجائے خود چڑے' بگڑے' لیکن گھٹیا چائے اور کافی اور سوڈا واٹر اور برف اور سگریٹ کے لالچ سے' اور بڑھیا کچھ تو نوبل صاحب کی مروت سے اور کچھ تمہاری خیر خواہی اور تعزز منصبی کے لحاظ سے طوعاً" و کرہاً" تم سے ملنے لگے۔ تم نے سمجھا کہ انگریزوں نے مجھ کو اپنی سوسائٹی میں لے لیا۔ یہ سب تقدیر ہے۔ خدا نے ایک دم پانسو روپیہ ماہوار کی آمدنی کر دی تھی۔ ہندوستانی بھلے آدمی بن کر رہتے تو آج کو امیر ہوتے۔ اور کچھ نہیں تو دس بارہ ہزار روپیہ تمہارے پلے ہوتا۔ سو تم نے ایک خبط کے پیچھے ساری آمدنی پر پانی پھیر دیا۔ دس بارہ ہزار الٹا قرض ہو گیا۔ اب بزرگوں کی پیدا کی ہوئی جائیداد کے بیچنے کی نوبت پہنچی۔ یہ سب تقدیر ہے۔ اچانک نوبل صاحب کو ولایت جانا پڑا۔ ان کا منہ موڑنا تھا کہ تمہارے خواب پریشان کی تعبیر سامنے آنے لگی۔ یہ سب تقدیر ہے۔ تم اپنی حماقت کے موافق ہوا خوری کو گئے۔ دریا گنج کے نکڑ پر صاحب کلکٹر مل گئے۔ وہ پیادہ پا اور تم سوار۔ تم نے اپنے نزدیک اچھا کیا اور ہو گیا برا۔ انہوں نے تم سے گستاخی کا جواب طلب کیا۔ تمام کام چھین کر کہہ دیا کہ کچہری میں بیٹھے مکھیاں مارا کرو۔ یہ سب تقدیر ہے۔ دو برس سے اماں جان مجھ کو بلا رہی تھیں اور میرا آنا نہیں ہوتا تھا اب جو صاحب کلکٹر کی خفگی اور بارہ دری کی فروخت کا حال معلوم ہوا' ضبط نہ ہو سکا' رخصت لی' ڈکٹر صاحب سے ملنے گیا۔ تمہارے شارپ صاحب نکلے' ان کے رشتے کے بہنوئی۔ انہوں نے از خود چٹھی دی۔ شارپ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ تمہارا تذکرہ آیا۔ خدا نے کیا' صفائی ہو گئی۔ یہ سب تقدیر ہے۔ کیوں ہے یا' میں؟

ابن الوقت : تو یہ تقدیر کیا ہے' شیطان کی آنت ہے۔ کہیں میری زبان نہ پکڑیے گا۔ شیطان و یطان کو بھی میں مانتا وانتا خاک نہیں۔

حجتہ : تمہارے ماننے نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے جو واقعات حق اور نفس الامری ہیں' اگر سارا جہان ان سے انکار کرے تو بھی واقعات کا بطلان نہیں ہو سکتا۔

ابن الوقت : تو آپ کے نزدیک شیطان بھی کوئی شے ہے' موجود فی الخارج؟

حجتہ : جی ہاں۔ شے ہے' موجود فی الخارج۔

ابن الوقت : پھر دوسری اشیائے موجود فی الخارج کی طرح ہم کو نظر کیوں نہیں آتا؟

حجتہ : ہوا اور پانی جو بے شمار بھنگے ہیں اور جن کو بے مدد خردبین نہیں دیکھ سکتے' یا مکھی کی آنکھیں ہیں' یا چاند میں سمندر اور پہاڑ ہیں' اور بڑے پلے کی دوربین سے صاف دکھائی دیتے ہیں' آخر یہ چیزیں بھی تو خارج میں موجود ہیں اور ہم کو نظر نہیں آتیں۔

ابن الوقت : آنکھ سے دیکھا تو دیکھا' اور خردبین کی مدد سے دیکھا تو دیکھا۔ غرض کسی نہ کسی

طرح دیکھا تو سہی۔

حجتہ : لیکن جس زمانے میں دوربین خردبین ایجاد نہیں ہوئی تھی' لوگ ان چیزوں کو موجود فی الخارج مانتے یا نہ مانتے؟ یا اب لاکھوں کروڑوں بندگان خدا ہیں جو خردبین کے نام سے بھی آگاہ نہیں۔ وہ ان چیزوں کو موجود فی الخارج مانیں گے یا نہیں مانیں گے؟

ابن الوقت : نہ مانتے اور نہ مانیں گے۔

حجتہ : ہاں' مگر ان کے نہ ماننے سے یہ لازم آجائے گا کہ مکھی کی لاکھ آنکھیں نہیں؟ اسی طرح اگر کوئی شخص مثل تمہارے وجود شیطان سے انکار کرے' صرف اس وجہ سے کہ وہ دیکھ نہیں سکتا تو اس کا انکار کیوں معتد ہونے لگا۔

ابن الوقت : ہم نے خردبین سے مکھی کی آنکھوں اور دوربین سے چاند کے پہاڑوں کے ہونے کا یقین کیا۔ اسی طرح آپ کوئی ذریعہ بیان کیجئے جس سے شیطان کے ہونے کا یقین کیا جائے۔

حجتہ : وہ ذریعہ ہے خدا اور خدا کے رسول ﷺ کا ارشاد۔

ابن الوقت : بدیہیات میں سے تو نہ ہوا۔

حجتہ : جن کی چشم بصیرت نور ایمان سے منور ہے' ان کے نزدیک بدیہی بھی نہیں بلکہ اجل البدیہیات **فانها لاتعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور**۔

ابن الوقت : اگر شیطان موجود منفرد مانا جائے تو خدا کو ظالم اور انسان کو مجبور مطلق ماننا پڑے گا۔ کیا انصاف ہے کہ آدمی پر ایک دشمن پنہاں مسلط ہے؟

حجتہ : تو تمہارا مطلب ہے کہ سرے سے انسان کا پیدا کرنا ہی خلاف انصاف ہے' کیونکہ شیطان موجود منفرد ہو تو' اور انسانی قوت ہو تو' دونوں کا مال واحد ہے۔

ابن الوقت : خیر' آپ کی عقل ایسے ڈھکوسلوں کو قبول کرتی ہو گی۔ کہئے تو آپ کی خاطر سے جھوٹ بول دوں۔ ورنہ میں تو نہیں سمجھتا کہ جب تک مسلمان تقدیر اور شیطان اور اسی طرح کی دوسری لغویات کے معتقد رہیں گے' ان کو کبھی فلاح ہو۔

حجتہ : ملاحی گالیوں کی سہی نہیں۔ خلط مبحث مت کرو۔ مقرر کر کے ایک ایک بات کہو تو جواب دیا جائے۔

ابن الوقت : آپ ہی انصاف سے کہئے کہ تقدیر کے عقیدے نے مسلمانوں کو کاہل اور قاصر الہمت نہیں کیا؟ سب سے بڑے دیندار' ورثاء الانبیاء' دین کے محافظ' دین کے حامی' دین کے رواج دینے والے' مولوی مشائخ' اور یہ تو ہمارے گھر کا کام ہے۔ ساری حقیقت آپ

کو بھی معلوم ہے مجھ کو بھی ہے۔ مرد و زن ملا کر ڈیڑھ سو پونے دو سو آدمیوں کی گزر کس چیز پر تھی؟ خیرات پر جس کو دیکھو تن بہ تقدیر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہے۔

حجتہ : شخصیات سے بحث کرنے میں غیبت ہوتی ہے اور کسی کی نیت کا حال کیا معلوم مگر تمہارا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ تقدیر کے عقیدے نے مسلمانوں کو کاہل اور قاصر الہمت کر دیا۔ دنیا میں مسلمانوں نے کیا نہیں کیا۔ ملک گیریاں کیں، ملک داریاں کیں، خشکی اور تری کے سفر کیے، تجارتیں کیں، صناعیاں کیں، دستکاریاں کیں، علم تحصیل کیے، ایجادیں کیں۔ غرض دنیا کے سبھی کام کیے۔ اور ایسے کیے کہ ان کے زمانے میں دوسروں سے نہیں وہ سکتے تھے۔ اور اب بھی زمینداری کاشتکاری، دستکاری، تھوڑی بہت تجارت، برا بھلا پڑھنا لکھنا، نوکری چاکری سبھی کچھ کرتے ہیں۔ اور کرتے نہیں تو کھاتے پیتے کہاں سے ہیں؟ یہ بات دوسری ہے، جو چاہیئے نہیں کرتے یا کرنے میں کمی کرتے ہیں۔ مگر اس کے اسباب دوسرے ہیں، نہ یہ کہ عقیدہ تقدیر نے ان کو کاہل کر دیا ہے۔ ہندو، عیسائی، یہودی کون ہے جو تقدیر کا قائل نہیں۔ تو اگر مجرد تقدیر پر عقیدہ رکھنا کاہلی کا باعث ہوتا تو سب کاہل ہوتے، حالانکہ تم بالتخصیص مسلمانوں ہی کو مجرم ٹھہراتے ہو۔ اور چونکہ تقدیر کا حال کسی کو معلوم نہیں تقدیر پر عقیدہ رکھنا کاہلی کا سبب کیوں ہونے لگا؟ بلکہ وافر مثالیں موجود ہیں۔ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ تقدیر پر بھروسا رکھنے کی وجہ سے لوگوں نے ثابت قدمی اور مستقل مزاجی کے ساتھ کوشش کی اور آخر کامیاب ہوئے۔ اس کی ایک مثال تو جالوت طالوت کا قصہ ہے۔ کہ جب فوج طالوت لشکر جالوت کے مقابل ہوئی تو طالوت کی فوج بہت تھوڑی تھی۔ لوگ کہنے لگے، ہم میں جالوت اور اس کے لشکر کی مقاومت کی طاقت نہیں۔ یہ سن کر وہ لوگ جن کا خیال تھا کہ مرے پیچھے ہم کو خدا کے پاس جانا ہے، کہنے لگے کہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ تھوڑے لوگوں نے بہتوں کو ہرایا ہے۔ اور خدا صبر کرنے والوں کا ساتھ دیتا ہے۔ اس کے بعد جو طالوت والوں کے کچکچا کر دھاوا کیا تو جالوت والوں کو مار ہٹایا اور جالوت مارا گیا۔ یہ قصہ قرآن میں مذکور ہے۔ اس کو پرانی کہانی مت سمجھنا۔ ایسی باتیں اکثر اب بھی واقع ہوتی ہیں کہ صرف تقدیر کے بھروسے پر ہمت کر بیٹھے ہیں اور مشکلات پر غالب آتے ہیں۔"

مرد باید کہ ہراساں نشود   مشکلے نیست کہ آساں نشود

ابن الوقت : آپ تو فرماتے تھے کہ تقدیر کا حال کسی کو معلوم نہیں۔ پھر جو لوگ تقدیر پر بھروسا کر کے کسی کام کی ہمت کر بیٹھتے ہیں، ان کو کہاں سے خبر ہو جاتی ہے کہ تقدیر موافق اور

مساعد ہے؟

حجتہ : یہ بھروسا کرنے والوں کے دلوں سے پوچھنا چاہیئے۔ مثلاً طرفداران طالوت نے واللہ مع الصابرین۔ سے مساعدت تقدیر کا اذعان کر لیا اور ان کے اذعان سچ نکلا۔ ایک زمیندار کا حال تو مجھ کو معلوم ہے۔ وہ کچھ بسوے ہار گیا تھا۔ سنا ہے کہ بارہ برس سے اسی دھن میں پھرتا تھا۔ کہیں شنوائی نہیں ہوئی۔ آدمی تھا نمازی ایک دن مسجد میں ملا۔ میں نے اس کو سمجھایا کیوں پریشان ہوتے ہو۔ صبر کرو کہنے لگا، ناخدا ترس وکیلوں نے مقدمے کو خراب کیا، مگر الحق یعلوا۔ میرا حق کبھی نہ کبھی ضرور مجھ کو ملے گا پھر سنا کہ ڈسٹرکٹ جج کو جنگل میں اس نے اکیلا پا کر سارا حال بیان کیا اور ان کو اپنی صداقت سے مطمئن کر دیا۔ جج نے کوئی تدبیر کر کے اس کے بسوے نکلوا دیے۔ یہ تو میں نے تم کو مسئلہ تقدیر کا ایک پہلو دکھایا ہے۔ یعنی انجام کار فوز اور کامیابی ہو تو اذعان تقدیر سے انسان کو کس قدر تقویت پہنچتی ہے۔ وہ تقدیر کے بھروسے سے پر جان توڑ کر محنت کرتا اور محنت کو خوش دلی سے برداشت کرتا ہے۔ رہی ناکامی، اس کی جراحت کا تو اذعان تقدیر سے بہتر کوئی مرہم نہیں۔ معتقد تقدیر حرمان کو من جانب اللہ سمجھ کر اپنے دل کو تسلی دے لیتا ہے کہ اس میں کوئی مصلحت مضمر ہو گی۔ غرضیکہ تقدیر کا ایسا عمدہ مسئلہ اور تمام اس پر معترض ایسا صحیح خیال اور تم اس سے منکر۔

ابن الوقت : اگر دنیا میں اونچ نیچ، خوشی اور رنج، یعنی اختلاف حالات امر تقدیری ہے تو خدا کو دانشمند اور منصف اور رحیم ماننا مشکل۔

حجتہ : تم کو سرے سے خدا کا ماننا ہی مشکل ہو رہا ہے اس مشکل کو خدا آسان کرے تو پھر دین کی ساری باتیں تم کو سہل اور سلیس معلوم ہوں اور آسانی سے سمجھ میں آئیں۔ بھائی جان دینیات میں غور کرنے کا یہ طریقہ نہیں جو تم نے اختیار کیا ہے۔ مولانائے روم فرماتے ہیں

گر بہ استدلال کارے دیں بدے   فخر رازی راز دار دیں بدے

تمہاری باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تم کو حاجت مندانہ دین کی طلب اور تلاش نہیں۔ بلکہ تم دین کی باتوں سے اس طرح مخاصمانہ پیش آتے ہو جیسے کوئی عیار وکیل فریق مقابل کے گواہ سے۔ یوں تو دین کی نعمت نہ ملی ہے نہ ملے گی۔ ایک تدبیر تم کو میں بتاتا ہوں کہ جس وقت تمہاری طبیعت افکار دنیا سے بالکل فارغ اور مطمئن ہوا کرے، تنہائی میں، خصوصاً رات کے وقت کبھی کبھی سوچا کرو کہ دنیا ہے کیا چیز۔ دنیا کا ایک بڑا بھاری عظیم الشان کارخانہ ہے۔ کہنے کو محدود

ہے مگر کسی نے اس کی انتہا نہ پائی۔ اس کارخانے کے مقابلے زمین کی باہیں وسعت اتنی بھی تو حقیقت نہیں جیسے ذرے کی۔ کیا علم ہیئت کی باتیں خیال سے اتر گئیں؟ تم تو سب سے زیادہ اس کی طرفداری کیا کرتے تھے۔ اگر وہ سب باتیں سچی ہیں اور مشاہدات اور اصول ہندسہ پر مبنی ہیں' تو ان کو غلط ہی کون کہہ سکتا ہے۔ تو چاروناچار انسان کو اپنی درماندگی اور نارسائی اور بے حقیقی کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔ ہزار' دس ہزار' بیس ہزار' پچاس ہزار' لاکھ کوس تک کا بھی خیر ہم یونہی سا کچھ اندازہ کر سکتے ہیں۔ مہاسنکھ در مہاسنکھ کوسوں کے سمجھنے کو کس کی انکل لائیں؟ بھلا کچھ ٹھکانا ہے ان دوریوں کا کہ زمین پر سے گولا چھوٹے اور شبانہ روز متصل ایک رفتار سے سیدھا چلا جائے تو انیس برس میں جا کر آفتاب تک پہنچے۔ اللہ اکبر جل شانہ! بڑے سے بڑے پلے کی دور بینیں ایجاد ہوئیں مگر اجرام فلکی کا کیا دیکھا؟ ایک جھلک وہ بھی ان معدودے چند کی جو زمین سے بہ نسبت دوسرے بے شمار اجرام فلکی کے قریب ہیں۔ کبھی آسمان خوب صاف ہوتا ہے تو اندھیری رات کو کثرت سے ستارے دکھائی دیتے ہیں۔ گویا کہ کہری افشاں چھڑکی ہوئی ہے۔ اور اگر کسی طرح اونچے سے اونچے ستارے پر پہنچنا ممکن ہوتا تو وہاں سے بھی' جہاں تک اور آگے کو نظر کام کرتی' یہی کیفیت دکھائی دیتی۔

پھر خدا جانے کتنے کالے کوسوں کی مسافت ہے کہ ستارے ہم کو ننھے ننھے نقطے دکھائی دیتے ہیں۔ ورنہ جس طرح اس کا یقین ہے کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں' اسی طرح جاننے والوں کو اور خاص کر تم کو اس کا اذعان ہونا چاہیئے کہ ایک نقطہ بجائے خود ایک جہان ہے۔ اور جہان بھی کیا ہے کہ اگر اس کو بڑا مٹکا فرض کرو تو زمین اس کے سامنے خشخاش کا نہ سہی تو رائی کا دانہ۔ جو تارے زمین سے زیادہ پاس ہیں' یعنی ان کی دوری لاکھوں کوس کے پیٹے کے اندر ہی اندر ہے' دور بین کی مدد سے ان کے حالات کسی قدر زیادہ دریافت ہوئے ہیں۔ اور پاس پڑوس کی آخر تھوڑی بہت خبر ہونی ہی چاہیئے۔ سمندر' جھیلیں' پہاڑ' دھوپ' چھاؤں' ہوا' بادل' یہ سب چیزیں ان تاروں میں صاف دکھ پڑتی ہیں۔ اس سے اور دوسرے بہت سے قرائن سے علمائے ہیئت قیاس کرتے ہیں اور بجا قیاس کرتے ہیں کہ زمین کی طرح ان جہانوں میں بھی جاندار آباد ہیں۔ یہاں عقل انسانی کے اوسان اور بھی گم ہیں۔ بھلا اتنے بے شمار جہانوں کی کل مخلوقات کی گنتی تو درکنار تمام اقسام تک منضبط نہیں۔ **وما من دابه فی الارض ولا طیر یطیر بجناحیه الا امم امثالکم۔** کسی کتاب میں نظر سے گزرا کہ زمانہ حال کا کوئی فلسفی خرد بین میں پانی کی ایک بوند دیکھ رہا تھا۔ سو سے زیادہ طرح کے جاندار تو وہ اس ایک بوند میں بمشکل شمار کر سکا۔ آخر تھک کر بیٹھ رہا۔ ایک بوند میں اتنی مخلوقات ہو تو تمام کرہ آب میں جو تین چوتھائی زمین کو ڈھانکے ہوئے ہے' کتنی مخلوقات ہوگی۔ خدا ہی کو خبر ہے۔ **وما یعلم جنود ربک الا هو** پھر زمین کے گرداگرد

۴۵ کے دل کا ہوا کا کرہ ہے اور اس میں بھی جانداروں کی ایسی ہی یا اس سے زیادہ کثرت ہے۔

ہرچند کارخانہ قدرت الٰہی کی عظمت اور شان فہم بشر سے خارج ہے مگر جس طریق پر میں نے اجمالاً بیان کیا اگر کوئی آدمی متواتر اور متصل مدتوں تک غور کرتا ہے تو ضرور اس کے دل میں اپنی بے حقیقی اور درماندگی اور بے وقعتی کا تیقن پیدا ہوگا جس کو میں دینداری کی بنیاد یا تمہید سمجھتا ہوں۔ اس کے بعد ذہن کو اس طرف متوجہ کرنا چاہیئے کہ اتنا بڑا کارخانہ بایں عظمت کیسی عمدگی اور کیسے انضباط کے ساتھ چل رہا ہے کہ عقل دنگ ہوتی ہے۔ اجرام فلکی کے اتنے بڑے بے شمار گولے کہ خدا کی پناہ' اور خود زمین' سب چکر میں ہیں خدا جانے کب سے اور کیوں اور کب تک اور نہ آپس میں ٹکراتے ہیں اور نہ بال برابر اپنی رفتار بدلتے ہیں۔ اب جو آدمیوں کو قاعدہ معلوم ہو گیا ہے تو سینکڑوں ہزاروں برس پہلے سے پیش گوئی ہو سکتی ہے کہ فلاں ستارہ فلاں وقت پر فلاں مقام پر ہوگا اور وہیں ہوتا ہے۔ حساب میں اگر غلطی نہ ہو تو منٹ اور سیکنڈ کیسا سیکنڈ کے ہزارویں حصے کی قدر بھی آگا پیچھا نہیں ہو سکتا۔

والشمس تجری لمستقرلها ذالک تقدیر العزیز العلیم والقمر قدرنه منازل حتی عاد کالعرجون القدیم لاالشمس ینبغی لها ان تدرک القمر ولا الیل سابق النهار و کل فی فلک یسبحون۔

یہاں روئے زمین پر ایک بھنگے ایک دانے' ایک پھل' ایک پنکھڑی' گھاس کے ایک ڈنٹھل' چھوٹی سے چھوٹی اور ادنیٰ سے ادنیٰ چیز کو بھی نظر غور سے دیکھو تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر شے کی کچھ نہ کچھ غرض و غایت ہے جس کی تکمیل کا پورا پورا سامان اس چیز میں موجود ہے۔ مثلاً ریگستانی علاقوں میں اونٹ پیدا کیا گیا ہے تو اس کے پاؤں کے تلوے چوڑے اور اسفنج کی طرح پولے ہیں کہ ریت میں نہ دھنسیں۔ اس کی گردن بہت لمبی ہے تاکہ اونچے درختوں کے پتے چر سکے۔ اس کو ایک خاص طرح کا خانہ دار معدہ دیا گیا ہے' جس میں کئی کئی ہفتوں کے لیے پانی بھر لیتا ہے۔ کیونکہ جیسے ملک میں وہ پیدا کیا گیا ہے وہاں کئی کئی دن تک متواتر پانی چارے کا نہ ملنا کچھ تعجب نہیں۔ اس کے علاوہ اس کے پاس کوہان کا گودام ہے۔ اگر اس کو ایک عرصہ خاص تک کھانا پینا کچھ بھی نہ ملے تو کوہان کی چربی بدل ماتحلل کا کام دے۔ ہرن وغیرہ جنگلی جانوروں کی ٹانگیں پتلی پتلی ہیں تاکہ شکاری جانوروں سے بچنے کے لیے پھرتی کے ساتھ بھاگ سکیں۔ ہاتھی کے ایک سونڈ لٹک رہی ہے جس سے وہ ہاتھ کا کام لیتا ہے۔ پرندوں کے ڈینے سبک ہیں تاکہ ہوا میں اڑ سکیں۔ دریائی جانوروں کے پنجے کھال جڑے ہوئے۔ گویا کہ ہر ایک کے پاس قدرتی چپو ہیں۔ گوشت خور جانوروں کے پنجے اور دانت ان کی غذا کے مناسب ہیں۔ نباتات میں پھل پھول کی حفاظت کے واسطے کانٹے ہیں' پوست ہیں' خول ہیں' سرد ملک کے جانوروں کی اون بڑی بڑی اور گھنی ہے کہ

جاڑا نہ کھائیں۔ جتنے جاندار معرض تلف میں ہیں' ان میں توالد و تناسل کی کثرت ہے تاکہ نسل معدوم نہ ہو۔ مثلاً ایک مچھلی لاکھ لاکھ سے زیادہ انڈے دیتی ہے۔ آدمی چونکہ ابقائے حیات کا سامان عقل کی مدد سے بہم پہنچا سکتا ہے' سینگ' پنجے اور اون اس قسم کے قدرتی سامان اس کو نہیں دیے گئے۔ جس ملک میں نباتات کی کثرت ہے وہیں برسات بھی زیادہ ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ ملک پانی کا محتاج ہے۔ انسان اگر اپنی بناوٹ میں غور کرے تو اس کا ایک ایک رواں صانع قدرت کی کمال دانشمندی اور عنایت پر گواہی دے رہا ہے۔

بر ہر بن مو کہ می نہم گوش فوارہ فیض اوست در جوش

اس کے جسم میں ایک چھوٹا اور آسان سا پرزہ ہاتھ ہے کہ دنیا میں جس قدر انسان کے تصرفات ہیں اور انسان کی بساط پر خیال کرو تو ان تصرفات کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے' سب اسی پرزے کے ہیں۔ اہل یورپ نے عقل کے زور سے بڑی بڑی کلیں بنائی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان کلوں سے عقل انسانی کی قوت بڑی شدومد کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے۔ مگر مجھ کو بھی دو چار کلوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ایک بکھیڑا ہے کہ بیسیوں زمین پر پھیلا ہے۔ سینکڑوں پرزے' ہزار ہا پیچ' بیلن' پہیے' چرخیاں' کمانیاں' خدا جانے دنیا بھر کے کیا کیا سامان جمع کیے ہیں۔ تب کہیں جا کر وہ ایک مطلب حاصل ہوتا ہے جس کے لیے کل بنائی گئی ہے۔ یہ آدمی کی بنائی ہوئی کلوں کا حال ہے' اور ایک ادنیٰ سی کل خدا کی بنائی ہوئی ہے۔ یہی آدمی کا ہاتھ کہ ہزار ہا قسم کے کام اس سے نکلتے ہیں اور ترکیب دیکھو تو ایسی سلیس اور مختصر کہ ایک کف دست ہے اور تین تین جوڑ کی پانچ انگلیاں اللہ اللہ خیر سلا۔

انسان کے بدن میں ایک اور ذرے بھر کی چیز آنکھ ہے۔ اس کی ساخت میں جو اندرونی حکمتیں ہیں ان سے بالاستیعاب ایک کتاب بن سکتا ہے۔ مگر خارج کی احتیاطوں کو تو دیکھو کہ پہلے گویا ہڈیوں کا واک ہے جس میں نگینے کی طرح آنکھ تعبیہ کی ہوئی ہے۔ اوپر بھوؤں کا چھجے دار سائبان۔ سامنے پپوٹوں کا پردہ۔ پردے میں پلکوں کا جھالر۔ پھر پپوٹوں کے اندر منافذ ہیں جن میں آئینہ چشم کو صاف رکھنے کے لیے ایک خاص قسم کی رطوبت رستی رہتی ہے۔ یہ وہی رطوبت ہے جو زیادہ ہو کر آنسو بن جاتی ہے۔ جتنی دفعہ انسان پلک جھپکاتا ہے' گویا اتنی ہی دفعہ آئینے پر پچارا پھیرتا ہے۔ گرد اور دھوئیں اور کنک کی صورت میں بے اختیار آنسو بہنے لگتے ہیں۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ پچارا کافی نہیں بلکہ آئینے کو دھونے کی ضرورت ہے۔ **فتبارک اللہ احسن الخالقین** میرا تو کیا منہ ہے کہ موجودات عالم میں جو اسرار حکمت مضمر ہیں' ان کا ایک شمہ بھی بیان کر سکوں۔ مگر میری غرض اسی قدر ہے کہ دنیا کے کارخانوں کو اس نظر سے دیکھنا چاہیے۔ کل میں نے

آیۃ اللہ (ابن الوقت کے چھوٹے بھتیجے کا نام) ہی کا سبق سنا۔ وہ عجائب قدرت پڑھتا ہے۔ کسی شخص نے نیچرل فلاسفی میں سے بعض بعض مضامین چھانٹ کر اردو میں ترجمہ کر دیے ہیں۔ اسی میں لکھا تھا کہ مچھر کے منہ کے آگے جو پتلی سونڈ ہوتی ہے' وہ حقیقت میں ایک نلوا ہے۔ اس نلوے میں تین اوزار ہوتے ہیں' ایک تو سوئی جس کو مچھر مسام میں داخل کرتا ہے' ایک آری کہ مسام کو چوڑا کرنے کی ضرورت ہو تو اس سے کام لے' اور ایک پچکی جس کی راہ خون چوستا ہے۔ اس میں اتنی بات اور بھی تھی کہ اس شکل خاص میں مچھر کی حیات کی مدت صرف تین دن کی ہے۔ ایک مقام پر تھا کہ تیتری کے ایک پر میں کپڑوں کی طرح تیس ہزار ڈبیاں ہیں۔ اس طرح کی باتوں کو اگر انسان سرسری طور پر نہ سنے جیسی کہ اس کی عادت ہے' تو ہر ذرہ اس بات کی گواہی دے گا کہ اس کو کسی بڑے قدرت والے دانشمند' ہمہ دان' حاضر و ناظر' سمیع و بصیر نے کسی مصلحت سے جان بوجھ کر بنایا ہے۔ ممکن نہیں کہ انسان صمیم قلب سے موجودات عالم میں غور و خوض کرے اور اس کا دل اندر سے نہ بولنے لگے کہ یہ اتنا بڑا کارخانہ بہ ایں عمدگی و انضباط خود بخود یا اتفاقیہ طور پر تو نہیں ہو گیا۔ کیونکہ واقعات اتفاقی کی شان ہی دوسری ہوتی ہے۔ ان میں قاعدے کا کہاں پتا' اور انضباط کا کیا مذکور؟ اور قاعدہ اور انضباط بھی کیسا کہ دنیا کی ابتدا سے لے کر آج کی گھڑی تک۔ تو ان میں رتی برابر فرق نہیں پڑا۔ **ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا ولن تجد لسنۃ اللہ تحویلا۔**

جس غور کی طرف میں تمہیں متوجہ کرنا چاہتا ہوں' اس میں یہ بھی داخل ہے کہ وقت کیا چیز ہے' جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا۔ اگرچہ وقت کا اندازہ بھی فہم بشر سے خارج ہے' مگر خیر جہاں تک تم سے اجرام فلکی کے فاصلوں کی طرح اندازہ کرتے بن پڑے' لاکھ دو لاکھ' چار لاکھ برس کا ایک محدود وقت لے کر اسی کی وسعت کو سوچو اور تمثیلاً یوں تصور کرو کہ وقت ایک بڑا لمبا خط ہے۔ اس میں سے تمہاری ہستی اگرچہ تمہاری معتقدات کے مطابق طب انگریزی پر پورا عمل کرنے سے حد طبعی سے بھی کتنی ہی متجاوز کیوں نہ ہو جائے' تاہم اس کو وقت مفروض کے ساتھ کیا نسبت ہو گی؟ شاید جیسی محیط زمین کے مقابلے میں ایک انچ کو بلکہ اس سے بھی کم یہ انسان کی ہستی ہے اور اس پر خدا سے انکار اور اپنی عقل پر ناز بیجا! انسان سے دنیا میں ہزار طرح کی بے ہودگیاں سرزد ہوتی ہیں۔ مگر یہ بے ہودگی سب بے ہودگیوں پر فوق لے گئی ہے۔ کہ خدا ہی کا منکر ہو۔ بڑے افسوس کی بات ہے اور پرلے درجے کی بدقسمتی کی عقل جو انسان کو اسی غرض سے دی گئی ہے کہ مخلوقات سے خالق کو پہچانے ورنہ دنیا کی چند روزہ زندگی تو جانور بھی بسر کر لیتے ہیں جن کو بہت سا کھانا اور پانی درکار ہوتا ہے۔ اور مزہ یہ ہے کہ حاجتیں کثیر اور عقل کم اور پھر انسان سے کہیں زیادہ خوش حال۔ غرض بڑے افسوس کی بات ہے کہ وہی عقل انسان کو ایسا گمراہ کرے کہ خدا کا قائل

نہ ہونے دے۔ حقیقت میں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی آدمی کس منہ سے کہہ سکتا ہے کہ خدا نہیں۔ تم مجھ کو اتنا تو سمجھاؤ کہ تم نے اپنے تئیں سمجھا کیا ہے؟ چندیں ہزار عالم کے مقابلے میں تمہاری کیا حقیقت ہے؟ اور چندیں ہزار عالم بھی نہ سہی، ان کی مخلوقات بھی نہ سہی۔ اس روئے زمین پر ابتداء سے اب تک تم جیسے اور تم سے بہتر، اور تم سے بہتر سے بہتر کروڑ ہا آدمی پیدا ہوئے ہیں اور اپنی زندگی میں انہوں نے کیا کیا کچھ نہیں کیا۔ خدا کے ایسے ایسے بھی بہت سے بے شمار بندے ہیں۔ جنہوں نے حکومتیں کیں، سلطنتیں کیں، اپنے زمانے میں نامی نامور ہوئے اور پھر ایسے مٹے گویا پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ نہ ان کا نام ہے نہ نشان ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ تم کوئی انوکھے آدمی ہو؟ تم بھی اپنے ارادے سے پیدا نہیں ہوئے اور قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے ہاتھ میں میری اور تمہاری سب جانداروں کی جان ہے، اپنے ارادے سے زندہ بھی نہیں ہو، اور اپنے ارادے سے مرو گے بھی نہیں۔ اور مرے بعد مہینے دو مہینے پیچھے نہ سہی پچاس، سو، دو سو، ہزار برس بعد روئے زمین پر اتنا جاننے والا بھی کوئی نہیں ہو گا کہ ابن الوقت بھی کوئی تھا۔ بندۂ خدا ذرا سوچ کر تو کہو کہ خدا بھی ہے یا تم ہی تم ہو؟

ابن الوقت : آپ نے ناحق ڈپٹی کلکٹری کی۔ آپ کو تو سلطان الواعظین ہونا چاہیے تھا۔ لیکن گستاخی معاف، جتنی باتیں آپ نے کہیں، اساطیر الاولین ہیں۔ مجھ کو بھی معلوم ہیں۔ آپ کی تمام تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ نے لاعلمی کا نام خدا رکھ چھوڑا ہے۔ دریافت سبب سے عاجز ہوئے، خدا ماننے لگے۔ لوگ دیکھتے ہیں کہ مثلاً آدمی پانی نہیں برسا سکتا تو کہتے ہیں خدا برساتا ہے۔ لیکن فرض کیجئے کہ کسی وقت پانی کو ہم اپنے بس میں کر لیں اور جب چاہیں برسا لیا کریں، اور جب ہم کو یہاں تک پتا لگ گیا ہے کہ ہوا بسیط نہیں، جیسا کہ متقدمین فلاسفہ خیال کرتے ہیں، بلکہ آکسیجن، ہائیڈروجن، نائیٹروجن تین قسم کی ہواؤں سے مرکب ہے، اور ہوا میں اس درجے تک ہائیڈروجن غالب ہو تو ہوا پانی بن جاتی ہے، کیا تعجب ہے کسی نہ کسی دن ہم پانی برسانے پر قادر ہو جائیں۔ جب سے یورپ میں علوم جدیدہ شائع ہونے شروع ہوئے، ثابت ہو تا گیا کہ انسان کی طاقت محدود نہیں کون کہہ سکتا ہے کہ انسان جس نے ریل چلائی، تار دوڑایا اور ہزار ہا نئی نئی چیزیں دریافت کیں، آئندہ کچھ نہیں کرے گا؟"

حجتہ الاسلام : میں واقعات پیش کرتا ہوں اور تم مفروضات کا حوالہ دیتے ہو۔ یہ سچ ہے کہ اس زمانے میں انسان نے اپنی قوت کو بہت بڑھایا ہے۔ مگر تانت باجی راگ پایا۔ معلوم ہے کہ انسان کہاں تک ترقی کر سکتا ہے۔ اس کی ساری ہیری اتنی بات پر ختم ہے کہ وہ چیزوں میں، سو بھی سب میں نہیں، کسی قدر تصرف کر سکتا ہے اور بس۔ مثلاً ریل میں سوائے

اس کے اور کیا دھرا ہے کہ خدا نے کسی کے ذہن کو اس طرف منتقل کر دیا کہ بھاپ میں بڑی طاقت ہے۔ پھر لوگ لگے اس طاقت سے کام لینے کی تدبیریں کرنے رفتہ رفتہ ریل چل کھڑی ہوئی۔ مگر یہ تو فرماؤ، ریل کی ایجاد میں انسان نے سب کچھ تو کیا لیکن پانی، آگ، بھاپ، لوہا، لکڑی جو جو چیزیں ریل میں کام آتی ہیں، ان میں سے کسی چیز کی کوئی خاصیت خلق بھی کی؟ یاد رکھو اور دریافت کرنے اور خلق کرنے میں بہت بڑا فرق ہے مجھ کو بھی یاد ہے، میں نے مدرسے میں نریشم صاحب کو یہ تماشا کرتے ہوئے دیکھا تھا کہ ایک شفاف بوتل میں ہوا بھرلی۔ تھوڑی دیر میں بوتل کے اندر پانی کی بوندیں بن جاتی ہیں۔ اسی پر تم کو خیال ہوا ہو گا آدمی پانی برسانے پر قادر ہو جائے تو تعجب نہیں۔ تم کو تو شروع سے انگریزوں کے ساتھ عقیدہ ہے۔ اس تماشے کی تم ہی نے کچھ عظمت کی ہو گی میں تو کئی بار بولنے کو ہوا تھا کہ اس میں آپ نے کمال ہی کیا کیا؟ ہم تو اپنے گھروں میں ہر روز دیگچی کی چپنی سے بوندیں جھڑتی ہوئی دیکھتے ہیں۔ لیکن صرف اتنی بات ہے کہ آدمی نے تھوڑی سی جگہ میں کسی تدبیر سے اس قدر ہائیڈروجن جمع کر دی جتنی ہوا کہ پانی بن جانے کے لیے ضروری ہے، نہ خدا سے انکار کر سکتا ہے، نہ خدا سے مستغنی ہو سکتا ہے اور نہ خود دعوی خدائی کر سکتا ہے۔ اور آدمی ہی بہ ایں عقل و دانش خدا نہ ہو سکا تو چاند، سورج، عناصر وغیرہ کسی میں بھی خدا ہونے کی لیاقت نہیں۔ کیونکہ ان میں تو عقل و ارادے کی بھی کمی ہے۔ حضرت ابراہیم علی نبینا و علیہ الصلوۃ والسلام نے جو چاند اور سورج اور تاروں کو دیکھ کر فرمایا تھا لا احب الآفلین کہ میں چھپ جانے والوں کو نہیں چاہتا، ان کا یہی مطلب تھا۔

ابن الوقت : بات یہ ہے کہ دنیا کی پہیلی کا کسی نے اتاپتا تو پایا نہیں۔ جو جس کی سمجھ میں آتا ہے کہتا ہے اس سے بہتر یہ ہے کہ ناحق کیوں سر کھپایا جائے۔ جس طرح دنیا چلی آئی، اس کو چلنے دیا جائے۔ میں تو حافظ کے اس شعر کو بہت پسند کرتا ہوں ؎

سخن از مطرب و مے گو، و راز دہر کمتر جو — کہ کس نہ کشود و نہ کشاید بہ حکمت ایں معمارا

حجتہ الاسلام : اول تو شاعروں کے مقولات معاملات مذہبی میں قابل استشہاد نہیں، اور پھر آپ اس کو اپنے مطلب پر بھی خود ڈھال لے گئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس راز کی جستجو کو حافظ منع کرتا ہے۔ وہ اسرار ہیں، جن کو خدا نے آدمی سے مخفی رکھنا چاہا ہے۔ مثلاً ان اللہ عندہ علم الساعہ وینزل الغیث ویعلم مافی الارحام وماتدری نفس ماذاتکسب غدا وماتدری نفس بای ارض تموت ○ ان اللہ

علیہ خبیر یا مثلاً وہی بات جس میں تم کو شک واقع ہوا۔ اور ابھی تھوڑی دیر ہوئی‘ اس کی نسبت تم نے کہا کہ اگر دنیا میں اونچ نیچ‘ خوشی اور رنج یعنی اختلاف حالات امر تقدیری ہے تو خدا کو دانشمند اور منصف اور رحیم ماننا مشکل یا جیسے کوئی انسان خلق عالم کی غرض و غایت کی تفتیش کرنا چاہے اور ہر واقعہ اور ہر موجود کے بارے میں پوچھنے لگے کہ یوں کیوں ہوا۔ یا مثلاً معلوم کرنا چاہے کہ روح کیا چیز ہے اور جسم سے کسی طرح تعلق رکھتی ہے۔ یا علت و معلول میں کیسا علاقہ ہے۔ اس قسم کی ہزاروں باتیں ہیں کہ اس ہستی میں انسان پر منکشف ہونے والی نہیں۔ ان چیزوں کی جستجو انسان کو ضرور نہیں۔ بلکہ جو کچھ ہو رہا ہے‘ نظر استحسان سے دیکھ کر خاموش ہو رہے اور کسی بات کو نہ سمجھ سکے تو اعتراض نہ کرے بلکہ قصور فہم کا معترف ہو۔ علاوہ بریں تم کو البتہ اختیار ہے کہ اس قسم کے خیالات کو دل میں جگہ نہ دو۔ لیکن اس کی ایسی مثال ہو گی کہ نصف النہار کے وقت آفتاب بڑی آب و تاب کے ساتھ چمک رہا ہے اور چمگادڑ اس کو نہیں دیکھنا چاہتی۔ نہ دیکھے مگر آفتاب، کا اس میں کیا زیاں ہے؟“

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم   چشمہ آفتاب راچہ گناہ؟

چمگادڑ کا یہیں تک بس چل سکتا ہے کہ نہ دیکھے‘ نہ یہ کہ دوسروں کو نہ دیکھنے دے یا آفتاب کو تیرہ و تار کر دے۔ یا اس کو معمول کے مطابق نہ نکلنے دے۔ لیکن ایک دن پرسش ہونی ہے کہ آنکھیں تھیں‘ کیوں نہیں دیکھا؟ کان تھے کیوں نہیں سنا؟ عقل تھی‘ کس واسطے نہیں سمجھا؟

ابن الوقت : ابھی ایک بحث طے نہیں ہوئی کہ آپ نے قیامت اور اس کی باز خواست کی دوسری بات نکال کھڑی کی۔

حجتہ الاسلام : بحث مت کرو۔ میں تو مذہب کے بارے میں مناظرے اور مباحثے کا سخت مخالف ہوں۔ اور میں نے شروع ہی میں تم سے کہہ دیا تھا کہ دین حجت اور تکرار سے حاصل ہونے والی چیز نہیں۔ دین دوا ہے‘ بیمار کی۔ تسلی ہے‘ بے قرار کی۔ متاع ہے‘ خریدار کی۔ بشارت ہے‘ امیدوار کی۔ نجات ہے گنہگار کی۔ یعنی عنایت ہے‘ پروردگار کی۔ جو کچھ میں نے تم سے کہا‘ ہرگز ازراہ بحث نہیں کہا بلکہ یہ تقاضائے محبت تم کو اپنی سمجھ کے مطابق ایک تدبیر بتائی کہ اگر اپنے دل میں صدق نیت کے ساتھ غور کرو تو عجب نہیں کہ خلجان باقی نہ رہے۔ اور قیامت اور باز خواست قیامت کی بات نکالنے کی جو تم نے کہی‘ یہ تمام زحمتیں اسی دن کے لیے ہیں۔ اگر قیامت اور قیامت کی بازخواست نہ ہوتی تو کیوں دین ڈھونڈتے اور کس لیے مذہب کی تلاش کرتے؟ بڑی مشکل تو یہی ہے کہ مرنے سے بھی

آدمی کا پنڈ نہیں چھوٹتا۔ یہ زندگی دنیا تو چند روزہ ہے بھلی طرح بھی گزر جائے گی اور بری طرح بھی گزر جائے گی۔ پہاڑ سی زندگی تو وہ ہے۔ جو مرنے سے شروع ہو گی۔ گویا از سر نو پیدا ہوئے‘ اور جس کی اصلاح دین کا مقصود اصلی ہے۔

ابن الوقت : خدا کے ہونے پر تو بھلا آپ نے ایک دلیل قائم کی بھی۔ ہرچند میرے دل کو اس سے تسلی نہیں ہوئی اور میں اس وقت یہی سمجھتا ہوں کہ لوگ ہو رہے ہیں اسباب کے خوگر۔ جدھر آنکھ اٹھا کر دیکھتے ہیں سبب ہی سبب نظر آ رہے ہیں۔ اس وجہ سے انہوں نے ذہن میں تعمیم کر لی ہے کہ ہر واقعے کے لیے سبب ہونا ضروری ہے۔ اور سبب نہیں پاتے تو جھٹ سے خدا کے قائل ہو جاتے ہیں۔ مگر میں سننا چاہتا ہوں کہ قیامت اور بازخواست قیامت کا آپ کے پاس کیا ثبوت ہے؟

حجتہ الاسلام : میں نہیں جانتا کہ خدا کے لیے تم کس طرح کا ثبوت چاہتے ہو۔ اگر یہ مطلب ہے کہ آنکھ سے دیکھو یا ہاتھ سے ٹٹوں تو میں کیا کوئی بھی دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ تم کو خدا کا دیدار کرا دے گا۔ مگر یہ تو فرماؤ کہ ثبوت دلیل سارے اذعان حاصل کرنے کے ذریعے ہیں۔ اذعان مرئیات اور ملموسات ہی میں منحصر ہے؟ ہرگز نہیں۔ ہر شخص اپنے وجدانیات کا اذعان کرتا ہے۔ حالانکہ امور وجدانی نہ مرئی ہیں نہ ملموس۔ اور تعمیم پر جو تم نے اعتراض کیا‘ کیونکر میں سمجھوں کہ حقیقت میں تم کو شک ہے‘ جب کہ میں دیکھتا ہوں کہ تم کہتے کچھ ہو اور کرتے کچھ ہو؟

ابن الوقت : یہ آپ نے کیا بات فرمائی؟

حجتہ الاسلام : میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تم لوگوں پر تو اعتراض کرتے ہو کہ کثرت سے اسباب دیکھتے دیکھتے انہوں نے تعمیم کر لی ہے کہ ہر واقعے کے لیے سبب کا ہونا ضروری ہے۔ یعنی یہ تعمیم تمہارے نزدیک لوگوں کی غلطی ہے‘ مگر میں پوچھتا ہوں کہ اگر تمہاری میز پر ایک پنسل جگہ سے بے جگہ ہو جائے تو تم کو ضرور یقین ہو گا کہ کسی نے میری میز کو چھیڑا۔ اور بے شک تم نوکروں پر خفا ہو گے کہ کیوں میری چیزوں کو ہٹاتے سرکاتے ہو۔ تمہارا نوکروں پر خفا ہونا نتیجہ ہے اس تعمیم کا جو پہلے سے تمہارے ذہن میں مرتکز ہے کہ کوئی شے از قسم جماد اپنے ارادے سے حرکت نہیں کر سکتی تاوقتیکہ کوئی محرک اس کو نہ ہلائے۔ یا مثلاً تم کو اس کا اذعان ہے کہ جس نے بشریت کا جامہ پہنا ہے‘ ایک نہ ایک دن ضرور مرے گا۔ لیکن تم نے کتنے آدمیوں کو مرتے دیکھا اور سنا۔ تم محدود معلومات پر گو وہ فی حد ذاتہا کتنی ہی وافع وسیع کیوں نہ ہو‘ کلیہ قاعدہ قرار دینے کا کیا منصب ہے؟ بلکہ تمہارے اعتراض کا ماحصل تو حقیقت میں یہ ہے کہ کلیہ ٹھہرانا ہی غلطی ہے‘ حالانکہ

ساری دنیا کا اس پر اجماع ہے کہ قوائے عقلی میں سے ایک قوت تمیز ہے اور دنیا کے کاروبار کا مدار اسی پر ہے۔ اور قیامت اور بازخواست قیامت کا ثبوت پوچھو تو پہلے دنیا کے حالات میں غور کرنے کی عادت ڈالو اور خدا کو منظور ہے (میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ کتنے دن میں مخاصمانہ طور پر نہ ہو تو امید ہے کہ جلد) سب سے پہلے دل میں انکساری کی سی کیفیت پیدا ہو گی۔ یعنی تم پر یہ ثابت ہو جائے گا کہ میں اس عظیم الشان کارخانے میں محض ایک ذرہ ناچیز ہوں اور میری ہستی خواب و خیال سے بھی زیادہ بے ثبات ہے۔ تب میں یقین کرتا ہوں کہ تمہارے شکوک خود بخود رفع ہو جائیں گے اور بے دلیل اور بلاثبوت تمہارا دل اندر سے گواہی دینے لگے گا کہ لاریب دنیا و مافیہا سب کا خالق خدا ہے۔ اس کی قدرت کی حدود پایاں نہیں۔ کسی بشر کا مقدور نہیں کہ اس کی صفات عالیہ کا احاطہ کر سکے۔ وہ ہمارا مالک ہے اور اس کو ہر طرح کا استحقاق ہے کہ ہم پر جس طرح چاہے حکمرانی کرے۔ اس وقت تم کو قیامت اور بازخواست قیامت اور دین کی سب ہی باتیں مستبعد معلوم ہوتی ہوں گی لیکن اسی غور سے تمہارا سارا استبعاد جاتا رہے گا۔ کیونکہ دین بے جوڑ باتوں کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ اصول و فروع سب ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ ممکن نہیں کہ آدمی خدا کا اذعان کرے اور پھر دین کی کسی بات میں ذرا بھی چون و چرا کر سکے۔ **کلا لو تعلمون علم الیقین** ہم تو بھائی سید ہیں۔ خدا کو جانتے ہیں اور اس کو شرط انسانیت سمجھتے ہیں۔ دنیا کے حالات پر نظر کرتے ہیں تو عاقبت کا ہونا ایک امر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ دل ہی کچھ اس طرح کا بنایا گیا ہے کہ نیکی اور بدی میں امتیاز کرتا ہے۔ اور خدا جانے کیونکر بیٹھ گئی ہے، کسی طرح یہ بات ذہن سے نہیں نکلتی کہ اس دنیا میں تو نہیں، ہو نہ ہو مرے بعد اس کا نتیجہ ضرور پر نکلے گا۔

ابن الوقت : ہمارے دل میں تو ایک لمحے کو بھی ایسے خیالات نہیں آتے۔

حجتہ الاسلام : آتے نہیں یا تم نہیں آنے دیتے؟ اور آتے کیوں نہیں ہوں گے۔ مگر یوں کہو کہ تم ایسے خیالات کو دل میں ٹھہرنے نہیں دیتے اور سچ ہے، دنیا ہے بھی ایسی ہی جگہ۔ اسی کا فضل دستگیری کرے تو انسان مشاغل دنیوی پر غالب آسکتا ہے۔ اس جہان میں اور اس جہان میں نقد و نسیہ، موجود و موعود، عاجل و آجل، شاہد و غایب، ظاہر و باطن، مجاز و حقیقت کا فرق ہے۔ واقع میں ادھر سے ٹوٹنا چھوٹنا آسان کام نہیں۔ مگر تاہم **مالا یدرک کلہ لایترک کلہ** آدمی اپنی طرف سے کوشش کرے اور اس کی عنایت کا امیدوار ہے۔ میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ دین و مذہب کا اصل اصول طبیعت میں انکساری پیدا کرنا ہے۔ یوں سمجھو کہ آدمی بیمار ہے اور دین اعتدال مزاج۔ ہم کو دین کی ویسی ہی

قدر ہونی چاہیئے جیسی ایک شخص کو جو مرض مہلک میں مبتلا ہے، تندرستی کی ہوتی ہے۔ جو شخص بیماری سے آگاہ ہے، کبھی اپنا علاج آپ کرتا ہے مگر **رای العلیل علیل** اکثر طبیب ہی کی طرف رجوع لاتے ہیں۔ وہ نبض سے، قارورہ سے، مریض کے بیان سے، مرض اور اسباب مرض کو تشخیص کر کے دوا اور پرہیز دونوں بتاتا ہے۔ اور خدا کو منظور ہوتا ہے تو مریض اس تدبیر ظاہر پر عمل کرنے سے آخر کار جانبر ہو جاتا ہے۔ دین کے اعتبار سے ہم تم دونوں بیمار ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ تم اپنے تئیں بیمار نہیں جانتے۔ تمہاری بیماری درجہ روایت کو پہنچ گئی ہے اور تم کو خبر نہیں۔ تم نے علاج کی طرف بالکل توجہ نہیں کی۔ میں بیماری کو سمجھتا ہوں مگر افسوس ہے کہ طبیب نہیں۔ لیکن جس طرح دائم المرض اپنا علاج کرتے کرتے بعض دواؤں کی خاصیتیں پہچاننے لگتا ہے، اتنا کہہ سکتا ہوں کہ تم کو طبیعت میں انکسار پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اور یہ ساز و سامان اور تزک و احتشام اور امارت و حکومت یعنی لوازم رعونت سب سخت درجہ کی بد پرہیزیاں ہیں جن کے رہتے طبیعت میں انکسار کا پیدا ہونا محال نہیں تو مشکل ہونے میں کچھ شک بھی نہیں۔ وہ غور جو میں نے بتایا ہے عمدہ دوا ہے اور مجھ کو اس سے بہت فائدہ ہے۔ مرض گیا تو نہیں لیکن کمی ضرور ہے۔ طبیب کی مجھ کو بھی تلاش ہے مگر میسر نہیں۔ تم سمجھے طبیب سے کیا مراد ہے؟ پیر طریقت۔ طبیعت میں انکسار پیدا کرنے کے لیے یہ لوگ بہت سی تدبیریں کرتے ہیں۔ بعض ریاضات اور مجاہدات سے، بعض اسفار و سیاحت سے، اور کوئی صرف غور و فکر یعنی مراقبات سے۔ یہ طبیعتوں کے اختلاف حالات پر موقوف ہے کہ کونسی تدبیر سود مند واقع ہو گی۔ اور اس کی تعیین قابل اطمینان طبیب یعنی پیر طریقت ہی کر سکتا ہے۔ نزول مصائب کو طبائع کے رام کرنے میں اکثر سریع الاثر دیکھا ہے۔

غرض مصیبت بھی دیندار کے لیے بڑی نعمت ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ بزرگان دین مصیبت کو عزیز رکھتے تھے۔ بعض قلوب بڑے رقیق ہوتے ہیں اور دوسرے کو مبتلائے مصیبت دیکھ کر پگھل جاتے ہیں۔ پیغمبر صاحب نے **علیہ من الصلوٰہ اکملھا** شروع شروع میں انسداد بت پرستی کے لیے زیارت قبور سے منع فرمایا تھا۔ پھر ارشاد ہوا **کنت انھیتکم من زیارت القبور الا فزور وھافانھا الین للقلوب** خشک سالیاں اور وبا اور آفات سماوی مثلاً شدید زلزلہ یا سخت آندھی یا بارش مفرط یا ژالہ زدگی وغیرہ ایسے مواقع پر بھی لوگوں کو انابت الی اللہ ہوتی ہے اور بعض نفوس قدسی ایسے بھی ہیں کہ رہٹ چلتے دیکھا اور انقلاب دنیا کے خیال سے ان کی حالت متغیر ہوئی ؎

کیا وہ دنیا جس میں کوشش ہو نہ دیں کے واسطے

واسطے واں کے بھی کچھ، یا سب یہیں کے واسطے؟

ابن الوقت : آپ تو مجھ کو راہب بنانا چاہتے ہیں۔ آپ کی یہ تعلیم خاص کر آپ کے مذہب اسلام کے بالکل خلاف ہے۔ مرنا مسلم ہے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اسی مختصر زندگی میں ہم خوش بھی رہ سکتے ہیں' خوشی کے بہت سے سامان ہیں اور ہم کو خوشی اور رنج دونوں کا احساس بھی ہے۔ ہمارے احساس اور سامان خوشی دونوں کے جمع ہونے سے اس کے سوائے اور کیا نتیجہ نکل سکتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ہم کو یہ زندگی خوشی میں بسر کرنی چاہئے اور اگر ہم موت کے خوف سے جوگیوں کی طرح بھوکے اور ننگے رہ کر مر جائیں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ دنیا لغو اور لاحاصل ہے۔ کیا حال ہو دنیا کا' اگر سب لوگ اسی خیال کے ہو جائیں؟

حجتہ : میں تم کو دیکھتا ہوں' دنیا میں اس درجہ منہمک ہو کہ تم کو دین سے کچھ لگاؤ ہی نہیں۔ اگر اسلام کی بہت سی سہولتوں میں سے توبہ نہ ہوتی تو میں تم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح کفارہ خود کشی کی صلاح دیتا۔ تمہیں کیا یاد ہو گا' مگر سورہ بقر میں ہے۔ واذ قال موسی لقومه یقوم انکم ظلمتم انفسکم باتحاذکم العجل فتوبو الی بارئکم فاقتلوا انفسکم ○ ذالکم خیر لکم عند بارئکم فرماؤ میری کس بات سے تم نے سمجھا کہ میں رہبانیت کی تعلیم کرتا ہوں؟ اس سے کہ دنیا کے حالات میں غور کر دیا اس سے کہ خدا کی عظمت کو اپنے ذہن میں بٹھاؤ یا اس سے کہ طبیعت میں انکسار پیدا کرو؟

ابن الوقت : کیا ایسے خیالات رکھ کر آدمی دنیا میں خوش بھی رہ سکتا ہے؟ پھر وہ رہبانیت ہوئی یا کیا ہوئی؟

حجتہ : اگر مذاق عقل صحیح ہو تو دین سے بڑھ کر کسی چیز میں خوشی ہو ہی نہیں سکتی۔ دنیا کی فانی عارضی چند روزہ بے ثبات خوشیوں کو خوشی سمجھنا غلطی ہے۔ جیسے ایک لڑکا کھیل میں اپنا وقت ضائع کرنے سے' ایک جواری جوا کھیلنے سے' یا ایک افیونی افیون کے عمل سے یا ایک، نادان بیمار بد پرہیزی سے خوش ہوتا ہے۔ اصلی اور پاکیزہ اور ابدی خوشی تو وہ تھی جس کے لیے پیغمبر صاحب ﷺ اپنے اوپر اس قدر زحمت اٹھاتے کہ راتوں کی نماز میں کھڑے رہنے سے پاؤں سوج سوج جاتے۔ ساری عمر بے چھنے جو کی روکھی روٹی کبھی پیٹ بھر کر کھائی ہی نہیں۔ گرسنگی کی ایذا کو دبانے کے لیے ہمیشہ شکم مبارک پر پتھر باندھے رہتے تھے۔ اکثر راتیں اہل بیت نبوی پر گزر جاتیں کہ چراغ تک نہیں جلتا تھا۔ کھجور کے کھرے بوریے پر لیٹنے سے پہلوؤں میں اور پیٹھ میں بدھیاں پڑ جاتی تھیں۔ اور حدیث وقرة

عینی فی الصلوه میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ میرا جی تو بس نماز ہی میں خوش رہتا ہے۔

ابن الوقت : آپ تو وہی عاقبت کی خوشیوں کو پھر لے دوڑے۔ میرا اعتراض تو یہ ہے کہ دین کے خیالات دنیا کی خوشی کو منغص کر دیتے ہیں۔

حجتہ : تمہارا یہ خیال بالکل غلط ہے۔ دنیا کی خوشی اور دنیا کا رنج دونوں کا مدار اکثر انسان کا اپنا خیال ہے۔ جس قدر دنیا اور دنیا کے تعلقات کی تم قدرو منزلت کرتے ہو اسی قدر تم دنیاوی خوشی اور رنج سے متاثر ہو سکتے ہو۔ دین' جس کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا اور دنیا کے تعلقات سب ہیچ ہیں' دنیا کی خوشیوں کا منغص نہیں بلکہ دنیاوی رنج اور خوشی دونوں انسان کی نظر میں حقیر اور ناچیز کر دیتا ہے۔ جو شخص غصے کو پی جائے' انتقام نہ لے' جھوٹ نہ بولے' غیبت نہ کرے' حریص و طماع نہ ہو' جابرو سخت گیر نہ ہو' ممسک و بخیل نہ' مغرور اور متکبر نہ ہو' نہ کسی سے لڑے' نہ جھگڑے' نہ کسی کا حسد کرے' نہ کسی کو دیکھ کر جلے' عافیت میں شاکر' مصیبت میں صابر' ہنس مکھ' خلیق' بردبار' متحمل' متواضع' منکسر' مستغنی' نفس پر ضابط' قانع' سیر چشم' متوکل' ثواب عافیت کا امیدوار' یعنی خلاصہ یہ ہے کہ دیندار ہو' میں نہیں سمجھتا کہ دنیا میں اس سے بڑھ کر کسی اور کو بھی خوشی ہو سکتی ہے' اگرچہ وہ ہفت اقلیم کا بادشاہ ہی کیوں نہ ہو۔ ایسا شخص آپ بھی خوش اور اس کے عزیز' قریب' دوست' آشنا بھی خوش رضی الله عنهم ورضوا عنه دنیا دار آدمی تب ہی خوش رہ سکتا ہے کہ جس جس چیز کو اس کا جی چاہتا جائے فی الوقت مہیا و میسر ہوتی چلی جائے۔ مگر کسی کو ابتدائے دنیا سے آج تک یہ بات نصیب ہوئی ہے۔؟ یا آئندہ تا بقائے دنیا کسی کو اس بات کے نصیب ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے؟" کسی کو بھی نہیں پس معلوم ہوا کہ دنیا میں کامل خوشی تو نہ ہوئی ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ دوسرا طریقہ خوشی کے حاصل کرنے کا یہ ہے کہ طبیعت کو روکا' خواہشوں کو دبایا' حاجتوں کو کم کیا جائے۔ اور یہی ہے خلاصہ دین کی تعلیم کا' جہاں تک اس کو اصلاح معاش سے تعلق ہے۔

ابن الوقت : ایسے بھی کئی ہوں گے جن کی دنیا بوجہ دینداری آرام سے گزرتی ہو گی۔ مجھے تو دین فی حد ذاتہ مصیبت کا ایک پہاڑ دکھائی دیتا ہے۔ دنیا میں سینکڑوں تو مذہب ہیں' اور ہر مذہب میں ایک سے ایک عقل مند' ایک سے ایک خدا پرست' ایک سے ایک نیک' ایک سے ایک حق پسند' ایک سے ایک راست باز۔ اور پھر اہل مذاہب میں اس طرح کا محاسدہ ہے کہ ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے۔ جس کو دیکھ اپنے ہی تئیں برسر حق جانتا ہے اور تمام دنیا کو گمراہ۔ نہیں معلوم آپ نے مذہب کی طرف سے کیونکر اطمینان کر لیا ہے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ ہر شخص تقلیدی مذہب رکھتا ہے۔ ایک مسلمان اس لیے مسلمان ہے کہ

اتفاق سے وہ مسلمان کے گھر پیدا ہوا ہے۔

تجتہ : دین کے لحاظ سے دیکھا جاتا ہے تو ہم سب ہی الا ماشاء اللہ بڑی تباہ حالت ہے۔ ایسا کونسا بندہ بشر ہے جو مبتلائے گناہ نہیں۔ ہماری ہمت اس طرح کی ضعیف واقع ہوئی ہے کہ ہم اس دام میں بے پھنسے رہ نہیں سکتے۔ ہماری مجال نہیں کہ دنیاوی حکومتوں کے سامنے ذرا بھی سر اٹھا سکیں۔ مگر خدائے برحق‘ قادر مطلق‘ شہنشاہ دو جہاں کی حکومت کے استخفاف کو ہم نے کھیل سمجھ رکھا ہے۔

کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ

غرض یوں تو ہر فرد بشر سے دن رات میں ہزار ہا نالائقیاں سرزد ہوتی ہیں مگر یہ سب سے بڑی نالائقی ہے کہ وہ دین کے پیرائے میں اپنی طبیعت کے پاجی پن کو ظاہر کرے۔ دوسروں کو میں کیا الزام دے سکتا ہوں کہ میں آپ سب سے بدتر کمتر ہوں۔ لیکن ان مذہبی مباحثات کو تو میں نہایت ہی حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ شاید میری رائے غلط ہو۔ مجھ کو تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام کشاکش آپس کی ضد اور تعلی اور سخن پروری اور بے جا تعصب کی وجہ سے ہے۔ خیر اول تو میں شامت نفس سے دینیات میں بہت ہی تھوڑا وقت صرف کر سکتا ہوں‘ اور جس قدر کر سکتا ہوں وہ میرے ہی نفس کے احتساب کو کافی نہیں۔ میں مذہبی مباحث کو ذہن میں آنے ہی نہیں دیتا۔ اگر کبھی ایسا خیال ہوا تو میں یہ کہہ کر ٹال دیا کرتا ہوں۔

تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

اور یہی مضمون ایک جگہ قرآن مجید میں بھی ہے۔ **یا ایھا الذین امنوا علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اھتدیتم الی اللہ مرجعکم جمیعا فینبکم بما کنتم تعملون** دوسروں پر حملہ کرنے کی مصیبت سے تو یوں بچے کہ اپنی کرنی اور اپنی بھرنی۔ وہ جانیں‘ ان کا کام جانے۔ نہ میں کسی کا محتسب‘ نہ دین کا ٹھیکیدار‘ نہ منصب ہدایت پر مامور‘ مجھ کو کیا پڑی کہ دوسروں کے معاملات میں دخل دیتا پھروں۔ رہ گئی اپنے معتقدات کی حمایت‘ ہو میرے معتقدات میرے دل کی تسلی کے لیے کافی ہیں۔ دوسروں کو ان سے تسلی ہو نہ ہو۔ الغرض میری سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ لوگوں میں مذہبی لڑائی کیوں ہوتی ہے اور کیا اس سے مفاد ہے۔ اگر تم میری صلاح لو تو علم کلام کی کتاب کو تو بھول کر بھی آنکھ اٹھا کر مت دیکھنا۔ ایک بڑا نقصان جو طلبگار دین کو اس فن کی کتابوں سے پہنچتا ہے یہ ہے کہ اس کی طبیعت دینیات میں مشکک ہو جاتی ہے۔ جس تربیت کے ساتھ میں نے تم کو دینیات میں غور کرنے کو بتایا‘ اس کا لحاظ بھی حیرت اختلاف سے بچنے کے لیے مفید ہے۔ جب انسان اس بات کو نصب العین بنا لے گا کہ میں فانی اور بے حقیقت ہوں اور

معلوم نہیں کہ بعد مرگ کیا پیش آئے‘ میں نہیں سمجھتا کہ ایسا آدمی ان جھگڑوں کی طرف متوجہ ہونے کے لیے اپنی طبیعت کو حاضر پائے۔ بعض باتوں سے تو وہ یہ ایں خیال اعتراض کرے گا کہ میں ان سے زیادہ اہم کام میں مصروف ہوں۔

کیا جانیں‘ ہم زمانے کو حادث ہے یا قدیم　　کچھ ہو بلا سے اپنی کہ ہیں فانیوں میں ہم

اور بعض کی نسبت شاید وہ یہ خیال کرے کہ اگر میری سمجھ میں نہیں آتا تو میری ہی فہم کا قصور ہے۔ میں نے مناظرے اور مباحثے کی نظر سے تو کبھی کسی مذہب کی تفتیش و تلاش کی نہیں مگر ہاں یوں ہندو‘ عیسائی‘ پارسی‘ یہودی جو مذاہب ہمارے ملک میں مروج ہیں‘ ان کے معتقدات کا حال معلوم ہے۔ غایت مافی الباب یہ کہ بالتفصیل نہ سہی۔ سو جن دلائل سے مجھ کو اس بات کا اذعان ہے کہ خدا ہے‘ ان ہی دلیلوں سے اس کا تیقن ہے کہ کوئی اس کا شریک نہیں۔ ہندوؤں اور پارسیوں سے تو یوں سستے چھوٹے۔ رہ گئے عیسائی اور یہودی تو اس میں شک نہیں کہ ہیں تو اہل کتاب۔ دین بھی ہمارا ان کا ایک۔ اختلاف اگر ہے تو شرائع کا ہے۔ مگر وحدانیت کو انہوں نے بھی ڈگمگا رکھا ہے۔ پس ہم کو تو اسلام کے سوائے اپنا ٹھکانا کہیں نظر نہیں آتا۔ جس بات نے مجھ کو زیادہ تر مذہب اسلام کا گرویدہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ اسلام میں تصنع نہیں۔ پیغمبر ﷺ‘ اسلام نے حد بشریت سے بڑھ چڑھ کر اپنے کسی تقدس یا کسی اختیار یا کسی استحقاق کا دعویٰ کیا ہی نہیں۔ آپ ﷺ پکار پکار کر کہتے تھے۔ **انما بشر مثلکم** پس جب آپ ﷺ سے لوگوں نے معجزات دکھانے کے لیے کہا تو آپ ﷺ نے صاف انکار کیا کہ میرے اختیار کی بات نہیں۔ اکثر لوگوں کا یہی خیال ہے کہ پیغمبر ﷺ کو معجزات دکھانا ضرور ہے تاکہ لوگ اس کا پیغمبر ﷺ ہونا تسلیم کریں۔ لیکن تم سے میں سچ کہتا ہوں‘ میری نظر میں معجزات کی کوئی وقعت نہیں۔ میرے نزدیک پیغمبر ﷺ آپ ہی سب سے بڑا معجزہ ہے۔

آفتاب آمد دلیل آفتاب

مثلاً یوسف علیہ السلام کا وہ مقولہ **معاذ اللہ انہ ربی احسن مثوی** میرے قلب پر اس قدر اثر کرتا ہے کہ اگر یوسف علیہ السلام میری آنکھوں کے سامنے مردے کو جلا کر کھڑا کر دیتے تو مجھ کو ان کی خدمت میں ایسی عقیدت نہ ہوتی۔ اسی طرح اسلام کی ساری باتیں ایسی آسانی کے ساتھ سمجھ میں آتی ہیں کہ خود بخود دل ان کو قبول کر لیتا ہے۔ مثلاً توبہ ظاہر بات ہے کہ اگر ہم سے کوئی قصور عمداً یا خطاً سرزد ہو جائے‘ سوائے افسوس اور ندامت کے ہم اس کی کچھ تلافی کر ہی نہیں سکتے۔ توبہ کو عیسائیوں کے کفارے کے ساتھ مقابلہ کر کے دیکھو تو تم کو اس کی خوبی معلوم ہو۔ پھر اسلام میں یہ کتنی عمدہ بات ہے کہ تکلیف مالا یطاق نہیں۔ یہود اور عیسائیوں کے

احکام عشرہ میں یہ باتیں بھی ہیں کہ کل کے واسطے ذخیرہ مت کرو۔ اگر تمہارے داہنے کلے پر کوئی تھپڑ مارے تو بایاں کلا بھی اس کے سامنے کر دو کہ لے اور مار۔ اپنے جانی دشمن کے لیے اس طرح دعا کرو جس طرح اپنے اکلوتے بیٹے کے حق میں کرتے ہو۔ اس طرح کہ ان ہونی باتوں کی جگہ اسلام تعلیم کرتا ہے۔ **وکلو واشربوا ولا تسرفوا انه لایحب المسرفین قل من حرم زینة الله التی اخرج لعباده والطیبت من الرزق ○ قل هی للذین امنوا فی الحیوة الدنیا خالصة یوم القیمة ○** اب تم آپ دل میں انصاف کر لو کہ دونوں طریقوں میں کون سا ممکن التعمیل ہے اور کون سا ناممکن التعمیل ہے۔ مباحثہ اور مناظرہ تو مجھ کو پسند نہیں' جیسا کہ میں نے تم سے بار بار کہا۔ مگر یوں اپنے طور پر میں نے مذہب کے بارے میں برسوں غور کیا ہے اور اب بھی اکثر غور کرتا رہتا ہوں۔ ان وجوہ سے میں نے اسلام کو حق سمجھا اور جن دلائل سے میرے دل کو تسلی ہوئی ہے' ان کو میں نے اپنے بچوں کے گوش زد کرنے کی غرض سے ایک کتاب میں جمع کر رکھا ہے۔ اگر تم دیکھنا چاہو تو میں بہت خوشی سے تم کو دوں گا۔ یہ مباحث دو چار دس پندرہ ملاقاتوں میں طے ہونے کے نہیں ہیں۔ یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ تمہاری یا دوسروں کی بھی تشفی کر سکتا ہوں۔ تشفی بدون تائید الٰہی ہو ہی نہیں سکتی۔ اور میں پھر ایک بار تم سے کہتا ہوں کہ طلب گار دین کو عموماً اور تم کو خصوصاً نہ کسی کتاب کے دیکھنے کی ضرورت ہے اور نہ کسی سے پوچھنے کی حاجت۔ دنیا میں جدھر کو آنکھ اٹھا کر دیکھو۔ دین کے دفتر کے دفتر کھلے پڑے ہیں۔ بشرطیکہ چشم بصیرت وا ہو۔ تم ہی میں سب کچھ ہے' مگر سوجھتا نہیں۔ **وفی انفسکم افلا تبصرون** ایک بات کہنے کی اور ضرورت باقی ہے۔ اگر تمہارا نفس دین کی کسی بات سے مطمئن ہو جائے تو مجرد اس کے کہ تمہارے دل کو اس بات میں کسی طرح کا خلجان نہیں' نفس کے فریب میں مت آجانا۔ کامل کی شناخت یہ ہے کہ اعمال میں' اقوال میں' اس کا اثر ظاہر ہو۔ دنیا میں کسی ملک' کسی مذہب کا متنفس بھی نہ ہو گا۔ جسے مرنے کا اذعان نہ ہو۔ مگر کتنے ہیں جن کے برتاؤ سے اس اذعان کا ثبوت ہوتا ہے؟ پکی پکی حویلیاں بن رہی ہیں' باغ نصب ہو رہے ہیں۔ معاملات میں ڈیوڑھی ڈیوڑھی دونی دونی عمر طبعی کے وعدے کیے جا رہے ہیں۔ روز مرہ کے استعمال کی جتنی چیزیں ہیں' یہاں تک کہ جوتی اس میں بھی تو پائیداری پر نظر ہے غرض توقعات کی کچھ حد و غایت نہیں اور منہ سے کہنے کو۔

کیا بھروسا ہے زندگانی کا   آدمی بلبلا ہے پانی کا

ہم تو ایسے اذعان کے قائل ہیں نہیں۔ قولاً" اقرار" عملاً" انکار۔ ہاں اذعان ہے ریل کے مسافر کا جس کو ایک خاص مقام پر اترنا ہے۔ اول تو وہ سرے سے اسباب کو ضرورت سے زیادہ

کھوتا پھیلاتا ہی نہیں' اور جو بہ مجبوری نکالتا ہے تو دو دو تین تین اسٹیشن پہلے سے گری پڑی چیز کو جمع کرتا ہے۔ شاید اخیر شب ہے اور نیند کے جھونکے چلے آ رہے ہیں۔ مگر نہیں سوتا۔ ٹکٹ معلوم ہے مگر بہ نظر مزید احتیاط پھر اس کو دیکھ کر سنبھال کر جیب میں رکھتا ہے کہ وقت پر ڈھونڈنا نہ پڑے۔ ابھی ریل کی رفتار مدھم نہیں ہوئی اور بیگ ہاتھ میں لیے مسافروں سے کود پھاند کھڑکی سے آلگا۔ صریحاً" دیکھ رہا ہے کہ اس سرے سے کھڑکیاں کھلتی چلی آ رہی ہیں' لیکن مستعجل ہے اور پکار رہا ہے کہ صاحب ہم بھی اسی اسٹیشن پر اتریں گے۔ کسی ایک غریب مصیبت مند آدمی کی نسبت بھی تم ایسا خیال کر سکتے ہو کہ دفعتاً" اس کو شام تک کی مہلت دی جائے کہ مغرب کے بعد تم کو مثلاً ضرور امریکا چلنا ہو گا اور وہاں تمہارے لیے ہر طرح کی آسائش کا سامان مہیا ہے اور وہ وقت پر چل کھڑا ہوا۔ بھلا پھر سفر موت تو دوسری ہی طرح کا سفر ہے جس کے لیے تو ہم میں سے کوئی بھی تیار نہیں نہ آج نہ کل' نہ برس بعد' نہ دس برس بعد۔

ابن الوقت : بس وہی رہبانیت تو آپ کے کلام کا ترجیع بند ہے کہ دو چار باتیں کیں اور پھر

ماتقیماں   کوئے   دن   داریم

حجتہ الاسلام : میں ڈپٹی کلکٹر سمجھ کر تم سے ملنے نہیں آیا۔ نہ ڈپٹی کلکٹر سمجھ کر تم سے باتیں کر رہا ہوں۔ ساتھ کھیلا ہوں۔ ساتھ پڑھا ہوں' عمر میں' رشتے میں' تم سے بڑا ہوں۔ برا نہ ماننا۔ ارے احمق اتنا تو سمجھ کہ میں نے ایک بات نہیں کہی جس کا حوالہ قرآن سے نہ دیا ہو۔ اور نہ دیا تو اب دینے کو تیار ہوں۔ اور دین کا یہ حال ہے **خیر القرون قرنی ثم الذین یلونهم ثم الذین یلونهم** اگر قرآن کی تعلیم کا نتیجہ رہبانیت ہوتا تو پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام اور صحابہ کرام ؓ اس قدر تھوڑے عرصے میں جس کی نظیر کسی ملک کی تاریخ میں نہیں پائی جاتی' اسلام کی اتنی بڑی وسیع اور زبردست سلطنت قائم نہ کر سکتے۔ اس وقت کے اہل اسلام نہ صرف سلطنت کی وجہ سے اقوام روزگار میں ممتاز تھے بلکہ ان کے زمانے میں جتنے ہنرمند تھے' سب میں اپنے اقران پر سبق لے گئے۔ پس اگر تعلیم قرآن کا نتیجہ رہبانیت ہوتا تو بزرگان دین دنیا کو' اور دنیا بھی ایسی دنیا' اس خوبی اور عمدگی اور شائستگی کے ساتھ سنبھال نہ سکتے۔

ابن الوقت : صاحب' آپ برا مانیے یا بھلا مانیے۔ میری سمجھ میں تو آپ کی دو رخی بات بالکل نہیں آتی۔ ایک طرف تو آپ دنیا سے نفرت دلاتے ہیں اور دوسری طرف رہبانیت کے نام سے بھناتے ہیں۔ جن کو آپ بزرگان دین کہتے ہیں' ان کے دنیاوی عروج کی نسبت تو کوئی کلام نہیں کر سکتا۔ ان کی ملک گیریاں' ان کی فتوحات۔ ان کے انتظام ان کے

ارادے، ان کی شجاعتیں چار دانگ عالم میں مشہور ہیں۔ مگر جس طرح کی دینداری کی آپ
مجھ کو تعلیم کرتے ہیں، کوئی شخص اپنی ارادت سے جو چاہے فرض کرے مگر تاوقتیکہ ان کے
ظاہر حالات میں اس کے شواہد نہ ہوں دوسرا آدمی کیوں ماننے لگا؟

حجتہ : ان ظاہر حالات ہی میں ان کی اسی طرح کی دینداری کے شواہد موجود تھے اور بہ افراط
موجود تھے۔ جناب رسالتمآب ﷺ کے زہد کا حال تو مشتے نمونہ از خروارے میں تم سے
بیان کر چکا ہوں۔ قریب قریب یہی حال اکثر صحابہ رضی اللہ عنہ کا تھا۔ عقل پر کیا پتھر پڑ
گئے؟ واقعات تاریخی بھی سب بھلا ڈالے؟ یا زمان طالب علمی میں تاریخ دانی کا وہ زور و
شور تھا کہ سارا کالج لوہا مانتا تھا۔ ان سے بڑھ کر کوئی زہد کرے گا جنہوں نے پیغمبر ﷺ کی
رفاقت میں وطن چھوڑا، گھر بار چھوڑا، عزیز و اقارب چھوڑے اور پردیس میں پرائی
روٹیوں پر اور وہ بھی غیر مقرر، قناعت اختیار کی؟ ان سے بڑھ کر کوئی کیا زہد کرے گا۔ جو
پیغمبر ﷺ کے ساتھ جان دینے کو موجود، اور صرف موجود ہی نہیں بلکہ خدا کی راہ میں
جان قربان کر دینے کو فوز عظیم سمجھتے تھے؟ ان سے بڑھ کر کیا کوئی زہد کرے گا جن پر پیغمبر
ﷺ نے تجہیز جیش کی ضرورت ظاہر کی اور کسی نے سارا اور کسی نے آدھا مال بے
تامل لا حاضر کیا؟ ان سے بڑھ کر کوئی کیا زہد کرے گا جنہوں نے وقت کے امیر المومنین کہلا
کر اپنے ہاتھوں انٹیں پاتھیں، پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنے، نمود و نمائش کے موقع پر
پیدل چلے، خچروں پر سوار ہوئے؟ ان سے بڑھ کر کوئی کیا زہد کرے گا جنہوں نے "احتسابا"
اپنی حاجتوں پر دوسروں کی حاجتوں کو مقدم رکھا، آپ بھوکے رہے، دوسروں کو کھلایا، آپ
ادھار لیے، دوسروں کو غنی بنایا؟ کہیں تم تجاہل عارفانہ تو نہیں کرتے؟ ورنہ سیر کی کتابوں
میں اس قسم کی ہزاروں باتیں تمہاری نظر سے گزری ہوں گی۔

ابن الوقت : اتنا میں بھی سمجھتا ہوں کہ دنیا میں اگر کوئی مذہب اختیار کرنے کے قابل ہے تو وہ
اسلام ہے۔ اب تو آپ خوش ہوئے؟ اب دنیا کی بات کیجیے۔ ہمارے کلکٹر تک آپ کیونکر
پہنچے؟ کیا کیا باتیں ہوئیں؟

حجتہ الاسلام : ایسی لایعنی باتیں کرنے کی مجھ کو فرصت نہیں۔ اب دوسری ملاقات میں۔

ابن الوقت : مجھ کو آپ سے بہت سی ضروری باتوں میں مشورہ لینا ہے۔

حجتہ الاسلام : ایک بار کہہ تو دیا، دوسری ملاقات میں۔

ابن الوقت : کب؟

حجتہ الاسلام : دیکھو، انشاء اللہ اسی ہفتے کے اندر ہی اندر، جب موقع ملے

ابن الوقت : بھلا اتنا تو فرمائیے کہ کلکٹر صاحب سے میرے ملنے کے بارے میں آپ کی کیا

رائے ہے؟

حجتہ الاسلام : ان سے تو ملنے کا نام ہی نہ لینا۔ یہ بھی خدا جانے کیا وقت تھا کہ وہ اتنا بھی روبہ
راہ ہوئے۔ بلکہ میں تو تم کو یہی صلاح دوں گا کہ یہ وضع تم کو کیا کسی کو بھی سازگار نہیں۔
اس کو قطعاً ترک کر دو۔ اور ابھی کچھ اور خمیازہ بھگتنا باقی ہو تو اختیار ہے۔

فصل ۲۸

ابن الوقت شہر میں پھوپھی کے گھر جا کر حجتہ الاسلام سے تیسری بار ملا اور دونوں میں پہلے پولیٹیکل اور پھر مذہبی گفتگو

صاحب کلکٹر کے ساتھ صفائی کا ہونا تھا کہ ابن الوقت کا بازار گرم ہو چلا۔ نوبل صاحب کے
بعد سے ابن الوقت، اس کا بنگلہ، اس کی کچہری، اس کے عملے، اس کے ذاتی ملازم سبھی چیزیں گویا
کوارنٹین میں تھے۔ یا تو لوگ اس سے مڈبھیڑ کرتے ہوئے ڈرتے تھے یا کام پر مسلط ہونے کی خبر
مشتہر ہوتے ہی بیٹھے تو بے غیرتی کا جامہ پہن اسی شام آدھمکے۔ لیکن ابن الوقت کو ایسا جھکولا نہیں
لگا تھا کہ اس قدر جلد بھول جاتا۔ حجتہ الاسلام کی نصیحت اس کے کانوں میں گونج رہی تھی سو
الگ۔ غرض انگریزیت کے ولولے ابن الوقت کے دل سے سلب تو نہیں ہوئے تھے۔ پر ٹھنڈے
ضرور پڑ گئے تھے۔ وہ لوگوں سے ملا مگر لمبے چوڑے تپاک سے نہیں۔ اس پر بھی جن کو ابن
الوقت کی دعوتوں کی چاٹیں پڑی تھیں، بے صلاح دیے باز نہ رہے کہ مسٹر شارپ کو بڑا بھاری
ڈنر دیا جائے اور اسٹیشن کے تمام انگریزوں کو مدعو کیا جائے۔ حجتہ الاسلام نے ابن الوقت سے ملنے
کا وعدہ کیا ہی تھا اور وہ ہفتے کے اندر ہی اندر ملتے پر ملتے لیکن ابن الوقت کو صبر کہاں تھا۔ ادھر
لوگ اسے ڈنر کے لیے الگ اکسا رہے تھے۔ حجتہ الاسلام تو اس طرح کے سیدھے سادے بے
تکلف سے آدمی تھے مگر ابن الوقت جھوٹوں کو بھی کہلا بھیجے تو بچوں دوڑے چلے آئیں۔ مگر اس کو
بلوانے کی ہمت نہیں پڑی۔ کچھ رشتے یا عمر کی بڑائی کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کی باتوں نے ان کی
وقعت اس کے ذہن میں جما دی تھی۔ آخر تیسرے دن کوئی چار گھڑی رات گئے کبھی کے پڑے
ہوئے ہندوستانی کپڑے یاد آئے۔ جلدی بدل، سوار ہو، جا موجود ہوا۔ تبدیل وضع کے بعد یہ اس
کا پہلا پھیرا تھا۔ کنبے کے لوگوں کو، رشتے داروں کو اور خاص کر اس کی پھوپھی کو جس قدر خوشی

ہوئی بیان سے باہر ہے۔ سب نے رچھ رچھ کر اس سے باتیں کیں۔ ہرچند ان باتوں کا لکھنا خالی از لطف نہ تھا مگر یہ مذکور ہمارے مطلب سے خارج ہے۔ اس نے حجتہ الاسلام سے کہا کہ حضرت لوگوں نے میری جان کھا رکھی ہے کہ صاحب کلکٹر کو ڈنر دو' ڈنر دو۔

حجتہ : اس وضع سے اگر تم صاحب کلکٹر سے ملنا چاہو تو چلو' میں اب ملا لاؤں۔ مگر مجھ سے انہوں نے کھل کر کہہ دیا ہے کہ میں کسی ہندوستانی کو انگریزی لباس پہنے نہیں دیکھنا چاہتا۔ تم ناحق کیوں ان کے سر ہوتے ہو؟

ابن الوقت : پھر صفائی کیا خاک ہوئی؟

حجتہ الاسلام : نہ ہوئی' نہ سہی۔ جو تم سے بن پڑے' وہ کرو۔ تم بھی عجیب طرح کے ناشکرے آدمی ہو۔ تمہارا کام تم کو پھر ملا۔ صاحب کلکٹر نے سچ پوچھو تو ایک معذرت کی کیونکر غلطی کا اقرار کرنا بھی معذرت ہے۔ لوگوں کی نظروں میں جو تمہاری بے وقری ہو رہی تھی' بالکل دھل گئی۔ جہاں تک تم کو صاحب کلکٹر کے ساتھ سرکاری تعلق ہے' بس پوری پوری صفائی ہو گئی۔ رہ گئی یہ بات کہ وہ تمہاری انگریزی وضع کو ناپسند کرتے ہیں تو یہ ان کا ذاتی خیال ہے' اور انہی کا نہیں بلکہ تمام انگریزوں کا کسی کی آنکھ میں مروت زیادہ ہوئی' اس نے منہ سے نہ کہا۔ مگر دل میں وہ بھی ضرور برا مانتا ہو گا۔

ابن الوقت : میں نہیں سمجھتا کہ صاحب کلکٹر یا کسی یورپین کو' اگرچہ وہ وائسرائے ہی کیوں نہ ہو' ہمارے لباس اور طرز تمدن میں دخل دینے کا انصافاً" کیا استحقاق ہے۔ اور آج تو لباس ہے' کل کو رعایا کے مذہب میں مداخلت شروع کریں گے۔ یہ بالکل برٹش گورنمنٹ کے اصول کے خلاف ہے اور دیکھیے گا کہ آخر کار شارپ صاحب بھی اس معاملے میں بڑی زک اٹھائیں گے۔

حجتہ الاسلام : اگر انگریزوں کو اس ملک پر حکمرانی کا استحقاق ہے تو ضرور اس بات کا بھی استحقاق ہے کہ جو چیزیں ضعف حکومت کی طرف منجر ہوں' ان کا انسداد کریں۔ اور تمہارا طرز لباس اور تمدن ان چیزوں میں ہے جن سے ضعف کا اندیشہ ہے۔ کوئی ہندوستانی جو اپنی مانوس قدیمی وضع چھوڑ کر تمہاری انگریزی وضع اختیار کرے گا' اس کی غرض سوائے اس کے اور کیا ہو گی کہ وہ حکام وقت کے ساتھ برابری کا دعویٰ رکھتا ہے۔ اور حاکم و محکوم میں مساوات کا ہونا ضعف حکومت نہیں تو اور کیا ہے؟

ابن الوقت : تو آپ کے نزدیک رعایا کی آزادی جس پر برٹش گورنمنٹ کو بڑا فخر اور ناز ہے' صرف دھوکا ہے۔

حجتہ : رعایا کی آزادی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انگریز حکومت سے دست کش ہو جائیں۔ اور نہ کوئی معقول پسند آدمی انگریزوں سے اس قسم کی توقع رکھ سکتا ہے۔

ابن الوقت : یہ آپ ان لوگوں کے خیالات بیان کر رہے ہیں جو ہندوستان میں بر سر حکومت ہیں۔ مگر ولایت والوں کا خیال یہ نہیں ہے۔ وہ ہندوستان کی اور انگلستان کی رعایا میں سرمو فرق نہیں کرتے۔ آپ شاید یہ سمجھتے ہوں گے کہ یہیں کے انگریز جو چاہتے ہیں سو کرتے ہیں۔ وہ زمانہ گیا شارپ صاحب کیا میری ایک متنفس کی وضع کے پیچھے پڑے ہیں۔ اب تو ان کو بہت کچھ خلاف مزاج دیکھنا اور سننا ہو گا۔ وہ وقت قریب آلگا ہے کہ اس ملک میں سول سروس کا امتحان ہوا کرے گا۔ کسی ملکی خدمت کے لیے انگریزوں کی تخصیص باقی نہ رہے گی' جیسے کہ اب ہے۔ وائسرائے کی کونسل میں برابر کے ہندوستانی ہوں گے اور کوئی قانون بدون ان کے صلاح و مشورہ کے جاری نہ ہو سکے گا۔ غرض انتظام ملک میں ہندوستانی ویسے ہی دخیل ہوں گے' جیسے انگلستان میں وہاں کی رعایا اور جب بادشاہ ایک ہے' کوئی سبب معلوم نہیں ہوتا کہ دونوں ملکوں کی رعیت کے ساتھ ایک طرح کا برتاؤ نہ کیا جائے۔

حجتہ : اللہ! اس خبط کا کیا ٹھکانا ہے' کہیں تم نے متوالی کو دوں تو نہیں کھائی؟ ایاز' قدر خود شناس۔ انگلستان کی رعایا کی سی قابلیت بہم پہنچائی ہوتی' ملک پر اپنا اعتبار ثابت کیا ہوتا تو ایسی بلند پروازیاں تم کو پھبتیں بھی۔ حلوا خوردن روئے باید۔ نالیاقتی کا تو یہ حال ہے کہ نہ ہمت ہے' نہ جرات۔ نہ اتفاق ہے' نہ تہذیب ہے۔ نہ شائستگی ہے' نہ سچائی کی تلاش ہے۔ نہ معلوت ہے' نہ معلومات بہم پہنچانے کا شوق ہے۔ نہ ہنر ہے' نہ تجارت ہے۔ نہ دولت ہے' نہ ایجاد نہ صناعت ہے۔ صلاحیت تو اگر سچ پوچھو خانہ داری کی بھی نہیں اور حوصلے دیکھو ملک گیری کے اور ہندوستانیوں پر کیا موقوف ہے' میں تو سمجھتا ہوں کہ تمام ایشیاء کی آب و ہوا میں کچھ اس طرح کی روایت آگئی ہے کہ اس سرزمین میں کوئی شخص جس کو ضابط اور منتظم سمجھا جائے' پیدا ہوتا ہی نہیں۔ بلکہ جب میں حج سے واپس آکر بمبئی میں اترا اور یہاں کے غدر کے تفصیلی حالات سنے تو بے ساختہ میرے منہ سے نکلا کہ ناحق انگریزوں نے اتنی زحمت اٹھائی۔ جیسے لوگوں نے بغاوت کی تھی' زیادہ نہیں تو ایک ہی ضلع تھوڑے دنوں میں چھوڑ بیٹھے ہوتے کہ ہماری عملداری سے ناخوش ہو تو خود کر کے دکھاؤ۔ تیقن ہے کہ ایک برس پورا گزرنے نہ پاتا کہ لوگ بدعملی سے عاجز آکر بہ منت انگریزوں کو مناتے جاتے اور کبھی بھول کر بغاوت کا نام نہ لیتے۔

میں خیال کرتا ہوں تو انگریزی عملداری تمہاری ہی نہیں بلکہ ہم لوگوں کی بھی زندگی ہو گئی ہے' چاقو' مقراض' سوئی' تاگا' دیا سلائی' انواع و اقسام کے کپڑے' غرض ضرورت اور آسائش کی

اکثر چیزیں انگریزی ہی انگریزی دکھائی دیتی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انگریزوں سے محض بے تعلقی ہو جائے تو ہمارا کیا حال ہو۔ بھلا' خیر' فرض کیا کہ خدا کے فضل سے گورنری تک کے لیے بھی بہت سے بنگالی یا دوسرے انگریزی خواں ملیں گے بلکہ دور کیوں جائیں' تم ہی ماشاء اللہ کس بات میں کم ہو۔ مگر یہ تو فرمائیے ضرورت کی چیزوں کا بنانے' بہم پہنچانے والا بھی کوئی ہے؟ انگریزی تعلیم کے فیضان سے گورنر' کونسلر' لفٹیننٹ گورنر' بورڈ کے ممبر' کمشنر' کلکٹر' جسٹس' مجسٹریٹ' اس قسم کے لوگ تو ہمارے بنگالے میں بہتیرے نکل پڑیں گے۔ مگر کوئی ایسا بھی ہوا کہ انگریزوں کی طرح کلیں نکالتا یا زیادہ نہ سہی تو انہی کے کل پرزوں کو جما بٹھا کر ان سے کام لیتا۔ غیرت ہو تو چلو بھر پانی میں ڈوب مریں کہ ہمارے ملک کی پیداوار ولایت جائے اور وہاں سے بن سنور کر پھر آئے' اور ہمارے ہی ہاتھوں چوگنے چوگنے داموں پر بکے۔ ہندوستان خطہ معدنیات' نباتات' حیوانات' غرض جملہ اعتبارات سے تمام روئے زمین کا لب لباب ہے مگر ہم کو ان چیزوں سے فائدہ اٹھانے کا سلیقہ نہیں تو ہماری طرف سے ہو تو بلا سے اور نہ ہو تو بلا سے۔

سب کچھ کھو کھوا کر معاش کے دو ذریعے رہ گئے تھے۔ کاشتکاری اور تجارت سو کاشتکاری کی برکتیں روز بروز سلب ہوتی چلی جاتی ہیں۔ زمین کو مہلت تو ملتی نہیں' اس کی قوت گھٹ گئی۔ ہم کو اس کا بھید معلوم نہیں کہ زمین میں سے کیا چیز نکل گئی ہے اور کیونکر اس کی تلافی کی جاتی ہے۔ پس اگلے وقتوں کی سی الله تللے کی پیداوار ہو تو کہاں سے ہو تمہاری دلی کے سواد میں رائے پتھورا کا اب سے دو ہزار برس پہلے کا بنا ہوا محل کھڑا ہے۔ پتھروں پر ان وقتوں کے ہل' ان وقتوں کے چھکڑے بنے ہیں۔ مدت ہوئی جب میں نے اس کو اول بار دیکھا تو خیال آیا' اللہ اکبر! زمانے میں اتنے انقلاب آئے' کتنی عملداریاں بدل گئیں۔ قومیں بدل گئیں' غرض دنیا بدل گئی اور نہ بدلے تو ہل اور چھکڑے کہ جیسے تب تھے' بجنسہ ویسے ہی اب بھی موجود ہیں۔ کاشتکاری ایسا تو ضروری پیشہ کہ سب کا مدار رزق اور ہمہ وقت لاکھوں آدمی اس میں مصروف۔ یہ خدا کا حکم نہیں تو کیا ہے کہ کسی کا ذہن اس طرف منتقل نہیں ہوتا کہ لاؤ' اس میں کوئی کام کی بات نکالیں۔ ایک کاشتکار ولایت کے ہیں کہ مرضی کے مطابق نہ آب و ہوا ہے نہ موسم ہے' نہ زمین ہے' مگر کاشتکاری میں اس قدر ترقی کی ہے کہ ہمارے یہاں رو کر' جھینک کر' بیگھے میں پیدا ہو دس سیر تو ان کے یہاں پیدا ہو من بھر۔ پھر بات تھی بکار آمد۔ ایسے پیچھے لپٹے ایسے پیچھے لپٹے کہ آخر کار سوچتے سوچتے گویا پیداوار کو اپنے بس میں کر لیا۔ سینکڑوں تو کلیں بنا ڈالیں کہ کھیتی کے جتنے کام ہیں انہی کلوں سے پڑے ہو رہے ہیں۔ وقت بچا' ہاتھ پاؤں کی محنت بچی اور کام دیکھو تو دوگنا چوگنا بھی نہیں' ہزار گنا۔ دوسری باتوں کا کیا مذکور ہے' پیداوار کی ذات اور جانوروں کی نسلیں تک پلٹ گئیں۔

معاش کا دوسرا ذریعہ تجارت ہے۔ سو اس کا واقعی حال یہ ہے کہ گودا تو اہل یورپ چٹ کر جاتے ہیں' رہ گئیں خالی ہڈیاں تو ان کو چاہے میمن' اور بوہرے پڑے نچوڑا کریں یا پنجابی یا مارواڑی' یا میں چاہوں تو میں' اور تم چاہو تو تم۔ خلاصہ یہ ہے کہ عقل معاش کے اعتبار سے اہل یورپ کے مقابلے میں ہمارے ملک کے لوگ ایسے ہی کودن اور کندہ ناتراش ہیں جیسے ہمارے مقابلے میں ایک بھیل یا کوئی اور جنگلی وحشی آدمی۔ ہم میں اور انگلستان میں بڑی وجہ فارق تو یہ ہے اس کے علاوہ ہم انگریزوں کے ہم قوم نہیں' ہم مذہب نہیں' ہم وطن نہیں۔ انہوں نے ہم کو تلوار کے زور سے مطیع کیا ہے۔ جیسے کبھی ہمارے بزرگوں نے ہندوؤں پر اپنی سلطنت بٹھائی تھی۔ انگریز ہماری طرف سے کبھی مطمئن نہیں ہو سکتے اور احتیاط بھی اس کی مقتضی ہے الحزم سوء الظن تم کو کسی زمانے میں تاریخ دانی کا بڑا دعویٰ تھا۔ خیال کرو کہ ہم لوگوں نے ہندوؤں پر کس قدر اعتبار کیا تھا۔ کہیں سینکڑوں برس کی سلطنت کے بعد۔ وہ بھی اس وقت کی بدقسمتی جو سر پر سوار ہوئی تو ہمارے بزرگ یہیں رہ پڑے اور ہندوؤں سے اختلاط کر کے انہی کی طرح آرام طلب اور مبتلائے اوہام ہو گئے' اور آخر کار سلطنت کھو بیٹھے غرض کہیں سینکڑوں برس کی سلطنت کے بعد ہندوؤں کو یہ بات نصیب ہوئی تھی کہ مسلمان بادشاہوں کے دربار تک پہنچے اور اعتبار کی خدمتوں پر مامور ہونے لگے۔ انگریزوں کو اس ملک میں سلطنت کرتے ہوئے ابھی کتنے دن ہوئے؟ اور کچھ ذرا ظہور اعتبار پیدا ہو چلا تھا' وہ اس کمبخت ۵۷ء کے غدر نے ملیا میٹ کر دیا۔ اب کم از کم سو برس اور اطمینان سے گزریں تب بات سو بات۔ لیکن ایک بغاوت تو خدا خدا کر کے فرو ہوئی' تم نے ابھی سے دوسری بغاوت کی چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔

ابن الوقت : ایک نہ شد دو شد۔ گورنمنٹ سے اپنے حقوق کا مطالبہ بھی آپ کے نزدیک داخل بغاوت ہے۔ بس غنیمت ہوا کہ میری آپ بغاوت کے محکمے کے افسر نہیں ہوئے۔

حجتہ : قوم مفتوحہ کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں؟

ابن الوقت : حقوق کیوں نہیں ہوتے؟ یہ بات دوسری ہے کہ کوئی وحشی اور ظالم حکومت ان کو تسلیم نہ کرے۔ لیکن برٹش گورنمنٹ تو بڑی مہذب اور عادل گورنمنٹ ہے۔ اس سے ہر ایک طرح کا دعویٰ ہے۔

حجتہ : اچھا اگر دعویٰ ہے تو اس کا فیصلہ کون کرے گا؟

ابن الوقت : وہی گورنمنٹ اور اس کے انصاف پر تو ساری لڑائی ہے۔

حجتہ : بس بس' یہی تو میں کہتا ہوں کہ گورنمنٹ کے انصاف پر اعتماد کرتے ہو اور اس کو عادل مانتے ہو تو اس پر پورا اعتماد کرو۔ عادل گورنمنٹ رعایا کی حاجتوں اور ضرورتوں سے غافل نہیں ہو سکتی۔ گورنمنٹ کے تمام عہدیدار گورنر جنرل سے لے کر ایک اسسٹنٹ تک علی

قدر مراتب سب رعایا کی خوشنودی' رعایا کی آسائش میں لگے ہوئے ہیں۔

ابن الوقت : تو اگر ہم نے اپنی ضرورتوں کو ظاہر کر دیا تو کیا غضب ہو گیا؟ یہ من وجہ سرکار کی اعانت ہوئی یا بغاوت؟

حجتہ : ظاہر کر دیا؟ ذرا بنگالے کے دیسی اخباروں کو دیکھو تو معلوم ہو کہ رعیت ہونے کی حیثیت سے اپنی ضرورتوں کو گورنمنٹ پر ظاہر کر رہے ہیں یا بے ہودگی اور بے تمیزی کے ساتھ گورنمنٹ سے بھٹیاروں کی طرح لڑائی لڑتے ہیں۔ سنو صاحب! بات صاف تو یہ ہے کہ رعائے انگلستان کے سے حقوق چاہو تو یہ طلب محال ہے۔ نہ ان کی طرح ہم رعایا ہیں اور نہ ویسے حقوق ہم کو مل سکتے ہیں۔ اول تو ہم کو کسی حق کی طلب گاری کی ضرورت نہیں طلب گاری تو ہم اس صورت میں کریں کہ گورنمنٹ کو غافل اور بے انصاف سمجھیں۔ اور اهل الغرض مجنون ایسی ہی بے صبری ہے تو بیٹا بن کر سب کوئی کھاتا ہے' باپ بن کر کسی نے نہیں کھایا۔ یہ سچ ہے کہ حکام انگریزی خود گورنمنٹ نہیں ہیں بلکہ گورنمنٹ کے ملازم ہیں' مگر گورنمنٹ انہی کی آنکھوں سے دیکھتی ہے اور انہی کے کانوں سے سنتی ہے۔ ان کے دلوں میں ہماری طرف سے کئی طرح کے محاسدے اور سوء ظن کا پیدا ہونا ہمارے حق میں مضر ہے۔ لوگ فی زعمہم ملک کے مفاد میں کوشش کرتے ہیں اور میرے نزدیک چلتی گاڑی میں روڑے اٹکا رہے ہیں۔ بن مانگے موتی ملیں اور مانگے ملے نہ بھیک۔

میں جدھر خیال دوڑاتا ہوں' تقدیر سامنے آکھڑی ہوتی ہے۔ ہم میں بعض آدمی زمانہ حال کی ضرورتوں کے مطابق تعلیم پا کر کچھ لیاقت حاصل کرتے ہیں۔ ان کی مت یوں ماری جاتی ہے کہ مدرسے سے نکلے اور ان کو نوکری نہ ملی۔ وہی گورنمنٹ سے ناراض' منہ پھلائے ہوئے' روٹھے ہوئے' بڑبڑاتے پھرتے ہیں۔ اور ایک عذاب ہیں اپنے حق میں سوسائٹی کے حق میں اور گورنمنٹ کے حق میں۔ ان ہی کو اگر خدا توفیق دے اور وہ تعلیم سے فراغ حاصل کرنے کے بعد معاش کے لیے گورنمنٹ کے آگے ہاتھ نہ پھیلائیں' امیدواری کے دھکے نہ کھائیں اور نوکری کے علاوہ دوسرے ذریعوں سے' متوکلین علی اللہ معاش کی کوشش کریں تو معاش کے لیے کتنے تو نئے ذریعے پیدا ہو جائیں۔ اور جو ذریعے بالفعل مروج ہیں' ان کی لیاقتوں کے انضمام سے ان میں بہت کچھ رونق ہو۔ باتیں جتنی چاہو بناؤ۔ جس کے جی میں آئے ریفارمر بن لے۔ قومی خیر خواہی کا مدعی ہو۔ ملکی خیر خواہی کا حیلہ کرے۔ اصل مطلب ہے نوکری۔ اور فرض کیا کہ سرکار نے اس غل و شور کے فرو کرنے کے لیے نوکری کو عام بھی کر دیا' دہن سگ بہ لقمہ دوختہ بہ' مگر اس کا نتیجہ کیا ہو گا؟ یہی نا ہزار دو ہزار یا مثلاً دس ہزار آدمیوں کی روٹی کا سہارا نکل آیا۔ لیکن کیا

اتنی بات سے ملک میں فلاح ہوتی پڑی ہے؟ استغفر اللہ اونٹ کے منہ میں زیرا۔

اگر فی الواقع تمہارے دل میں قوم کی سچی خیر خواہی ہے تو سرکار کا ناحق پیچھا لیا ہے۔ قوم ہی کو کیوں نہیں درست کرتے۔ یورپ میں جو آج تمام روئے زمین کی دولت پھٹ پڑی ہے کہ طوفان نوح علیہ السلام کی طرح اوپر سے بھی برس رہی ہے۔ اور زمین سے بھی ابل رہی ہے' نوکری تو نوکری سلطنت کو بھی اس میں دخل نہیں۔ ماشاء اللہ چشم بدور' ایسے ایسے ہزاروں سوداگر ہیں جو تمول کے اعتبار سے ایسی دیسی سلطنتوں کو بھی کچھ مال نہیں سمجھتے۔ خیال کرنے کی بات ہے۔ مثلاً یہی ایک ہمارے ملک کی ریل ہے کہ روئے زمین پر کوئی ایسی سلطنت دکھائی نہیں دیتی جو اتنے بڑے مصارف کی متحمل ہو سکے۔ اور یہ انگلستان کی رعایا کا ادنیٰ سا کام ہے پس اگر حقیقت میں ملک کی بہبودی مدنظر ہے تو اس کا یہ راستہ نہیں ہے جو تم نے یا اس زمانے کے تعلیم یافتہ لوگوں نے اختیار کیا ہے۔ اس کا راستہ ہے تو میرے نزدیک یہ ہے کہ پہلے قوم کے خیالات کی اصلاح کرو۔ یہ بات کسی طرح ان کے ذہن میں بیٹھ جانی چاہیے کہ ہماری زمین سونے کی سرزمین ہے۔ مگر ہم میں سے کسی کو کیمیا کا وہ نسخہ معلوم نہیں جس سے مٹی کو سونا بنایا جاتا ہے۔ وہ نسخہ خدا نے اہل یورپ کو بتایا ہے اور ہم بھی ان سے سیکھیں اور ہمالیہ اور بندھیا چل اور اردلی پربت اور گھاٹ جتنے پہاڑ ہیں' سب کو سونے کا بنا ڈالیں۔

ہم بھی اہل یورپ کی طرح کی مخلوق ہیں۔ جن تدبیروں سے انہوں نے اپنی حالت کو درست کر لیا ہے' انہی کی دیکھا دیکھی' ویسی ہی تدبیریں عمل میں لا کر' ہم بھی کرارے ہو جائیں۔ کیوں گورنمنٹ کے دست نگر ہوں؟ کس لیے سرکار کی خوشامد کریں؟ کاہے کو حکام کے پاس حاجت لے جائیں؟ کرنے پر آئیں تو ہم بھی سب کچھ کر سکتے ہیں۔ اہل یورپ خدا کی رحمتوں اور زمین کی برکتوں کے ٹھیکیدار نہیں۔ مگر یوں کہو کہ ہم سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہاں' گورنمنٹ میں ہزاروں کیڑے ڈالنے کو موجود۔ وہ گورنمنٹ ہی کچھ ایسی متحمل مزاج مل گئی ہے کہ جلی کٹی ایک کان سنی' دوسرے کان سے اڑا دی۔ جیسے ایک پہاڑ کہ آندھیاں چل رہی ہیں اور وہ جس شان سے کھڑا تھا' اسی شان سے کھڑا ہے ۱۸۵۷ء کا غدر کیا کوئی ملکی بات تھی؟ مگر بڑے لوگوں کے بڑے ظرف۔ پہلے تو بہ تقاضائے سیاست باغیوں کا خوب ہی سر کچلا اور جب دیکھا کہ بغاوت مستاصل ہو چکی' امن کی منادی پھیر دی۔ جزاک اللہ۔

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند
بر عفو انتقام تو صد آفریں کنند

تعلیم' ڈاک و ریل' تار' قاعدے قانون' پولیس' ایک چیز ہو تو ان کا نام بھی لیا جائے' میں تو

جس جس پہلو سے دیکھتا ہوں' انگریزی عملداری رحمت الٰہی معلوم ہوتی ہے۔ اور جب سے فارس اور روم کے انتظام کے نمونے دیکھ کر آیا ہوں' میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ انگریزی عملداری کو دنیا کی بہشت سمجھتا ہوں۔ روم اور فارس کی عملداری تو خیر دور ہے' اسی ہندوستان میں کسی نواب یا ہندو راجا کی عملداری میں جا کر رہو تو قدر عافیت معلوم ہو۔ پھر بھی ان ریاستوں میں انگریزوں کی نگرانی اور سرپرستی کی وجہ سے بڑا امن ہے۔ میں نہیں کہتا کہ انگریزی انتظام میں نقص نہیں ہیں۔ ہیں اور ہونے چاہئیں۔ کیونکہ انگریز بھی بشر ہیں۔ پھر سلطنت کے انتظام' اور سلطنت بھی ہندوستان کی سلطنت' بڑے پیچیدہ اور نازک کام ہیں۔ ملک کی وسعت کو دیکھو' پر اس پر نظر کرو کہ کیسے کیسے مختلف الطبائع' مختلف العقائد' مختلف الحالات لوگ اس ملک میں بستے ہیں۔ اور اس پر اجنبی محض لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنا ہے۔ ایسی صورت میں انتظام میں نقص کیا' نقصانات کا ہونا کچھ تعجب کی بات نہیں۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ حکام وقت کی نیت بخیر ہے۔ ہمہ تن اصلاح حال رعایا میں مصروف ہیں۔ ہم جو چلتے ہوئے بیل کے آر ماریں تو اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دولتی کھانے کو جی چاہتا ہے۔

ابن الوقت : آپ نے تو میرے سارے منصوبے ہی غلط کر دیے۔

حجتہ : میں نے غلط کر دیے یا وہ تھے ہی غلط؟ میں خوب جانتا ہوں کہ نیت تمہاری بھی خدا ناخواستہ غلط نہیں تھی۔ تم نے خیال کیا اور ٹھیک خیال کیا۔ اور جس کو خدا نے ذرا سی عقل دی' خیال کر سکتا ہے کہ انگریزی عملداری میں ہم مسلمانوں کے ساتھ ہرچند کسی طرح کی رعایت نہیں کی جاتی (یہ بات دوسری ہے کہ ہماری حالت خاص رعایت کی مستحق ہے بھی یا نہیں) مگر سرکار ہمارے ساتھ کسی طرح کی ضد اور مخالفت بھی تو نہیں کرتی۔ جو حال اور رعایا کا وہ ہمارا۔ مگر مسلمانوں میں خستہ حالی' مفلسی اور نکبت یوماً فیوماً" بڑھتی چلی جاتی ہے۔ پھر تم نے خیال کیا کہ مسلمان اکثر بلکہ قریب کل نوکری پیشہ ہیں۔ کچھ آج سے نہیں بلکہ جب گھر کی سلطنت تھی تب بھی ان کا یہی حال تھا۔ اب نوکری سے بھی ان کو دوسری قوموں نے گویا بے دخل کر دیا۔ الا ماشاء اللہ تم نے سب کی تفتیش کی اور ٹھیک سمجھا کہ نوکریوں میں سرکار انگریزی دانی کی قید لگاتی چلی جاتی ہے' اور اگرچہ مسلمانوں کو انگریزوں سے مذہباً" مغایرت نہیں ہونی چاہیئے کیونکہ انگریز بھی اہل کتاب ہیں اور ان کے ساتھ مناکحت اور مواکلت کی صاف اجازت قرآن میں موجود ہے۔ وطعام الذین اوتو الکتب حل لکم وطعامکم حل لهم والمحصنت من المومنات والمحصنات من الذین اوتو الکتب من قبلکم اذا آتیتمو هن اجور هن محصنین غیر مسافحین ولا متخذی

اخذان لیکن انگریز چونکہ اجنبی محض ہیں' ان کے ساتھ ہند کے مسلمانوں کو اختلاط نہیں رہا۔ وہ انگریزوں کی تمام چیزوں سے حتی کہ زبان انگریزی سے بھی پرہیز کرتے ہیں۔ معاش کے لیے وہی ایک نوکری کا دروازہ تھا' سو تیغہ ہو کر اس میں ایک ذرا سا موکھا رہ گیا۔ یہاں تک مجھ کو تمہارے ساتھ بالکل اتفاق ہے۔ اس کے بعد کی تمہاری ساری کاروائی غلط ہے۔ اول' سرے سے تم نے یہی سمجھا کہ سرکاری نوکروں سے مسلمانوں میں خوشحالی آجائے گی۔ اول تو سرکار کے انتظام ایسی جزرسی اور کفایت شعاری کے ساتھ ہیں کہ جہاں ایک روپیہ کا خرچ ہے' وہاں سرکار آٹھ آنے ہی میں کام نکالنا چاہتی ہے۔ وہ بھی بڑے مضائقے کے ساتھ۔ اس کا ضروری نتیجہ یہ ہے کہ نوکریاں کم اور تنخواہیں تھوڑی۔ اور اس پر ایک دنیا ہے کہ ستو باندھ کر نوکریوں کے پیچھے پڑی ہے۔ بنیے' بقال' ٹھٹھیرے' کسیرے' کنجڑے' بھٹیارے' انگریزوں کے شاگرد پیشہ' یہاں تک کہ سائیس' گراسکٹ جن کی ہفتاد پشت میں کوئی اہل قلم ہوا ہی نہیں' نوکری کی دھن میں سب کے سب مدرسوں میں پڑھ رہے ہیں۔ پس نوکریوں سے کیا فلاح ہوئی ہے؟ پھر دوسری غلطی تم سے یہ ہوئی کہ مسلمانوں اور انگریزوں میں اختلاط پیدا کرنے کے لیے تم نے انگریزی وضع اختیار کی اور تمہاری دیکھا دیکھی اور بہتیروں نے اور تمہاری غرض بھی یہی تھی۔ سمجھے کچھ' اور ہو گیا کچھ۔ ہندوستانیوں میں جیسی کچھ تمہاری رسوائی ہوئی سو ہوئی' بڑی مشکل یہ پیش آئی کہ انگریز رہے سہے بتے سے اکھڑ گئے۔ گئے تھے نماز معاف کرانے' الٹے روزے گلے پڑے۔ ازیں سو رانده وازاں سو درمانده۔ یہ تو چند دنیاوی قباحتیں ہیں جو تمہاری سو تدبیر پر متفرع ہیں۔ رہا دین' اس کا تم نے اور تمہارے اتباع نے مل کر ایسا استخفاف کیا کہ بارِیش بابا ہم بازی کی بھی کچھ حقیقت باقی نہ رہی۔ ایک ایک لونڈا جس کو دین سے مس نہیں' دین کی اس کے ذہن میں قدر نہیں' وقعت نہیں' دین کی باتوں میں غور کرنے کی اس کی عمر نہیں' حالت نہیں' دین کی اس کو طلب نہیں' تلاش نہیں' ناواقف' بےخبر' برخود غلط' چلا اسلام کا مجدد اور ریفارمر بننے اور لگا اصول میں رائے زنی کرنے۔ امور دین میں مساہلت تو سبھی سے ہوتی ہے لیکن جو دین کا ادب رکھتے ہیں' اپنے تساہل پر نادم اور قصور کے معترف ہوتے ہیں۔

لیکن اب اس زمانے میں لوگوں کے خیالات دین کی طرف سے کچھ ایسے برگشتہ ہوئے ہیں۔ کہ دینیات میں مساہلت کرتے ہیں۔ ہکڑی کے ساتھ چوری اور سرزوری آپ کرتے ہیں سو کرتے ہیں' قومی خیر خواہ اور ریفارمر بن کر دوسروں کی بات مارتے ہیں سو الگ۔ اور اتنا نہیں سمجھتے کہ جب قوم کا مذہب نہ رہا' لباس نہ رہا' طرز تمدن نہ رہا' علم نہ رہا' زبان نہ رہی تو امتیاز

قومی بھی گیا گزرا ہوا۔ پھر کیسے رفارم اور کس کی خیر خواہی؟ اگر ہم ایک گھر کی رفارم کرنا چاہیں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کو جڑ بنیاد سے کھود کر پھینک دیں اور از سرنو دوسرا مکان بنا کر کھڑا کریں۔ اسی طرح مسلمانوں کی رفارم کو تو اس وقت رفارم کہا جائے گا کہ مسلمان مسلمان رہیں۔ یعنی باپ دادا کے مذہب کے، وضع کے پابند ہوں۔ دوسرے سے الگ پہچان پڑیں کہ مسلمان ہیں۔ اور پھر ان کے دلوں میں زمانہ حال کے مطابق ترقی کی گدگدی پیدا کی جائے۔

ابن الوقت : آخر آپ کے نزدیک اس کی اور کیا تدبیر ہے؟

حجتہ الاسلام : اس کی جو تدبیر ہے وہ خود بخود ہو رہی ہے۔ اب مسلمانوں میں اگلی سی وحشت کا کہیں بھی پتا نہیں۔

ابن الوقت : یہ ہماری ہی کوشش کا نتیجہ ہے۔

حجتہ الاسلام : خیر، تم یوں ہی سمجھو۔ لیکن اگر ایک طرف تم نے مسلمانوں کی وحشت کو دور کیا تو دوسری طرف ان کو بے دین کیا۔ یہ کیا چنیدی بازی ہے کہ دفع وحشت کی داد چاہو اور بے دینی کا الزام اپنے اوپر نہ آنے دو۔ میٹھا میٹھا ہپ ہپ، کڑوا کڑوا تھو تھو۔

ابن الوقت : اجی حضرت، وہ بولے بھالے زمانے گئے کہ لوگ جلدی سے مذہبی ڈھکوسلوں کا یقین کر لیا کرتے تھے۔ اب عقل کا دور دورہ ہے۔ شاید آپ کو بھی اس سے انکار نہ ہو گا کہ آج کل کے لڑکے اگلے وقتوں کے بڈھوں کو چٹکیوں میں اڑاتے ہیں۔ اور عقل کے آگے تو مذہب کی دال گلنا ذرا مشکل ہی ہے۔ فلاسفہ یونان جن کی عقل کا لوہا ساری دنیا نے مانا، سب کے سب لامذہب علیٰ ہذا القیاس یورپ کے شاید سو میں بمشکل پانچ ایسے نکلیں گے جو سچے دل سے مذہب کے معتقد ہوں۔

حجتہ الاسلام : مجھ کو تو تمہاری یہ بات تسلیم نہیں۔ میرے نزدیک ہر زمانے اور ہر ملک میں مذہب کے ماننے والے زیادہ رہے ہیں، بہ نسبت نہ ماننے والوں کے۔ اور جہاں تک میں خیال کرتا ہوں، دنیا کا اب بھی یہی رنگ ہے۔ تم کو لامذہبوں کی شہرت سے دھوکا ہوا ہو گا۔ سو ایسے لوگوں کی شہرت نہ کثرت کی وجہ سے بلکہ صرف اس سبب سے کہ انہوں نے دنیا سے نرالی انوکھی بات اختیار کی، نکو اور انگشت نما ہو گئے۔ پھر تمہاری ہی نظر میں ان لامذہبوں کی عقل کی کچھ قدر اور وقعت ہو گی۔ میں تو ان کو سیانے کوے سے بڑھ کر نہیں سمجھتا۔ ضروری نہیں کہ جس کی عقل دنیا تیز ہو، دین میں بھی اس کی فہم رسا ہو۔ خاص خاص عقلیں خاص خاص چیزوں سے زیادہ مناسب ہوتی ہیں۔ ایک شخص شطرنج خوب کھیلتا ہے، مگر حساب کا ادنیٰ سوال حل نہیں کر سکتا۔ عقل فی حد ذاتہ ممدوح ہے، لیکن وہیں تک کہ درجہ اعتدال میں ہو۔ خیر الامور اوسطہا

اور فرض کیا کہ مذہب سے انکار کرنے والے بڑے عاقل سہی، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہم اپنی عقل سے جو مدار تکلیف ہے، کام نہ لیں اور خود نہ سوچیں۔ میں نے پچھلی ملاقات میں تم سے مفصلاً" اور مشروحاً" بیان کیا تھا کہ کہاں تک مذہب میں عقل کو دخل دینا چاہیے۔ مگر شاید تمہارے خیال سے اتر گیا یا تم نے میرے ساتھ یہ بھی ایک طرح کی چھیڑ نکالی ہے تو مشغلے کے لیے اور بہت سی باتیں ہیں۔ میں پسند نہیں کرتا کہ مذہب کے ساتھ تمسخر و استہزاء کیا جائے۔

ابن الوقت : کیا آپ برا مان گئے؟

حجتہ الاسلام : اگر تحقیق حق کے طور پر بحث کرو تو میں خوشی سے تمہارے اعتراضات کے سننے، اور جہاں تک مجھ سے ہو سکتا ہے۔ تمہاری تشفی کرنے کو موجود ہوں۔ مگر مخاصمانہ گفتگو کرنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ تم بچے نہیں اور مذہب دوا نہیں کہ پچھاڑ کر تمہارے گلے میں اتار دی جائے۔ طلب صادق پیدا کرو، تب ہی مذہبی مناظرے کا نام لو۔ یاد ہے، میں تم سے کہہ چکا ہوں، فکر اور تدبر انسان کو مذہب کے اختیار کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

ابن الوقت : اس کا تو میں آپ کو ہر طرح سے یقین دلا سکتا ہوں کہ استہزاء کا خیال بھی کبھی میرے دل میں نہیں آیا۔ ہاں، مخاصمانہ کوئی بات میرے منہ سے نکلی ہو گی تو آپ معاف کیجئے۔ غور کرنے کا مجھ کو موقع ہی نہیں ملا۔ مگر کروں گا پرسوں یا اترسوں ذرا کی ذرا سوچنا چاہا تو ذہن اس بات کی طرف منتقل ہو گیا کہ اگر مذہب امر ناگزیر ہو، اور فرض کیا جائے کہ اسلام کے سوائے اور سب مذاہب باطل ہیں، تو ساری دنیا میں مسلمان اور پھر ان میں بھی سچے مسلمان کتنے ہیں۔ کسی طرح عقل قبول نہیں کرتی کہ معدودے چند مقبول ہوں اور باقی تمام جم غفیر مردود۔

حجتہ الاسلام : تم تو پرواز کرتے ہی خدا کی سرحد میں جا پہنچے۔ اول، دنیا کی پہیلی کو تو بوجھ چکو۔ تبھی آخرت کی چیستان میں عقل آزمائی کرنا۔ یہ بھی منجملہ انہی اسرار کے ہے جن کے ادراک سے عقل بشر عاجز ہے۔ اگر واقع میں تم کو دین کی طلب گاری ہے تو سیدھا رستہ کیوں نہیں اختیار کرتے؟ دنیا کی ہستی اور اس کا انتظام اس بات کا مقتضی ہے کہ کوئی اس کا خالق اور صانع ضرور ہے۔ موجودات عالم پر نظر کرتے ہیں تو انسان کو اشرف المخلوقات پاتے ہیں کیونکہ وہ صاحب عقل و ادراک ہے کہ اس صفت میں کوئی اس کا مشارک نہیں۔ بایں ہمہ وہ ایک عاجز و ناچیز مخلوق ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ کو نہ ہم دیکھ سکتے ہیں اور نہ عقل کے زور سے اس کی ذات و صفات کو پورے طور پر دریافت کر سکتے ہیں۔ مگر جس طرح مخلوقات سے خالق کو پہچانتے ہیں، اسی طرح انہی مخلوقات سے اتنی باتیں اور سمجھ میں آتی ہیں کہ جس نے ان کو بنایا اور پیدا کیا ہے، تمام صفات کمالیہ سے

متصف ہے۔ بس یہ تو اصل دین ہے۔ باقی اس کے فروع اور متممات ہیں۔ میں تم کو بتاؤں کہ دین کے دو حصے کرو۔ اولاً" نفس اسلام' پھر اسلام کے فرقوں میں کوئی فرقہ خاص جس کے معتقدات تم کو پسند ہوں۔ میں امید کرتا ہوں کہ مذہب کے متعلق جو کچھ میں نے اب تک تم سے کہا' پہلے حصے یعنی نفس اسلام کی نسبت تمہاری تشفی کر سکتا ہے' بشرطیکہ تم کو تشفی درکار ہو۔ اور جب اسلام کی اصلی اور حقیقی عمدگی تمہارے ذہن میں بیٹھ جائے گی تو میری یہ بات لکھ رکھو کہ انگریزی وضع خود تم ہی کو بہ تقاضائے مذہب وبال معلوم ہونے لگے گی۔ رہا دوسرا حصہ' یعنی اسلام کے فرقوں میں کسی فرقہ خاص کی تعیین' اس کو کسی دوسرے وقت پر رکھو۔

تمت بالخیر